دل گداز تحریریں ۔ زندگی کی تصویریں

سال نمبر

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

مسلسل 36 سال

JANUARY

2019

URDU TUBE

A WORK OF ENTERTAINMENT

www.urdutube.com

ونرز

کنول — عمران قریشی

فلمی کیڑا — پیر نوید شاہ

شریکِ حیات — ایم عاصم مجاہد

'عامل کامل' سچی کہانیاں کا نیا ہوشربا سلسلہ جو پڑھنے والوں کو جادو کی کالی دنیا سے آشنا کرائے گا

'مسئلہ یہ ہے' آپ کے مسائل کا روحانی حل' سچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا

URDU TUBE ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

مدیرہ اعلیٰ: منزہ سہام

مدیر: دانیال شمسی

نائب مدیرہ: ماہم اوزلین

MEMBER
APNS
CPNE
ممبر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
ممبر کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

مجلہ کا دفتر اشاعت و کتابت کا پتا
C-II 88 فرسٹ فلور ضیابان جامی کمرشل
(یونائیٹڈ بیکری کے اوپر) ڈیفنس فیز 7 ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی

مینیجر مارکیٹنگ
زین شمسی
0331-8221212

مینیجر سرکولیشن
آفتاب عالم
0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893121
021-35893123

قیمت فی شمارہ: 70 روپے ✵ جلد: 36 ✵ شمارہ: 01 ✵ جنوری 2019ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

Digitized by Google

خوش آمدید 2019 — منزہ سہام — 07

احوال — مدیرہ اعلیٰ — 08

غلام جو بنے سردار — ام ایمان (فرحانہ مزمل) — 24

نیو ایئر نائٹ — حنا بشریٰ — 26

ناقص العقل — حسین خواجہ — 36

بے وقوفی — غلام مرتضیٰ — 40

پکھی واس — مجید احمد جائی — 44

میانہ روی — مومینہ بتول — 52

موت کے سوداگر — ماہ نور شیرازی — 66

جیسی کرنی ویسی بھرنی — فیصل مشتاق — 74

آج کی شاعرہ — کومل جوئیہ — 86

گاہک — میمونہ صدف — 90

عامل کامل — پیر شاہ قادری — 98

تعارف — افتخار چوہدری — 118

انعم یا منعم — سمیرا غزالہ سہیل — 122

برباد — مونا شہزاد — 128

URDU TOBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutobe.com

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر حسام محی الدین عباسی نفیس پریس OB-7 تاپور روڈ کراچی

اصل پتہ — 132 — ارم ناز

صبح کا بھولا — 136 — فرزانہ نگہت

زندگی تو بہت... — 144 — ارشد ابرار ارش

گمشدہ — 152 — مابہم اوزلین

خالی گود — 170 — جیجل میتلو

متاعِ حیات — 186 — فاخرین بینی

ٹھگوں کا شکار — 190 — میر پرویز احمد زئی

حاجی میاں — 194 — عامر شہزاد

مقصدِ حیات — 200 — نازیہ بتول

قرض کی ادائیگی — 214 — رئیسہ خالد

نادیدہ مخلوق — 217 — فرح انیس

ریزآف وال — 220 — افتخار چوہدری

کتاب تبصرہ — 234 — سید احمد جانی

آپ کی ڈائری — 238 — قارئین

مسئلہ یہ ہے — 244 — ادارہ

شعروسخن — 254 — قارئین

شوبز — 256 — ادارہ

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 1000 روپے افریقہ 75 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 75 ڈالرز ایشیا یورپ 65 ڈالرز

خوش آمدید 2019ء.....!

پلک جھپکتے ایک بار پھر ایک سال اور گزر گیا ابھی قلم عادی ہی ہوا تھا 2018ء لکھنے کا اور 2019ء آ گیا۔ ہر جانے والا سال یہ بتاتا ہے کہ اس زندگی میں کچھ بھی ہمیشہ رہنے والا نہیں' جب انسان ہی فانی ہے تو پھر اور کسی چیز کا کیا گلہ.....زندگی تیزی سے گزرتی جا رہی ہے جو کل بچے تھے وہ آج جوانی کی سرحد پر ہیں اور جو جوان تھے وہ ادھیڑ عمر ہو گئے۔ بزرگ ایک ایک کر کے چلتے چلے گئے اور اپنے ساتھ برکتیں اور وہ ٹھنڈک بھی لے گئے جو ان کے دم سے قائم تھی۔ کیسا اطمینان اور سکون تھا بزرگوں کے دم سے ہر مشکل ہر پریشانی اُن کا چہرہ دیکھتے ہی راستہ بدل لیتی تھی مگر اب بقول غالب.....

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

مگر 2019ء کی صبح بھی کس قدر روشن اور تابناک ہے۔ بالکل اطلس اور کمخواب میں لپٹی اس نوعمر دلہن کی مانند جس کی کاجل بھری آنکھوں میں نئی زندگی کے ڈھیروں خواب سجے ہوتے ہیں۔ جس کے چہرے پر سجی شرمیلی سی مسکان تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگر دیکھنے والے کو دنیا و مافیا سے بے خبر کر دیتی ہے۔ ہم پاکستانی بھی بہت جی لیے ایسی ہی بے خبری میں.....بہت جی لیے ایسے ہی خوابوں کی دنیا میں جہاں سب کچھ ہوتا مگر صرف اس وقت تک جب تک آنکھیں بند ہوں اور آنکھ کھلتے ہی کڑوی سچائی ہمارا منہ چڑا رہی ہوتی ہے۔ خالی ہاتھ ہماری خامیوں کی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں.....اب بھی وقت ہے ہمیں ایک سال اور دیکھنے کو نصیب ہوا.....آیئے اس نئے سال عہد کریں کہ ہم بھی ترقی یافتہ قوموں کی طرح ہوش کے ناخن لیں گے' خواب ضرور دیکھیں گے مگر انہیں حقیقت کا روپ دینے کے لیے جدوجہد بھی کریں گے۔ بناوٹ' بے حسی' شخصیت پرستی' جھوٹ' فریب' بے راہ روی اور دینی منافرت سے اپنے حال اور مستقبل کو محفوظ رکھیں گے اچھا اور سچا انسان بننے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ چوکی' وہ پلنگ' گھر کا وہ کونہ جو بزرگوں کے دم سے کبھی آباد تھا ایک بار پھر آباد ہو سکے ہمارے بچے بھی وہ ٹھنڈک اور وہ برکتیں محسوس کر سکیں جو کبھی ہم نے کی تھیں۔ آیئے اس نئے سال اُن کو دل سے یاد کرتے ہیں جو کبھی ہمارے دل میں بستے تھے اُن کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا راستہ سچ کا راستہ تھا' اطمینان اور سکون جن کا خاصہ تھا۔

منزہ سہام مرزا

آپ سب کو آوارہ سچی کہانیاں اور میری جانب سے نیا سال مبارک.....

Digitized by Google

احوال

مدیرہ اعلیٰ

قارئین کے درمیان رابطہ' آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

2019ء کے پہلے شمارے کے ساتھ آپ کی مدیرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ 2018ء ہر گزرے سال کی طرح کچھ تلخ اور کچھ شیریں یادیں دے کر رخصت ہوا اور نیا سال اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے لیے چمکتے دمکتے سورج کی مانند روشن ہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اُس نے ہم سب کو پھر موقعہ دیا کہ اپنی خطاؤں پر شرمندہ ہوں اور انہیں نہ دہرانے کا عہد کریں۔ بہت سارے اپنے گزرے سال بچھڑ بھی گئے۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے نئے سال میں اس پرانی دعا کہ ساتھ کہ رب العزت میرے وطن کو تا قیامت سلامت رکھنا' اے دو جہانوں کے مالک مجھے اپنے سامنے شرمندہ ہونے سے بچانا' میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب میرے اللہ مجھے زیادتی کرنے والوں میں شمار نہ کرنا' بڑھتے ہیں پہلے خط کی جانب.....

◆ ملازم حسین شیرازی بھکر سے لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ سلامت رہیں السلام علیکم! بچی کہانیاں کا اعزازی شمارہ ہر ماہ باقاعدگی سے ادارہ ارسال کر رہا ہے۔ بہت بہت شکریہ میری کہانی تعارف خط تازہ شمارہ میں شائع کرنے کا شکریہ دسمبر 2018ء کے شمارہ کا متاثر کن سرورق سجا کر دل جیت لیا۔ فہمیدہ ریاض کی رحلت پر آپ کے تاثرات یادیں اشک بار کر گئیں۔ دائمی سفر پر جانے والوں کو یاد کرنا عظیم لوگوں کو دہیرہ ہے پچھلے چار سال سے ہر ماہ باقاعدگی سے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنی آپ بیتی سے جڑی اخذ کی گئی کہانیاں ارسال کر رہا ہوں۔ لکھاریوں قارئین کی حوصلہ افزائی کے لیے تحریریں زیر قلم کر رہا ہوں۔ پچھلے کئی دن سے ملکی حالات کی سنگینیوں کو دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ جو ملک کلمہ پاک کی بنیاد پر اور لاکھوں جانوں کے نذرانے دے کر معرض وجود میں لائے اس کا کیا حشر کر دیا۔ اربوں کھربوں سے اپنی تجوریاں بھرنے والے سفید چادریں اوڑھے کتنے بار سانپ' محبِ وطن بنے پھرتے ہیں ہم نے کیا حال کر دیا مادرِ وطن کا صورتِ حال یہ ہے کرپشن میں ہمارا ملک ناجیریا کے بعد دوسرا کرپٹ ترین ملک ہے دنیا کے انتہائی خطرناک مرض ڈیابلیس میں مبتلا ممالک میں ہمارا ملک بھی شامل ہے چار کروڑ اس جان لیوا مرض کا شکار ہے۔ کئی ارب پتی تاجر جن کا پیسہ باہر کے ملکوں میں غیر قانونی جائیدادوں کی خرید و فروخت میں انوسٹ ہے لیکن ورلڈ لیول میں کوئی صحیح تاجر نہیں دنیا کی سینکڑوں یونیورسٹی میں پاکستان کی صرف ایک یونیورسٹی ہے وہ بھی ایک سو پچاس نمبر پر' دنیا کے ایک سو اکتالیس ممالک میں بدترین پاسپورٹ کا حامل ہمارا ملک دوسرے نمبر پر ہے پہلے نمبر پر افغانستان' نیب کے مطابق پاکستان کے 99 فیصد سیاستدان کرپٹ ہیں۔ ہمارا ملک دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت ہے اس کے باوجود انڈیا' افغانستان آئے روز پاکستانی علاقوں میں گھس کر فائرنگ کرتے ہیں۔ انڈیا دریاؤں کے رخ پھیر رہا ہے مظلوم اور بے گناہ معصوم کشمیریوں کی لاشیں گر رہا ہے' ہمیں پروا نہیں' آن سان سوچی سے اقوام متحدہ اور کینیڈا نے دیے گئے اعزازات واپس لیے ہیں کہ اس نے روہنگیا کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر چشم پوشی کر رکھی ہے۔ لیکن دنیا کے پچاس اسلامی ممالک خاموش ہیں قائدِ اعظم کو آخری چار سال میں ٹی بی کا مرض لاحق تھا۔ انہوں نے اپنے معالج ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ میرے عوام کو اس کا پتہ نہ چلے اور آج کا لیڈر معمولی مرض کے علاج کے لیے یورپ امریکہ یاترا کرتا ہے اور قومی خزانے سے لاکھوں روپے کلیم کرتا ہے۔ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمارے حال پر رحم و کرم فرمائے ظلم زیادتی کرپشن ختم ہو اور ملک شاہراہِ ترقی پر کامیابی سے گامزن ہو آمین' سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں چمکتے دمکتے نگینوں کی طرح جڑی ہیں خاص کر مریم شاہ بخاری' انیلا حمید' محسن علی' مور شاہد حسین' مہر پرویز دولو' عبدالغفار عابد' شاہد رفیق کی تحریر کردہ کہانیاں رسالہ کی جان ہیں مبارکباد' احمد سجاد بابر کتاب پر تبصرہ بہت خوبصورت ہوتا ہے پڑھنے والے گروپ نظر آتے ہیں ماشاء اللہ احوال نامے میں ارشد اقبال چوہان مسند صدارت پر فائز ہیں آپ کا خط متاثر کن ہوتا ہے۔ محسن علی طالب آپ کا خط زبردست سادہ اسلوب سے مزین ہے عامر شہزاد قلم سے خوب انصاف کرتے ہیں ماشاء اللہ پرنس افضل شاہین

Digitized by Google

مختلف رسالوں میں ایک ہی تحریر ارسال کرنا ایک قبیح اور ناپسندیدہ حرکت ہے۔ یہ تو بین ادب ہے صحیح کہا' مہر پرویز دولو پرویز بھائی خط خوبصورت تحریر کرتے ہیں تحریر اچھوتی ہوتی ہے سلام قبول فرمائیں۔ فیصل مشتاق خط فکر انگیز ہے خوب لکھتے ہیں ماشاء اللہ مریم شاہ بخاری بی بی سید زادی اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے آپ کی تحریر میں حسن بیاں نہایت اثر کرتا ہے خوش رہیں۔ ڈاکٹر طارق محمود تحریر میں کیا رنگ بھرتے ہیں خوش کن تحریر ہوتی ہے' ایم حسن نظامی بلائے جان پسند کرنے کا شکریہ آپ بھی اعلیٰ تخلیق کے مالک ہیں' خضر حیات بلائے جان پسند آئی' شکر گزار ہوں سلامت رہیں' عروشہ خان خط پسند کرنے کے لیے ممنون ہوں۔

☆ شیزاری بھائی! آپ کا خط تو احوال کی جان ہوتا ہے یقیناً تمام احوالی آپ کے خط اور تحریر کے منتظر ہوتے ہیں آپ آفس تشریف لائے میرے ساتھ چائے پی یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ زین سے تو آپ کی ملاقات ہوگئی مگر دانیال بھی آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں میں منتظر ہوں کہ آپ جلد دوبارہ تشریف لائیں گے۔ میں سچی کہانیاں آپ سب کے تعاون سے ہی دیتی ہوں آپ کی محبت اور میری انتھک محنت ہی سبب ہے جو سچی کہانیاں پوری آب و تاب سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے اور اب 35 سال کا ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے یقین ہے کہ آپ اور آپ جیسے سچے ساتھیوں کا ساتھ ہمیشہ سچی کہانیاں کا اعزاز رہے گا۔

◆ ارشد اقبال چوہان جڑانوالہ سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہنا خلوص سے بھرا سلام اور پیار..... سب سے پہلے تو کپوزر صاحب سے التماس ہے کہ الفاظ صحیح لکھا کریں مثلاً صفحہ 129 پر ماں کو اماں لکھا ہے 155 پر آسائش کی جگہ آزمائش 166 پر مکینک لکھا ہے جبکہ ورکشاپ لکھنا تھا۔ اسی صفحہ پر بہن کی جگہ بہیں لکھ دیا ہے۔ اور لڑکی کو لڑکا بنا دیا ہے۔ 163 پر نا کی جگہ نہ دو تین جگہ لکھا ہے۔ اتنی باریکی کی معذرت مگر یہ ثبوت ہے سچی کہانیاں سے میری محبت کا..... میرے خط کے جواب میں احتیاط کی جگہ اقساط..... اتنا ہی کافی ہے غصہ ہی نہ کر جائیں۔ نعمان احمد آرائیں صاحب مجھے رشک آرہا ہے کہ شیراز احمد شہید آپ کے بھائی ہیں ایسے سپوت ہمارا فخر ہیں اُن کی عظمت کو سلام..... شیرازی صاحب بہت شکریہ میری کوشش ہے کہ میرے فرائض منصبی میں جذبات کا دخل نہ ہو۔ آپ کا تعارف پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اللہ پاک آپ کو صحت والی لمبی زندگی دے آمین۔ یٰسین کے لیے آپ نے جو کیا اللہ اُس کا اجر آپ کو ضرور دے گا انشاء اللہ عمران قریشی صاحب کی کنول ہندوست کے غلط اور جھوٹا ہونے کا مکمل ثبوت ہے۔ اللہ ہمارے اردو ادب میں دردانہ نوشین جیسے موتی بکھیرتا رہے آمین۔ شیخ منظم صاحب آپ نے آغا سکندر صاحب کا تعارف مکمل کروایا ہے وہ عنایت حسین بھٹی جیسے فنکار کے داماد اور وسیم عباس جیسے اداکار کے بہنوئی تھے۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے' مریم شاہ بخاری صاحبہ کی دین محمد دل کو چھلنی کر گئی۔ اللہ ایسے انسانیت دشمنوں کو ہدایت دے۔ عائل کامل دن بدن بلندیوں کی طرف گامزن ہے بہت اچھے' شریک حیات پڑھ کر گھر کو جنت بنایا جاسکتا ہے۔ اللہ کے نام خط اللہ کی کبریائی کا ثبوت ہے جس کا اعلان اذان کی صورت میں 24 گھنٹے جاری ہے پورے کرہ ارض پر۔ مجبور عاشق صاحب کو مشورہ ہے کہ گھر والوں کی مان لیں اچھے رہیں گے خودکشی ہمارے دین میں بھی حرام ہے اور مردانگی کے خلاف ہے۔ سلمیٰ غزل صاحبہ جنوں کے وجود کو تو ہمارا اسلام بھی مانتا ہے لیکن بچے والی بات خلاف عقل ہے ایسے نہیں ہوسکتا بچہ وغیرہ..... مدیرہ صاحبہ آپ کے تحریروں کے انتخاب کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی اللہ آپ کے حسن نظر میں اضافہ فرمائے بہت سی دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

☆ ارشد بھائی! اس نئے سال کے پہلے شمارے میں آپ کے لیے یہ دعا ہے کہ اللہ آپ کا اقبال بلند کرے۔ آپ جیسے اچھے ساتھی سچی کہانیاں کو مزید معتبر کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیائے ادب میں سچی کہانیاں صاف ستھرے ادب کا علمبردار ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ سچی کہانیاں سے جڑے ساتھی اس نئے سال کے پہلے احوال میں موتیوں کی طرح جگمگا رہے ہیں آپ نے تحریروں پر میرے انتخاب کو داد دی میں آپ کی مشکور ہوں۔

◆ ڈاکٹر عبدالوحید آصف خانیوال سے لکھتے ہیں۔ محترمہ پیاری آپی جان آداب و تسلیمات سلام خلوص' مزاج بخیر آپ کی صحت اور سلامتی کے لیے دعا گو ہوں چند روز پہلے ایک کہانی کے ساتھ چند غزلیں ارسال کر چکا ہوں امید ہے مل گئی ہوں گی اصلاح آپ کے ذمہ ہے آپ کی حوصلہ افزائی سے کچھ بہتر لکھ سکوں گا۔ اس بار بھی ڈائری کا ورق اور دو غزلیں لے کر قدم بوسی کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے حسب سابق آپ میری رہنمائی ضرور کریں گی تاکہ میں مزید بہتر لکھ کر آپ کی بزم میں داخل ہونے کی جسارت کر سکوں۔ میرے لیے کوئی خدمت ہو تو بندہ حاضر ہے۔ آپ کی خدمت کر کے مجھے دلی خوشی ہوگی۔ مجھے آپ کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے براہ کرم بچے دل سے میرے لیے دعا کریں مجھے معلوم ہے کہ آپ کی دعا نہ رد ہوگی نہ ہی منظور آپ کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اچھے لوگوں کی دعائیں اللہ ضرور سنتا ہے اور صلہ بھی دیتا ہے تو میرے لیے چند حرف ہی سہی ضرور آپی میری سب تحریروں کو سنبھال کر رکھیں اور باری آنے پر ضرور شائع کریں ردی کی ٹوکری کی خوراک نہ بنا دینا۔ مہربانی ہوگی۔

Digitized by Google

☆بھائی وحید! تصویر کے ساتھ کہانی شائع کروانے کے لیے آپ کو تصویر بھیجنی ہوگی۔ اور کہانی بھی سچی کہانیاں کے مزاج کے مطابق ہو میں کسی کی کہانی رد نہیں کرتی مگر کہانی میں کہانی ہونا ضروری ہے اور دعائیں آپ کے ساتھ ہیں خوش رہیے۔

رانا دلسن ڈسکہ سے لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ سلام عرض ہے خوبصورت فائل کے ساتھ سجا آخری سچی کہانیاں کا شمارہ' اُفوہ میرا مطلب ہے سال 2018ء کا آخری شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں اور خوبصورتی کے ساتھ پانچ دسمبر کو ملا اپنی کہانی کھوڑ سکہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی اور یہ بھی خوشی ہوئی کہ میری غزل بھی اسی شمارے میں شامل تھی مگر اس سے زیادہ خوشی تب ہوگی جب لوگ اسے پڑھ کر اپنی آرا کا اظہار کریں گے۔ امید ہے دوست احباب میری اس پہلی کاوش کو ضرور پسند کریں گے میں بہت زیادہ مشکور عامر شہزاد صاحب کا جنہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنے پیارے فیصل مشتاق کا جنہوں نے سچی کہانیاں میں دیکھ کیا۔ میں امید کرتا ہوں آپ سب دوست میری کہانی اور میری غزل پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار ضرور کریں گے۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش' وردہ' حسن نظامی' پرنس افضل چوہان' ارشد اقبال چوہان کو بہت بہت زیادہ سلام آپ سب کے تبصرے بہت جاندار تھے۔ آپی منزہ سہام کا اداریہ دکھ ہوئے تمام ہمیشہ کی طرح بہت اچھا تھا کہانیوں میں لمحوں کی غلطی' تین سوال' طاغوت اور مور شاہد حسین کی کہانی غیرت کے نام بہت پسند آئیں۔ آپ کی ڈائری اور شعرو سخن کے سلسلے بہت ہی زبردست ہیں۔ عامر شہزاد اور فریدہ فری اور مریم شاہ بخاری کی غزلیں بہت پسند آئیں سارے کا سارا شمارہ لاجواب تھا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ ہمارا ڈائجسٹ اسی شان و شوکت کے ساتھ مزید نکھرتا رہے۔

☆دلسن بھائی! آپ کو بھی کرسمس اور نیا سال بہت مبارک ہو سچی کہانیاں آپ لوگوں کا ہی ڈائجسٹ ہے لہٰذا اپنی چاہتوں کا ثبوت شمارے میں پابندی سے شرکت کر کے دیا کریں۔

فیصلہ فضل کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری سی بیٹی منزہ خوش رہو' میری کہانی اشعار و غزل شائع کرنے کا شکریہ جزاک اللہ' ایک کہانی بھیج رہی ہوں سو فیصد سچ حقیقت پر مبنی ہے۔ بذا فیصلہ امید ہے پرسچ کی زینت بنے گی انشاء اللہ سب سے پہلے تو ان بچے بیٹیوں کا شکریہ جو میرے خطوط پسند کرتے ہیں شیرازی بیٹا آپ کی دلجوئی اور محبت کا شکریہ آپ کی کہانی بلائے جان پڑھ کر آپ کی ہمت کو داد دیتی ہوں کمال کیا آپ نے' اروشہ' محسن علی طالب' مور شاہد حسین خوش رہو بہت شکریہ تمام کھلاریوں اور قارئین کرام کا جو میری تحاریر پسند کرتے ہیں۔ آپ سب کے لیے دعا گو ہوں اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے بس ایک چھانک بالکل درست ہے یہاں ملیر میں بھی ایسے حادثات بہت رونما ہوتے ہیں ابھی کچھ عرصہ پہلے ایک خاتون ٹرین کے نیچے آ گئی تھیں ان کی لاش دیکھ کر برداشت نہ کر سکیں ہارٹ فیل ہو گیا اللہ مغفرت فرمائے آمین۔ حضرت اسلم حبشی غزلہ عزیز معلومات میں بہترین اضافہ' تیسری چابی ثمینہ مشتاق زبردست افسانہ ہے کافی سسپنس تھا نیل گری افتخار چوہدری کیا واقعی یہ کہانی سچ ہے زبردست لاجوتی جاوید راہی ہندوؤں میں ایسی کہانیاں ہوتی ہیں حافظ مون شاہ بخاری آپ کا تعارف اچھا لگا' اسرار شیب' حنا بشریٰ وظائف کرنے کے لیے استاد اور اجازت ضروری ہے۔ وہ سرد رات ڈاکٹر جویریہ نذ اپر اسرار کہانی ہے دردناک ہے۔ بلائے جان طازم حسین شیرازی بہت خوب اتنی سی عمر میں اتنی بہادری واہ..... کالا جادو ارم ناز واقعی انسان اپنے مفاد کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے سگی بیٹی ہی ماں کی دشمن بن گئی مرد تو اکثر شک میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ زینت کی کوئی نیکی اس کے کام آ گئی۔ چڑیلوں کا مسکن محمد حنیف شاکر بہت زبردست دل کرتا ہے اب کے لاہور جاؤں تو اس عمارت کو دیکھوں 40 سال لاہور میں گزارے مگر معلوم ہی نہیں تھا کیریسٹورنٹ کوثر اسلام سوہانی سچ ہے برے کام کا برا انجام ہی ہوتا ہے۔ آسیبی نیم کا درخت عثمان غنی اچھی کہانی ہے کوئی تھا جنگل میں محمد قاسم خان بلوچ کافی دہشت ناک کہانی ہے' سرد رات اور انسانی دھانچے فرح انیس سنا تو یہی ہے کہ اگر ایسی موت مرنے والوں کی تدفین نہ ہو تو روحیں بھٹکتی رہتی ہیں بھیانک روحیں فیصل مشتاق' جنات کی معافی ایم حسن نظامی بہت شاندار تحریر ہے۔ وہاں جان بانسری ڈاکٹر طارق محمود آکاش کہتے ہیں کہ پریاں نہیں ہوتیں مگر ہوتی ہیں نیک جنات فوزیہ فرید انسانوں کی طرح جنات بھی اچھے برے ہوتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کا تو جواب نہیں اللہ پاک بابا جی کو عمر خضر عطا فرمائے آمین۔ شعر و سخن اس مرتبہ سب ہی غزلیں اچھی ہیں غرض پراسرار نمبر لاجواب ہے۔

☆فیصلہ آنٹی کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ سچے واقعات پر مبنی کہانیاں ہی شائع کریں بس نام اور جگہ تبدیل کر دیتے ہیں اگر محسوس کریں تو..... سچی کہانیاں سے آپ کی محبت میرے لیے قیمتی سرمایہ ہے اپنا خیال رکھیں اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھا کریں۔

نجمل میتلو ڈینس سے لکھتی ہیں۔ پیاری بہن منزہ سہام السلام علیکم! اپنے رب سے دعا ہے کہ سچی کہانیاں کے لکھنے والے پڑھنے والے اسٹاف ممبران سب خیریت سے خوش و خرم رہیں آمین انٹرویو' تعارف' شیئر' سب سلسلے اچھے ہیں سلسلے وار ناول بہترین ہیں ویسے عالم کامل مجھے بہت پسند آ رہا ہے۔ کہانیوں میں تیسری چابی' نیل گری' لاجونتی' چڑیلوں کا مسکن' وہ سرد رات' بلائے جان' وہ لوٹ آیا'

Digitized by Google

صدمہ

ہمارے آرٹ ڈیزائنر ممتاز الدین صاحب کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا ہے' اللہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) (ادارہ)

جنات کی معافی' انسانی ڈھانچے اور سردرات پڑھیں اور پسند آئی ہیں۔ شعر وسخن میرا من چاہا صفحہ ہے سب کی شاعری اچھی تھی بہت لطف آیا پڑھ کر نعت شاہ اللہ ظہیر بہت عمدہ نعت لکھی ہے کاوشیں بہت بہترین ہیں اللہ جی کہانیاں کو بہت ترقی دے آمین آپ نے فون نمبر مانگا ہے زہے نصیب بہت خوشی ہوگی آپ سے بات کرکے آخر میں پھر سب کو سلام۔

☆نجمل! آپ کی آمد دل کو بھائی آپ کا رابطہ نمبر میں نے محفوظ کرلیا ہے امید کرتی ہوں کہ ہمارا یہ تعلق پہلے کی طرح مضبوط ہوگا کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔

➧ہاجرہ عمران خان کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ! اللہ سے دعا ہے کہ اللہ آپ کو عمر خضر صحت اور سلامتی کے ساتھ عطا فرمائے۔ زندگی کی تمام خوشیاں آپ کو حاصل ہوں۔ پیارے شمارے' دوشیزہ اور بچی کہانیاں' یونہی ترقی کی شاہراہ پر سدا گامزن رہیں۔ پیاری منزہ! جس جگہ میں رہتی ہوں یہاں شمارہ بہت دیر سے ملتا ہے جس کی وجہ سے ڈائجسٹ پڑھنے اور تبصرہ لکھنے میں بہت تاخیر ہوجاتی ہے۔ اس پر نومبر میں ہونے والی بہت سی گھریلو تقریبات بھی اس تاخیر کی بنیادی وجہ ہیں۔ مگر دل کہہ رہا ہے کہ ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق۔ سو کسی نہ کسی طرح' بچی کہانیاں' پڑھ ڈالا اور اب امید واثق ہے کہ اگر تبصرہ' احوال' میں نہ بھی لگے مگر اے پیاری منزہ سہام تک پہنچ ہی جائے گا۔ اور یہی اصل مطمع نظر ہے کیونکہ میں نے کہا تھا کہ احوال میں شرکت کیا کروں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ ایڈیٹر تک میرا تبصرہ پہنچ جائے۔ آخر میں میری تحریر کے بارے میں شدت سے آپ کے فیڈ بیک کا انتظار ہے امید ہے کہ۔ اپنی ازحد قیمتی رائے سے مستفید کریں گی۔ بہت انتظار ہے۔ اللہ نگہبان۔

☆اچھی حاجرہ! تمہارا تبصرہ کیونکہ پرانا تھا اس لیے حذف کردیا۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ میرے بلانے پر تم احوال میں چلی آئیں۔

➧وقاص حسین رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ قابل احترام منزہ آپی السلام علیکم! امید ہے آپ بالکل خیریت سے ہوں گی بہت لمبی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضر ہوں۔ کیا بتاؤں اتنا عرصہ کہاں تھا۔ بس مختصر یہ کہ لکھنے سے دل بھر گیا تھا اور اس کی کچھ وجہ تھی۔ میں نے آپ کے دور میں لکھنا شروع کیا تھا۔ آپ نے بہت حوصلہ افزائی کی مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا آپ نے' میری بھیجی ٹوٹی پھوٹی کہانیوں کو نیا روپ دیا' آپ نے' میری بھیجی ہوئی کہانیاں تین سے چار ماہ میں لگ جاتی تھی۔ اس کے بعد ناصر انکل کے دور میں کہانی لگنے کا دورانیہ پانچ سے آٹھ ماہ پر پہنچ گیا۔ ناصر انکل گئے اور کاشی صاحب آگئے اب کہانی لگنے کا دورانیہ ایک سال ہوگیا۔ اب اگر آپ کی بھیجی ہوئی کہانی ایک سال بعد لگے تو کہاں دل کرتا ہے لکھنے کو' میں نے آج تک۔ جو کچھ بھی لکھا صرف بچی کہانیاں کے لیے لکھا بھی کسی اور کے لیے نہیں لکھا۔ میں نے تو کبھی اپنی کسی کہانی کی کاپی بھی اپنے پاس نہیں رکھی کہ اگر یہاں نہ لگی کہانی تو کسی اور رسالے میں بھیج دوں گا۔ بس جو کچھ بھی لکھا صرف بچی کہانیاں کے لیے لکھا اور یہ ذہن میں رکھا کہ اگر یہاں کہانی نہیں لگے گی تو وہ کہانی کسی کام کی نہیں ہوگی۔ ہر ایڈیٹر کے اپنے پسند کے رائٹرز رہے ہیں جن کو انہوں نے ہر ماہ جگہ دی اور اگر ہر ماہ نہیں تو ہر دوسرے ماہ میں' میں یہ نہیں کہتا کہ میں بہت اچھا لکھنے والا ہوں اور میری کہانی بھی ہر ماہ یا دوسرے ماہ لگنی چاہیے۔ دل برداشتہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اگر میری کہانی اچھی نہیں ہے تو اسے لگنا ہی نہیں چاہیے تاکہ مجھے علم ہو کہ میں اچھا نہیں لکھتا۔ لیکن جب کہانی بھی لگ جائے اور لگے بھی چھ سے بارہ ماہ بعد تو شکوہ تو پھر دل پر آ ہی جاتا ہے ایک بات جو بہت زیادہ محسوس کی وہ یہ تھی کہ ایڈیٹر کے تبدیل ہوتے ہی بہت سارے رائٹرز غائب ہوگئے اور بہت سارے نئے آگئے۔ اور یہ ناصر انکل کے ٹائم میں بھی ہوا اور کاشی صاحب کے بھی..... ایورارڈ تقریب پر جانے کا یہ فائدہ ہوا کہ کہانی لگنے کا دورانیہ ایک سال سے کم ہو کر دو تین ماہ پر آگیا یہ کیسے ہوا میں آج بھی اس پر حیران ہوتا ہوں۔ کاشی صاحب کے جانے سے پہلے ایک کہانی ان کو بھیجی تھی جس کی کوئی خبر نہیں ملی کہ وہ کہانی کہاں گئی نا ہی پتہ چلا کہ وہ نا قابل اشاعت ہے نہ ہی وہ کہانی لگی۔ اب پتہ نہیں وہ کہانی ایڈیٹر کے تبدیل ہونے کی نظر ہوگئی یا کچھ اور..... خدا جانے ایک لمبے عرصے تک انتظار کرکے خاموش ہوکر بیٹھ گیا بس اس کے بعد کچھ لکھنے کو دل ہی نہیں کیا..... ایک بار پھر حوصلہ کرکے قلم اٹھایا ہے ایک اچھی امید کے سہارے ایک کہانی ارسال کررہا ہوں پُراسرار نمبر کے لیے اگر قابل اشاعت ہو تو شائع کردیجیے گا۔

Digitized by Google

☆وقاص بھائی! آپ نے جو کچھ لکھا درست لکھا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ جو لوگ کہانی خود لکھا کرتے تھے وہ ہی اب رسالے میں نظر آرہے ہیں یہ ہوش ربا انکشاف مجھ پر بھی بہت دیر میں ہوا پیسے دے کر تو لوگ یہاں صاحب کتاب ہوگئے۔ سچے لکھنے والے کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایڈیٹر کون ہے۔ یہ دوستیاں اور تعلقات وہیں بنائے جاتے ہیں جہاں کچھ کمی ہو ورنہ آپ کی تحریر خود جگہ بناتی ہے۔ اب کیونکہ کافی عرصہ غیر حاضر رہے تو آپ کو پھر بتادوں سچی کہانیاں کے دفتر سے مسودے اور ایکسچینج جانے والے اپنی جا گیر سمجھ کر لے گئے ہیں دیکھتے ہیں کہ چوری کی چیزوں پر کتنے دن گزارہ ہوتا ہے۔

☆نشی محمد عزیز مئے لڈن وہاڑی سے لکھتے ہیں۔ اچھی اور پیاری سی آپی منزہ سہام مرزا صاحبہ سلام محبت دو دسمبر بروز اتوار کو جب حاصل پور بک اسٹال والے کو فون کیا تو اس وقت تک سچی کہانیاں نہیں پہنچا تھا۔ تین تاریخ کو بکس اسٹال والے نے فون نہیں سنا اور جب چار تاریخ کو صبح آٹھ بجے میں گھر سے ڈیوٹی پر جانے کے لیے نکلا تو خیال آیا کہ سچی کہانیاں کی بابت پوچھ لیا جائے چنانچہ جب بک اسٹال والے کو فون کر کے سچی کہانیاں کے متعلق پوچھا تو اس کا جواب اثبات میں پا کر فوراً بائیک کی چال بدلی ایک کو ایک کو فون کر کے ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچنے کا بتایا اور بائیک کو اسی اسپیڈ سے دوڑاتے ہوئے چھیالیس کلومیٹر کا دو طرفہ سفر صرف اڑتالیس منٹ میں طے کر کے اور سچی کہانیاں لے کر نو بجے سے بھی پہلے بمشکل اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ یہ سچی کہانیاں کی محبت کی گرمی تھی جس نے مجھے بائیک پر بھی ٹھنڈ سے بچائے رکھا۔ اب جبکہ میں اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو آوازیں دے کر سچی کہانیاں کی سالانہ رپورٹ مرتب کر رہا ہوں تو مجھے رواں صدی کا ابتدائی دور یاد آرہا ہے جب میرے علاوہ مرحومہ نورین خان عرف ہوا خان بھی سالانہ رپورٹ مرتب کر کے بھیجا کرتی تھیں۔ منزہ آپی وہ بھی کیا یادگار دور تھا کتنے دوست ہوتے تھے ماریہ عرفان فرام واہ کینٹ' حمود الدین ناز' محمد شہباز عثمانی' ارشد آف دیرہ' احمد جہانگیر' شازیہ صدیقی' محمد امجد اسلوی' حیدر کاشری مرحوم' کرنل رفیق ایم ایم مرحوم اور دیگر بہت سے دوست رابیل خان عطاری' مخدوم سسٹرز' اُن کی پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل' سرمد عباسی اور بہت سے دوست حوادث زمانہ کی دھول میں کہیں گم ہوگئے۔ باتیں تو بہت سی ہیں مگر اب آپ سچی کہانیاں کی سالانہ رپورٹ برائے سال 2018ء ملاحظہ فرمائیے۔ سال بھر کے بارہ شمارے کل 3234 صفحات پر مشتمل تھے۔ جن میں سے 322 صفحات اشتہارات پر مبنی تھے یعنی اشتہارات کے لیے کم و بیش دس فیصد صفحات مختص رہے۔ احوالے کے لیے 185 صفحات مخصوص رہے جن پر شائع ہونے والے خطوط کی کل تعداد 341 رہی جن میں سے 160 خطوط مذکر تبصرہ نگاروں کے اور 81 خطوط خواتین کے لکھے ہوئے تھے۔ ان خطوط کی تفصیل کچھ اس طرح سے رہی 54 مرد حضرات کے 160 خطوط کی تفصیل یوں رہی سب سے پہلے ان احوالیوں کے نام جنہوں نے پورے سال میں صرف ایک ہی بار احوال کا پیکر لگایا وہ یہ ہیں۔ سید ندیم سرور' ملک عاشق حسین ساجد' مقصود احمد بلوچ' ڈاکٹر فرمان بھٹی' قاضی فیضان عثمانی' ایم عاصم سجاد' محمد دانیال' محمد اسلم آزاد' عبدالمجید' عبدالحمید خان' ایم اے کلیل' پیر نوید شاہ' لالہ جاوید علی' دیپتان شیخ' ڈاکٹر عمران قمر' محمد مسعود' طاہر عباس' عمران قریشی' جاوید راہی' شاہد رفیق سہو' ملتان فنی' ابو ہریرہ بلوچ' ڈاکٹر امین قاضی پوری' شعیب مغل آسی اور چوہدری یاسر دکی' دو خطوط والے صاحبان یہ ہیں بارش علی' عمران منظر' ایم حنیف شاکر' غلام مرتضیٰ علوی' ممتاز احمد' راکی ولسن' ڈاکٹر طارق محمود آکاش اور ایم اے خالق بھٹی' تین خطوط والے صاحبان کے اسمائے گرامی ملاحظہ کیجیے حسین خوجہ' ایم یعقوب احمدانی' حامد شکور' پرنس افضل شاہین اور مہر پرویز احمد دو تو چار خطوط والے صاحبان کے نام یہ ہیں۔ ماسٹر طاہر مقصود ہاشمی' محمد امان اور نظر علی برمانی' پانچ خطوط والے یہ ہیں نعمان احمد آرائیں' محسن علی طالب اور فیصل مشتاق' چھ خطوط والے تبصرہ نگار یہ ہیں راقم المعروف نشی محمد عزیز مئے' خضر حیات' ساحل ابڑو' سرور شاہد حسین' جن صاحبان کے فی کس سات خطوط شائع ہوئے اُن کے نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر عامر شہزاد اور فیصل ندیم بھٹی' اور اب باری ہے پہلی تین پوزیشن حاصل کرنے والے تبصرہ نگاروں کے نام فی کس تو خطوط کے ساتھ تیسری پوزیشن مشترکہ طور پر حاصل کی ہے جناب ایم حسن نظامی اور عبدالغفار عابد نے' دس خطوط کے ساتھ دوسری پوزیشن حاصل کی ہے جناب ملازم حسین شیرازی صاحب نے اور پہلی پوزیشن گیارہ خطوط کے ساتھ حاصل کی ہے جناب ارشد اقبال چوہان صاحب نے اب لگے ہاتھوں خواتین کی کارکردگی بھی ملاحظہ فرمائیے۔ 45 خواتین کے آکیاسی خطوط کی یہ ہے سب سے پہلے حسب معمول ایک ہی خط والی خواتین کے نام ملاحظہ کیجیے مسز نگہت غفار' نسیم سکینہ صدف' حجاب فاطمہ حجاب' عمارہ عبید' اسما غفور' فرح انیس' ارم ایوب' صائمہ صدیقی' شازلی سعید مغل' موسیٰ اقبال' رباب شیر' طل ہما' ارم ناز' رفعت رفیع' عالیہ نور' الماس فاطمہ ارمان' ثریا کنول' فرزانہ نگہت' نسرین اختر نینا' اُم منال' سعدیہ وحید سعدی' نجل ممتاز' مومنہ بتول' رفعت خان' حاجرہ عمران' ریحانہ اعجاز' دردہ اور اُم ایمان قاضی' دو خطوط والی خواتین یہ ہیں۔ روشانے سبحین مہاردی' فوزیہ فرید' مریم شاہ بخاری' حنا بشریٰ' تحسین جویجو' ثمینہ مشتاق' عظمیٰ صدیقی اور حافظہ مون شاہ' تین خطوط والی خواتین یہ ہیں مدیحہ گل' ناز بتول رضا' فوزیہ اختر' عابدہ مغل' اور سیمیں غزالہ نہاں' محترمہ فریدہ جاوید فری اور اروشہ خان عروش نے فی کس

Digitized by Google

چار خطوط کے ساتھ خواتین تبصرہ نگاروں میں مشترکہ طور پر دوسری پوزیشن حاصل کی اور پہلی پوزیشن بھی دو خواتین نے فی کس سات خطوط کے ساتھ مشترکہ طور پر حاصل کی' اُن کے اسمائے گرامی ہیں محترمہ نفیسہ فضل صاحبہ اور محترمہ حمیرا وحید صاحبہ ٹاپ تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے سب خواتین و حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لیٹ کمرز میں آٹھ حضرات اور چار خواتین شامل ہیں۔ بارہ شماروں میں چھپنے والے اداریے ان عنوانات پر مبنی تھے۔ خبر تو بنتی ہے اے کاش محبت کا ثبوت' جوتے کا سفر' آخری رمضان' نمبر دن دہشت گرد' ٹچنگ پاتنگ' جوتیوں میں دال' شکوہ کیسا گلہ کیوں' سب سے بڑا فتنہ' بس ایک پھانک اور دکھ ہوئے تمام شخصیت نامہ کے تحت خواجہ خورشید انور کے حالات زندگی پر اے آئی رشیدی کا مضمون شائع ہوا' زبیدہ آپا پہ منزہ سہام آپی نے لکھا اور سلطان راہی پر مس رخ کا مضمون شائع ہوا دیس کہانی میں زین شمسی نے برطانیہ کی سیر کروائی اس کے علاوہ ساحل ابڑو نے آل پاکستان ایوارڈ تقریب کا احوال بہت عمدگی سے بیان کیا۔ ترجمہ کہانیوں میں سید ضمیر شاہ اور نجیب عمر نے کہانیاں پیش کیں۔ سفر یزے کے عنوان تلے مس رخ نے تفریحی کہانی خوب سنائی۔ عمران مظہر نے خراج عقیدت خوب پیش کیا اور جناب احمد سجاد بابر نے محترمہ دردانہ نوشین خان کی کتاب ریگ ماہی پر بھرپور تبصرہ کیا۔ شعر کہانی میں شبیر ناقد نے ڈاکٹر منزا صدف پر تعارفی مضمون لکھا' شگفتہ شفیق صاحبہ نے بھارتی لکھنوی اور گنگا آفرین کے علاوہ عمر تجا' تنویر رؤف اور ساحل قادری کی شعری سے متعارف کروایا۔ اس کے علاوہ خود شگفتہ شفیق کی شاعری کی جھلک بھی شائع کی گئی۔ ساحل ابڑو نے اسلم آزاد کا ہلکا تعارف بھی پیش کیا۔ سفر نامہ میں قمر علی عباسی مرحوم کا سفر نامہ ترکی میں عباسی' شائع ہوا اس کے علاوہ اختر حنیفہ کی سفر کہانی بھی شائع ہوئی۔ محترمہ تہمینہ جلیل عظیمی کا مسلم خواتین مضمون الگ شائع ہوا۔ حسین جو نجو کا مضمون قلندری طریقت اور نعت خواں قاری محمد حنان پر مختصر سا مضمون حافظ مون احمد صاحب کا شائع ہوا۔ قارئین و مصنفین کے تعارف کے تحت حسین جو نجو' نظر علی برمانی' ایم حسن ظفای' مور شاہد حسین' فریدہ جاوید فری' عبدالغفار عابد' حافظ مون احمد اور جناب ملازم حسین شیرازی کا تعارف شائع ہوا۔ غلام جو سردار بنے کے عنوان تلے محترمہ ام ایمان کے آٹھ مضامین حضرت سالم مولیٰؓ حضرت بلال حبشیؓ حضرت زید بن حارثہؓ حضرت ثوبانؓ حضرت صہیب رومیؓ حضرت جناب ارتؓ حضرت اسلم حبشیؓ اور حضرت عامر فہیرہؓ پر شائع ہوئے۔ حصے دار قسط دار کہانیوں میں دختر کا بن منور نوری خلیق کے علاوہ حصے دار لال بخی' ثمینہ مشتاق' فرعون صفت قاسم خان بلوچ' کولڈ فیز عمیرہ مظہر راجپوت' عامل کامل شاہ محمد قادری رحیم کے دھاگے روشانے سمین مہاروی' دھند کے اُس پار چلو حنا اصغر اور محترمہ شازلی سعید مغل کا ناول التماس شامل ہیں۔ آپ کی ڈائری اور محفل شعر و سخن کے لیے کل ستاسی صفحات مختص رہے جن پر 145 میل چوائس اور 115 ٹی میل چوائس شامل ہوئے۔ مسئلہ یہ ہے کہ لیے 69 صفحات مخصوص رہے جن کے ذریعے بابا جی نے 49 مرد سائلین اور 144 خواتین کو اُن کے مسائل کا حل بتایا۔ منزہ آپی نے دو ماہ ہمیں دو ٹیزہ کا سفر کے عنوان دلچسپ دیا دگار باتیں سنائیں اس کے علاوہ پاکستانی شوبز نامی سلسلہ تبصرے شروع کر دیا گیا ہے اور اب دیگر مصنفین خواتین و حضرات کی کارکردگی۔ کل ساٹھ مرد لکھاریوں کی 112 کہانیاں شائع ہوئیں سب سے پہلے ان حضرات کے نام جن کی صرف ایک ہی کہانی شائع ہوئی وہ یہ ہیں ایس امتیاز احمد' اعتزاز سلیم وصلی' محمد بلال' ایم اے خالق بھٹی' شعیب اختر آسی' عبدالحمید' شمی محمد عزیز مئے' عمران مظہر' محمد شاہد زین شمسی' دیگر شہزاد' وسیم احمد' حسین خواجہ' رانا محمد شاہد' حامد شکور' طاقب منیر' قاسم جمیل' یاسر دکی' حامد نابانی' ساحل ابڑو' طاہر مقصود ہاشمی' عاکف حنان' قاسم خان بلوچ' محمد حنیف شاکر' امین قاضی پوری' محسن علی طالب' راکی ولسن' ایم عاصم مجاہد' پیر نوید شاہ نازیہ بتول رضا اور مریم شاہ بخاری چار چار کہانیوں کے ساتھ خواتین لکھاریوں میں ٹاپ پر رہیں۔ لیجیے جانب سالانہ رپورٹ اپنے اختتام کو پہنچی انشاء اللہ بشرط زندگی و صحت اگلے سال پھر حاضر ہوں گے سالانہ رپورٹ کے ساتھ اب اللہ حافظ۔

☆ عزیز بھائی! سلامت رہیں آج 11 دسمبر شام 4 بجے آپ کی ارسال کردہ سالانہ رپورٹ پڑھی اور آپ کی محبت کی قائل ہو گئی بھی کہانیاں سے آپ کی محبت تو پہلی سطر سے ہی جھلک رہی تھی جیسے جیسے سالانہ رپورٹ پڑھتی گئی زبان اش اش کرتی رہی خوش رہیں آباد رہیں اور اب اس نئے سال کے ساتھ یہ عہد کر لیں کہ پابندی سے احوال میں بھی شرکت کریں گے اور کہانیاں بمعہ تعارف بھی ارسال کریں گے۔ پرانے ساتھیوں میں سے ارشد علی ارشد بھائی کی کال آئی تھی آنے کا وعدہ بھی کیا ہے مجھے یقین ہے پرانے سب ساتھی لوٹ آئیں گے۔

☆ عظمیٰ صدیقی کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پیاری منزہ سہام امید ہے آپ صحت اور ایمان کے بہتر حالت میں ہوں گی احوالیوں کو سلام اور ادارہ اور رسالے سے وابستہ سب کے لیے نیک تمنائیں بھی کہانیاں ایک نہایت دسیع اور معیاری رسالہ ہے اللہ رسالے اور اس سے وابستہ لوگوں کو ترقی عطا فرمائے ایک چھوٹی سی گزارش ہے کہ رسالہ میں کھانے کی ترکیب اور اپنے حسن سے حفاظت جیسے صفحے بھی شامل کریں اور اب کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے آپ سے اور خصوصی آفتاب صاحب سے معافی کی طلب گار میرے ایڈریس کو

Digitized by Google

لے کر آپ کو بہت دشواری کا سامنا ہوا۔ امید ہے آپ میری اس لغزش کو درگزر کریں گی اور ایک چھوٹا سا سوال کہ میں نے اپنی تحریر آج سے چھ ماہ پہلے ارسال کی تھی وہ اب تک شائع نہیں ہوئی آخر میں آپ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں ارے ارے منزہ مجھے رسالہ کون اور کیوں بھجواتا ہے جس کی بھی کاوش ہے اس کے لیے دعائیں اور میں اُن کی بے حد مشکور ہوں اور اللہ سے دعا گو ہوں اللہ جزے خیر دے رسالہ ملا نہیں اس لیے تبصرے سے قاصر ہوں آخر تو میں نے پہلے کر دیا بس اللہ ہم سب کو اپنے امان میں رکھے آمین۔

☆ ڈیئر عظمیٰ! تمہاری کہانی کے ساتھ مسئلہ یہ ہوا کہ ایک نام کے دو رائٹرز کی کہانیاں میرے سامنے موجود ہیں اب تم اپنی ارسال کردہ کہانی کا نام بتاؤ تاکہ درست نام کے ساتھ کہانی شائع ہو آفس فون کر کے بتا دینا۔

◆ عامر شہزاد نکانہ صاحب سے لکھتے ہیں۔ محترمہ آپی جان اسلام علیکم امید ہے کہ اللہ کے فضل سے سب خیریت سے ہوں گے اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت کاملہ اور لمبی زندگی عطا فرمائے دسمبر کا شمارہ مکمل مطالعہ کے بعد زیر تبصرہ ہے۔ سرورق بہت خوبصورت اور جاندار ہے حسینہ اپنے حسن کے جادو سے متاثر کر رہی ہے میری تحاریر شائع کرنے پر آپی جان کا شکریہ البتہ اپنی کہانیاں شائع ہونے کا شدت سے انتظار ہے نا جانے یہ انتظار کب ختم ہوگا؟ سب سے پہلے حمیرا وحید صاحبہ کی حمد پڑھی اور دل خوش ہو گیا آپی جی کا انشائیہ دکھ ہوئے تمام اچھا لگا واقعی زندگی بڑی ظالم ہے اور کسی بھی ماں کے لیے اپنے جواں سالہ بیٹے کی موت برداشت کرنا آسان نہیں۔ احوال اس بار خوب رہا ڈاکٹر طارق محمود مسند صدارت پر فائز ہیں۔ ارشاد اقبال صاحب نے بالکل سچ کہا کہ اس کائنات میں سب سے مکمل اور پاک ہستی صرف نبی کریم ﷺ ہیں۔ عابدہ مغل صاحبہ آپ اچھا لکھتی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے بیٹے کو صحت و تندرستی عطا فرمائے ظاہر مقصود صاحب کا انداز بیاں اچھا لگا۔ محسن علی طالب بھی اچھی باتیں کرتے نظر آئے۔ ایم ایمان صاحبہ جس نیک کام کے لیے اللہ نے آپ کا انتخاب کیا ہے وہ خاص خوش قسمت لوگوں کو ہی نصیب ہوتا ہے اگر میرے بس میں ہوتا تو آپ کا نام ہمیشہ ونرز لسٹ میں ہوتا جزاک اللہ ملازم حسین شیرازی کا خط بھی حمدہ رہا۔ حافظ مسون شاہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے آپ کی دین اسلام سے محبت سراہنے لائق ہے آپ میری پسندیدہ رائٹرز میں شامل ہیں۔ مریم شاہ بخاری خدا آپ کے شہزادے کو لمبی عمر اور دنیا جہاں کی خوشیاں دے حمیرا وحید بھی بہترین لکھتی ہیں دلسن ساگر درد صاحبہ پرنس افضل شاہین مہر پرویز احمد فیصل مشتاق چوہدری یاسر ایم حسن نظامی مخمر حیات عروشہ خان اور فیصل ندیم نے حمدہ اور بہترین تبصرہ تاری کی۔ ام ایمان کی حضرت عامر لہر نے ایمان تازہ کر دیا۔ ایم عاصم مجاہد آپ کی تحریر اچھی ہے اسلام واقعی شریک حیات کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین کرتا ہے غلام مرتضیٰ صاحب ہم شکل پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے بلاشبہ بیٹیاں باپ کے لیے شہزادیاں ہوتی ہیں رب ان کے نصیب اچھے کرے ملازم حسین صاحب آپ کا تعارف اچھا لگا جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین رائٹر ہیں اللہ آپ کو سلامت رکھے میں برباد ہوئی اور اللہ کے نام خط کہانیاں عمدہ اور منفرد انداز بیاں کی حامل ہیں مائے نی میں کیوں آ کھاں کنول تبصرہ کتاب دوستی کا ناطہ دین محمد کھودا سکہ بات فلمی کیڑا سچی لگن لمحوں کی غلطی تین سوال مقدر کا دوزخ طاقت حامل کامل غیرت کے نام پر بے غیرتی بے وقوف بوڑھا عورت کی کہانی گلان سڑ خواب ادھورے مجبور عاشق اور زلفوں کے اسیر سب عمدہ کہانیاں ہیں۔ انعامی سلسلہ اور مسئلہ یہ ہے بہت عمدہ چل رہے ہیں۔ میری طرف سے اس ماہ کے ونرز ثمینہ مشتاق ڈاکٹر جویریہ کوثر اسلام اور نظر علی برمانی کو مبارکباد آپ کی ڈائری میں دوسرے معبود منہ سے اقوال اچھی باتیں تبدیلی کھٹا میٹھا ہمیشہ ساتھ رکھیں نالائق فضل کی آوازیں سونا لیڈا مٹی کا دریا اور فیصلہ عمدہ تحاریر ثابت ہوئیں۔ شعرا سخن میں حمیرا وحید ڈاکٹر امین مخمر حیات دلسن ساگر فریدہ فری مریم شاہ بخاری حنا بشریٰ اور فرح انجم نے عمدہ شاعری تخلیق کی۔ باسکر عامر خان اور ان کی بیگم کی جوڑی اللہ ہمیشہ سلامت رکھے فدا حسین لغاری کو خدا جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے قاری نعمان احمد صاحب آپ کے اور ہمارے پیارے بھائی جانب شیراز احمد شہید کی شہادت نا صرف ہمارے لیے بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے باعث فخر ہے۔ نورین جبران زریں گل محمد نواز شازیہ اسحاق شازیہ طارق عنایت شاہ آصف خان رفیق ایم ایم اور نازش درآب نے بھی عمدہ اور معلومات افزا تحاریر لکھیں۔ محمد حنیف شاکر خالد عباس اور حسین جونیجو کے خطوط کو مس کیا۔ میری تمام رائٹرز صاحبان سے پیار بھری اور عاجزانہ سی درخواست ہے کہ براہ مہربانی باہمی اتحاد اور پیار و محبت سے رہا کریں ایک دوسرے پر الزامات لگانا غیر مناسب بات ہے یہ سو فیصد ٹھیک ہے کہ غلط ہمیشہ غلط ہی ہوتا ہے مگر سچی کہانیاں سے محبت کی بنا پر چھوٹے چھوٹے اختلافات نظر انداز کر دیا کریں۔ نوازش ہوگی۔ میرے لیے تمام رائٹرز قابل احترام اور معزز ہیں اگر کسی کو میری بات بری لگے تو بیشگی معذرت محمد حنیف شاکر نہایت معزز ایماندار اور سلجھے ہوئے انسان ہیں میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں ان کی کہانی چڑیلوں کا مسکن یقیناً کسی غلطی کی وجہ سے دونوں رسالوں میں شائع ہو گئی ہوگی وہ تو خود سب کو ایسی باتوں سے منع کرتے ہیں وہ جان بوجھ کر ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔

Digitized by Google

☆عامر بھائی! انتظار تو آپ کا ختم ہوا 'حامی میاں' شمارے میں موجود ہے بہترین تبصرہ بھیجنے کا شکریہ۔

سیدہ مون شاہ سرگودھا سے لکھتی ہیں۔ پیاری آپی منزہ سہام السلام علیکم! حمد اُس خدا کی جو قطرے کو سمندر کردے کروڑوں درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جو صاحب معراج ہیں۔ سلام اُن کی آل و اصحابؓ پر جو مثل نجوم دناؤ ہیں۔ دسمبر کا شمارہ جلد موصول ہوگیا تاہم تاخیر سے خط لکھنے کی وجہ تعلیمی اور دیگر مصروفیات ہیں۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض کی رحلت پر افسوس ہوا۔ اللہ درجات بلند کرے دسمبر کے شمارے میں موجود کہانیاں بے وقوف بوڑھا' دین محمدؐ عورت کہانی' اللہ کرے نام خط اچھی رہیں۔ لیکن سب سے زیادہ گلان سرپسند آئی۔ مجبور عاشق' متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ تین سوال کافی سبق آموز تھی۔ قلمی کیڑا گفتہ گفتہ سی لگی۔ ملازم حسین شیرازی صاحب کا تعارف حوصلے کی داستان پر مشتمل تھا خوب' محترم ارشد اقبال چوہان آپ نے مجھے بتی کہہ کر بلایا بے حد خوشی ہوئی آپ کی دعاؤں کا بے حد شکریہ' میرے محترم بھائی فیصل ندیم بھٹی صاحب میں نے ادارے پر کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یا پھر میں اپنی بات کو سمجھا نہیں سکی بلکہ ضرور یہی بات ہے کہ میں اپنے انداز بیاں میں وہ لفظ استعمال نہیں کرسکی کہ مطلب واضح ہوجاتا۔ آپ نے بجا فرمایا کہ انسان کو اچھا گمان رکھنا چاہیے مگر محترم بہت مشکل ہے جو تجربہ مجھے ہوا ہے وہ آپ کو نہ ہوا ہو۔ میرا مقصد کسی کی کردار کشی کرنا تو ہرگز نہیں بس ایک سرسری بات تھی۔ جس میں صرف مدیر کی بات تھی۔ پورے ادارے یا متعلقہ لوگوں کی نہیں بچی کہانیاں میں میرے لفظ جگہ پاتے ہیں یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ محترم انگل ناصر رضا اور محترم کاشی چوہان دونوں کے بارے میں ہی خیالات نیک ہیں خدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ کی بدولت مجھے دوبارہ بچی کہانیاں سے اظہار محبت کا موقع ملا۔ آخر میں ان تمام احباب کا شکریہ جنہوں نے میرے تعارف کو پسند کیا۔ جن کی کہانیوں پر تبصرہ نہیں کرسکی اُن سے معذرت کیونکہ بوجہ مصروفیت رسالہ پورا نہیں پڑھ پائی۔ زندگی رہی تو پڑھ لیں گے اللہ پاک میرے وطن عزیز اور اس پر بسنے والے ہر فرد کی خیر فرمائے آمین۔

☆اچھی لڑکی تمہاری تحریر جلد بچی کہانیاں اور دوشیزہ دونوں کا حصہ ہوں گی بے شک پڑھائی بہت ضروری ہے مگر پڑھائی کے بعد کچھ وقت نکال کر احوال میں ضرور شرکت کرو اور اپریل میں آنے والے مشق نمبر کے لیے میں تمہاری تحریر کی منتظر ہوں۔

فوزیہ اختر لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ سہام مرزا السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ بچی کہانیاں کا پراسرار نمبر بہت پسند آیا۔ جاوید راہی کی کہانی لاجونتی بہت پسند آئی۔ عامل کامل میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ کیور ریٹورنٹ کوثر اسلام کی کہانی نے بے حد متاثر کیا۔ برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ تمام کہانیاں اچھی اور سبق آموز تھیں۔ اپنی کہانی مکانات مکمل بھیج رہی ہوں فروری کے شمارے میں ضرور شائع کیجیے گا۔ مجھے یقین ہے آپ کو پسند آئے گی اب اجازت دیجیے دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ڈیئر فوزیہ! انشاء اللہ آپ کی تحریر ضرور شمارے کا حصہ ہوگی اور اپریل میں بھی مشق نمبر میں اپنی شرکت یقینی بنایئے۔

نظر علی برمانی داود سے لکھتے ہیں۔ قابل احترام منزہ باجی السلام علیکم! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور احوالی دوستوں کی دعاؤں کے طفیل اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور ایک بار پھر آپ کے شہر کراچی میں ہوں باجی آپ نے صحیح کہا تھا کہ اگر صحت اور زندگی ہو تو سب مل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے صحت اور زندگی بھی وہ نعمتیں ہیں جن کا ہم جتنا بھی شکر ادا کریں وہ کم ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ دعا ہے کہ رب العزت ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔ دسمبر کا شمارہ دو تاریخ کو ملا سرورق کی ماڈل اتنی خوبصورت اور اس پر اس کی دلفریب مسکراہٹ واہ بہت ہی زبردست سرورق اور عمدہ عکاسی بہت خوب' اداریے میں بے مثال شاعرہ فہمیدہ ریاض کے انتقال کا پڑھ کر دلی دکھ ہوا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے آمین۔ احوال میں سب دوستوں نے شمارے پر شاندار تبصرے کیے پڑھ کر خوب لطف آیا خاص طور پر طاہر مقصود ہاشمی' محسن علی طالب' عامر شہزاد' ملازم حسین شیرازی' ایم حسن نظامی اور فیصل ندیم بھٹی کے تبصرے خوبصورت تھے۔ پیارے بھائی ملازم حسین شیرازی آپ نے دعاؤں میں یاد رکھا آپ کا بہت شکریہ اور ڈھیر ساری نیک تمنائیں خوش رہیں آباد رہیں' غزالہ عزیز کی تحریر حضرت عامر لجھڑ بہت ہی خوبصورت اور ایمان افروز تھی۔ انیلا حمید رانھور کی مائی نی میں کیوں آ کھاں' کہانی تھی یا دکھوں کی گٹھڑی' اس ایک کہانی میں بہت ساری کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ قاسم کی ناز ش سے خاموش اور معصوم محبت کی کہانی جو ناز ش کی الم ناک موت پر ختم ہوئی چوہدری جیسے شیطان اور بالے جیسے بے غیرت لوگ بالآخر اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آجاتے ہیں اور ایک نہ ایک دن ضرور اپنے بھیانک انجام سے دوچار ہوجاتے ہیں۔ پائل کی موت اور صورت کی بربادی پر بہت ملال ہوا اللہ ان کے گھر موں کو کیفر کردار تک پہنچائے آمین۔ جناب ملازم حسین شیرازی کا تعارف پڑھا ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہی حاصل ہوئی اور ان کی شخصیت کے بارے میں بہت اچھی معلومات حاصل ہوئیں۔ ماشاء اللہ بہت جہاندیدہ اور زبردست انسان ہیں اور بہت اچھی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی کہانی انسانیت کا حق بھی خوب رہی یاسمین کے ساتھ نیکی کر کے انہوں نے دل ہی جیت لیا ایک

Digitized by Google

بات ضرور کہوں گا کہ میرا س بخش جیسے خبیث اور موذی لوگوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ عمران قریشی کی کنول ایک طویل اور خوبصورت تحریر تھی سری رام نے کنول سے سچی محبت کی اور چنڈت کے احسانوں کا بدلہ بھی بڑی خوبصورتی سے چکایا۔ دوستی کا ناطہ شیخ معظم الٰہی نے آغا سکندر سے اپنی دوستی کی صورت یادیں شیئر کیں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آغا سکندر واقعی ایک بڑے اداکار تھے۔ مریم شاہ بخاری بتا رہی تھیں کہ دین محمد دہشت گرد نہیں تھا بھلا اتنا چھوٹا سا معصوم بچہ دہشت گرد کیسے ہوسکتا ہے۔ بہت ظلم ہوا اس معصوم کے ساتھ اس معصوم کے جسم کے ساتھ اس کے ننھے خواب بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جو اس نے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ عالم کامل خوبصورتی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ غلام مرتضیٰ علوی کی ہم شکل ایک ایسے مجبور اور بے بس باپ کی کہانی ہے جو اپنی لاڈلی بیٹی کو ہر وقت یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی بیٹی بدشکل نہیں بلکہ خوبصورت ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اولاد جیسی بھی ہو لیکن ماں باپ کے لیے وہ دنیا میں سب سے زیادہ خوب صورت ہوتی ہے۔ رانا کی دلہن کی کھوج میں شہباز کھوتا سکہ نہیں بلکہ ایک ترا شیدہ ہیرا ثابت ہوا جس نے ملائکہ کی صورت میں اپنی منزل اور والدین کی خدمت کر کے اپنی جنت بھی پالی ایم عاصم مجاہد کی شریک حیات ایک نصیحت آموز سچ بیانی تھی جس کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا چلا گیا۔ بہت ہی خوبصورت انداز میں انہوں نے سمجھایا کہ شریک حیات کی عزت اور قدر کرنی چاہیے۔ اس کو پاؤں کی جوتی نہیں بلکہ اپنی زندگی کا ساتھی سمجھنا چاہیے ان کی یہ خوبصورت اور نصیحت آموز تحریر میرے دل میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ مہر پرویز احمد دولو کی مات ایک دھوکے باز اور مکار شخص کی کہانی تھی نادر جیسے لوگوں سے یہ دنیا بھری پڑی ہے اس لیے پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیے۔ عنبرین اختر کی کہانی میں برباد ہوئی میں بلال کو انسان سے بھیڑیا بنتے میں بہت کم وقت لگا۔ آخر ان لوگوں نے اس کے ساتھ ایسا کیا کیا ایک سیدھا سادھا اور بے ضرر شخص اس قدر ظالم اور شیطان صفت ہو گیا کہ اپنی معصوم محبت کو بھی نہیں بخشا۔ لیکن بالآخر اپنے بھیانک انجام کو پہنچ گیا فرح انیس کی اللہ کے نام خط پڑھ کر سوگوار تائیں بلکہ حقیقتاً میں رو دیا ایک معصوم بچی نے ہم سب کو کتنا اچھا سبق دیا کہ اگر اللہ پر یقین پختہ ہو تو وہ ضرور سنتا ہے اور مدد بھی کرتا ہے۔ بس نیت صاف اور ایمان پختہ ہونا چاہیے تو منزل خود بہ خود آسان ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ فواد کے ساتھ ہوا۔ پیر نوید شاہ کی قلمی کیز اپڑھ کر کچھ فریش ہوا۔ اور آگے بڑھا تو محمد ابو ہریرہ بلوچ کی سچی لگن پڑھی جس میں صبا نے اپنی سچی لگن کی وجہ سے اپنی منزل پالی۔ عبدالغفار عابد کی لمحوں کی غلطی بہت عمدہ تحریر تھی اچھی لگی۔ شاہد رفیق سہو کی تین سوال ایک بادشاہ اور وزیر کی دلچسپ اور سبق آموز کہانی تھی سوال اچھے اور جواب سچے تھے۔ ڈاکٹر محمد امین نیاپوری کی کہانی مقدر کا دوزخ میں اعجاز نے جو بویا وہی کاٹا زندگی میں کی ہوئی ایسی غلطیوں کی سزا تو مل کر ہی رہتی ہے۔ محسن علی طالب کی طاغوت کالے علم کے شوقین کی کہانی بہت عجیب تھی ان کے علاوہ باقی سب کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ جگہ کم ہے ورنہ ان پر بھی بھرپور تبصرہ کرتا۔ پاکستانی شوبز اچھا سلسلہ ہے باجی میرے خط کو بہترین خط قرار دینے پر شکر گزار ہوں خط طویل ہو رہا ہے اجازت دیں اب اجازت۔

☆ بھائی نظر! آپ کے خط کا میں بڑی شدت سے انتظار کر رہی تھی آپ کا مکمل پتہ ادارے کے پاس موجود نہیں تھا اب مل گیا ہے تو آپ کو انعامی سچی کہانیاں پابندی سے ملتا رہے گا۔ شمارہ پسند کرنے کا شکریہ اور ٹائٹل آپ سب کو بہت اچھا لگا تو بتا دوں کہ ٹائٹل کی ذمہ داری زین صاحب کی ہے۔

☆ خضر حیات روہ تھل سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! محترمہ پیاری آپی منزہ آپ کیسی ہیں امید کرتا ہوں خیر خیریت سے ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے اسٹاف کو سدا خوش رکھے اور لمبی عمر دے سچی کہانیاں کے سب قارئین رائٹرز سچی کہانیاں کو پڑھنے والوں کو میرا پیار بھرا سلام قبول ہو۔ سال 2018ء کا آخری شمارہ 4 دسمبر کو ایک خوبصورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ مل گیا۔ ٹائٹل پر ایک حسینہ کے خوبصورت چہرے نے پورے شمارے کو آٹھ چاند لگا دیے۔ ٹائٹل ایک طرف اور شمارہ ایک طرف جب شمارے کے اندر گیا تو مزہ ہی دوبالا ہو گیا۔ شمارہ بہت بہت ہی سپرہٹ اور لاجواب تھا شمارے میں شامل سب کہانیاں بہت بہت زبردست اور اچھی تھیں۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اگر میں یہ کہوں کہ فلاں کہانی اچھی تھی فلاں کہانی بری تھی فلاں کہانی ایسی ویسی تھی تو صرف دل آزاری ہو گی دل کو توڑ دینے والی بات ہو گی سب نے بہت ہی خوبصورت انداز میں لکھا اگر میں یہ کہوں کہ سب کہانیاں ہی بے مثال اور لاجواب تھیں تو یہ بے جا نہ ہو گا۔ اس کے بعد جب آپ کی ڈائری میں گیا تو واہ کیا بات ہے مزہ ہی دوبالا ہو گیا۔ سب تحریریں عمدہ اور اچھی تھیں اپنا شعر اور اقوال دیکھ کر بہت بہت خوشی ہوئی شعر و سخن نے تو پورے شمارے کا مزہ ہی دوبالا کر دیا غزلوں کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ شمارے میں اپنا خط' غزل' شعر اور اقوال دیکھ کر بہت بہت خوشی ہوئی۔ اس سے میری ہمت مزید بڑھ گئی ہے۔ اب تک کے لیے اتنا ہی زندگی رہی تو آئندہ پھر ملاقات ہو گی۔

☆ بھائی خضر! اس بار تو 14/12 کو آپ کا خط مل گیا جان کر اچھا لگا کہ سچی کہانیاں آپ کو سپدن آ رہا ہے آپ بھی قابل تعریف ہیں کہ ہر ماہ پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔

Digitized by Google

راحت وقار اجپوت لاہور سے لکھتے ہیں محترمہ ایڈیٹر صاحبہ آداب عرض! خیریت سے بہ عافیت نیک مطلوب' سچی کہانیاں کے لیے ایک سچی کہانی بھیج رہی ہوں الیکشن ڈیوٹی کے دوران کہانی کی مرکزی کردار سے ملاقات ہوئی تھی جب انہیں پتہ چلا کہ میں رائٹر بھی ہوں تو انہوں نے اپنی کہانی سنائی۔ اس امید پر کہ والدین بیٹیوں کے جذبات کو سمجھیں بیٹی کو بوجھ کی طرح نہ اتار پھینکیں۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی اور کسی قریبی اشاعت میں شامل کریں گے۔

☆راحت! آپ کی ارسال کردہ کہانی مل گئی ہے انشاء اللہ جلد شمارے کا حصہ ہوگی۔ آپ کے لیے بھی بے حساب دعائیں۔

امان حیدرآباد سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! امید ہے آپ اور تمام قارئین سچی کہانیاں خیر و عافیت سے ہوں گے اس ماہ دسمبر 2018ء کا شمارہ چھ تاریخ کو ملا دسمبر کے شمارے میں جو کہانی مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ تھی اللہ کے نام خط پھر آپ کا اداریہ بہت اچھا لگا۔ کہانی کنول ایک اچھی تحریر تھی جو مجھے بہت اچھی لگی ہم شکل' کھوٹ مکہ' شریک حیات' ظلم کیئر' اچھی لگن اچھی کہانیاں تھیں۔ کہانی طاغوت پڑھ کر دکھ ہوا کہ کس طرح کبیر نے جادو سیکھنے کے لیے اپنی آخرت خراب کردی۔ لوگوں کی غلطی' غیرت کے نام پر بے غیرتی' بے وقوف بوڑھا' عورت کہانی' خواب ادھورے' مجبور عاشق' زلفوں کے اسیر' تین سوال وغیرہ وغیرہ سب اچھی کہانیاں تھیں۔ ابھی کچھ کہانیاں نہیں پڑھیں۔ اب اجازت۔

☆امان بھائی! اچھی کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ آپ کی ایک تحریر میرے پاس موجود ہے مگر وہ بہت مختصر ہے کوشش کر رہی ہوں کہ جلد شائع کردوں۔

حمیرا انجم وحید واہ کینٹ سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! آپ اور امید کرتی ہوں آپ خیر و عافیت سے ہوں گی۔ اپنی تحریر پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے لیے آپ کا بہت شکریہ آپ جیسے مخلص اساتذہ کا ساتھ یوں ملتا رہا تو انشاء اللہ کامیابیوں کی طرف میرے قدم بڑھتے جائیں گے۔ جن رائٹرز نے میرے لیٹرز کو پسند کیا اور جنہیں میری کہانی پسند آئی ان کی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میری تحریروں کو کامیابی کی سند سے نوازا' ہمیشہ کی طرح اس دفعہ لیٹرز اچھے تھے اس بار اچھے موضوعات پر کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ دوستی کا ناطہ کہانی جو کہ معروف اداکار آغا سکندر اور ان کے دوست کی پڑھنے کو ملی بے شک دوستی ایک انمول رشتہ ہے اور ایک مخلص دوست کا ملنا خوش نصیبی کی علامت ہے۔ شریک حیات پڑھ کر تو چند لمحوں کے لیے میں سوچوں میں گم ہوگئی کہ ایک مرد ہوتے ہوئے آپ نے عورت کی انتھک محنت کو تسلیم کرتے ہوئے آپ نے بہت اچھی اسٹوری تحریر کی۔ جس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ کہانی ہم شکل غلام مرتضیٰ علوی نے اچھی تحریر رقم بند کی۔ دولا دیسی ہی شکل وصورت کی مالک ہوا اپنے والدین کے لیے سب سے خوبصورت اور پیاری ہوتی ہے۔ اس دفعہ آپ کی ڈائری میں پڑھنے کے لیے بہترین انتخاب تھا۔ مسئلہ یہ ہے بہت شوق سے پڑھتی ہوں باباجی کو اللہ پاک صحت دے آمین جو کئی لوگوں کی زندگی میں مشکلات حل کرنے کا اللہ پاک نے ذریعہ بنائے ہیں ہمارے لیے' شعر و سخن میں ابھی شاعری پڑھنے کے لیے موجود تھی۔ پاکستانی شوبز نس کے بارے میں پڑھ کر تفریح ملی۔ ان الفاظ کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں پرانی رنجشیں اور نفرتیں ختم کرکے نئے سال میں نئی سوچ اور محبتیں بانٹنے کی وجہ بنیں نا کہ نفرت کرنے کی' اس نئے سال کا آغاز یہ سوچ کر کریں کہ یہ ساتھ جو ہمیں اس سال ملا ہے شاید اگلے سال نصیب نہ ہو کب یہ زندگی بے وفائی کر جائے میری طرف سے سچی کہانیوں سے جڑے تمام افراد کو دعا و سلام۔

☆سوئٹ حمیرا! سچی کہانیاں ان تمام لوگوں کو پلیٹ فارم دیتا ہے جو لکھنے اور پڑھنے سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ہم یہ کوشش آج یا کل سے نہیں 35 سال سے کر رہے ہیں دعا کرو یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے۔

غلام مرتضیٰ علوی گوجرہ سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! کے بعد عرض ہے دسمبر کا شمارہ اس وقت ملا جب آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے ہیں اور سردی کی شروع ہوتی لہر بہت محو رقص ہے سردی کا یہ اسٹارٹ دیکھ کر لگتا ہے کہ اس بار ہمارے وسطی پنجاب کے میدانی علاقے میں بہت زیادہ سردی ہوگی چاہے وہ سرد ہوا بارش کی صورت میں ہو یا پھر قاتل دھند کی شکل میں کہ ہر سال ٹریفک کے کافی سارے حادثات ہو جاتے ہیں جن سے کتنے ہی گھرانوں کے چراغ بجھ جاتے ہیں یا زخموں کا درد عمر بھر سہتے ہیں۔ شمارہ کھولا (میری ترجمہ' انتخاب شدہ) تحریر شائع کرنے کا بہت شکریہ (فہرست میں بھی میرا پورا نام غلام مرتضیٰ علوی ہی لکھا کریں شکریہ) سب سے پہلے محترمہ منزہ سہام صاحبہ کا شمارے کا ابتدائی کالم پڑھا فہمیدہ ریئس پر انہوں نے ایک بے مثال تحریر لکھی۔ احوال کا ورق کھولا تو شروع میں ہی آپ کی علم دوستی کا ثبوت مل گیا جب آپ نے شمارے کی قیمت میں اضافہ کرنے سے انکار کر دیا اس سے بڑا علم دوستی کا ثبوت اور کیا ہوگا جب مارکیٹ میں موجود شمارے سو یا 130 تک چلے گئے ہیں آپ اس مہنگائی کے دور میں بھی اپنے غریب مگر کتاب دوست قارئین کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ مجھے واقعی اب اپنے سب سے عزیز ڈائجسٹ' سچی کہانیاں پر فخر ہونے لگا ہے کہ جس نے علم دوستی کا پرچم اتنی مہنگائی کے وقت میں بھی تھاما ہوا ہے۔ ورنہ انٹرنیٹ کے اس دور میں یا تو ڈائجسٹ بہت مہنگے ہو چکے ہیں یا بند ہو چکے ہیں۔ ہم سب قارئین آپ کے ساتھ ہیں آپ اگر اس کی قیمت 80 یا 90 بھی کر دیں گے تو ہم

Digitized by Google

لازمی شمارہ لیں گے کیونکہ مہینے میں 80 یا 90 روپے خرچ کر کے علم و ادب کا بہترین پرچہ ہر قاری خرید سکتا ہے پتا نہیں کیا بات ہے آج کل کے دور میں جب زیادہ تر عوام کے موبائل میں انٹرنیٹ کا پیکیج تو چاہے جتنا مرضی مہنگا ہو جائے وہ لگا لیں گے مگر کتاب اگر دس بیس روپے مہنگی ہو جائے تو لوگ شور مچا دیتے ہیں کہ دیکھو جی پہلے ہی اتنی مہنگائی ہے اس پر آپ نے پورے دس یا بیس روپے بڑھا دیے ہیں۔ لیکن یہ میرا آپ سے وعدہ ہے آپ شمارہ جتنا مرضی مہنگا کریں ہم سب قاری یہ لازمی خریدیں گے۔ احوال میں اس بار ارشد اقبال چوہان' طاہر مقصود' محسن بھائی' عامر شہزاد' ملازم حسین شیرازی' پرنس افضل' فیصل مشتاق' حافظ مون شاہ' ڈاکٹر طارق محمود' نظامی صاحب' حمیرا دھیدی' اور فیصل عدیم بھٹی کے خطوط ابھی تک پڑھے ہیں اور بہت عمدہ لگے' کہانیوں میں ابھی تک' ائی ٹی میں کیوں آ کہاں' انسانیت کا حق اور کنول ہی پڑھی ہیں اور عمدہ دے تھیں ملازم حسین کا تعارف بھی عمدہ رہا ملازم صاحب آپ ایران اور 1971ء والے قصے پر تحریر لکھیں مکمل ہم پڑھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ کیا بیتا اس خط میں میں ایک پُر اسرار تحریر ارسال کر رہا ہوں اگر خدا وقت پر مل جائے تو میری تحریر کو فروری کے پُر اسرار نمبر میں شائع کر دیں اگر لیٹ ہو خط تو بعد کے آنے والے کسی پُر اسرار نمبر یا مہینے دار اشاعت میں جگہ دے دیں۔ ایک معاشرتی تحریر ایک ترجمہ آج کل لکھ رہا ہوں وہ فروری تک مکمل کر کے ارسال کر دوں گا میری ایک تحریر ابھی آپ کے پاس موجود ہے۔

☆ مرتضیٰ بھائی! آپ کی تحریر شمارے میں موجود ہے۔ آپ کی بچی کہانیاں سے محبت کی میں دل سے قدر کرتی ہوں تحریر مل گئی ہے انشاء اللہ پُر اسرار نمبر کا حصہ ہوگی۔

☆ عثمان غنی، پشاور سے لکھتے ہیں۔ اسلام علیکم..... ماہنامہ بچی کہانیاں، اس بار سال کا آخری شمارہ ایک تین دسمبر کو ملا۔ ٹائٹل بہت پیارا تھا، اقرا عزیز کی دیدہ زیبی مسکان نے ٹائٹل کا حزہ دوبالا کر دیا۔ سب سے پہلے منزہ سہام صاحبہ کو دل کی گہرائیوں سے نئے سال کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ آپ کو سدا سلامت رکھے۔

آپ کے لیے یہ سال خوشیاں بے شمار لائیں
آپ سدا خوش رہے غم کی نہ کبھی شام آئیں

پورے ادارے کو اور خاص کر میرے بہت پیارے لکھاری بہن، بھائیوں، کو اور قارئین کو بھی نیا سال دل سے مبارک ہو۔ دکھ ہوئے تمام منزہ سہام صاحبہ کا کالم پڑھ کر بے ساختہ منہ سے واہ نکلا۔ آپ کو خدا نے لکھنے کی خوب صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ احوال میں پہنچے، تو کافی سارے دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ میری کہانی آسیبی نیم کا درخت کو پسند کرنے کا بے حد شکر گزار ہوں۔ جن دوستوں کو انعام سے نواز گیا ہے۔ ان کو بھی بہت بہت مبارک ہوں۔ ارشد اقبال آپ نے خط میں بہت اچھی باتیں لکھیں۔ دلسن ساگر آپ بھی ٹھیک لکھتے ہیں۔ منزہ صاحبہ دل سے ہر خط کا جواب دیتی ہے۔ مجھے زیادہ مزہ خطوط کے جوابات میں بھی آتا ہے۔ محسن علی طالب کا لمبا خط پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ ملازم حسین شیرازی، آپ کا خط، آپ کا تعارف آپ کی کہانی تینوں میں سے سب سے زیادہ آپ کے تعارف نے مزہ دوبالا کر دیا۔ آپ بہت مضبوط شخصیت کے مالک انسان ہے۔ مجھے آپ جیسے لوگوں کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوتی ہے۔

نہیں نا امید ہو اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

پرنس افضل شاہین نے خط کے آغاز میں بہت پیارا شعر لکھا تھا۔ افضل شاہین صاحب باتیں تو آپ کی بے حد درست ہے، مگر کچھ ادارے والے کہانی کو لٹکا دیتے ہیں۔ جس باعث کچھ رائٹرز یہ انتہائی قدم اٹھا لیتے ہیں۔ منزہ سہام صاحبہ بھی دل کی بے حد نرم دل خاتون ہے۔ مہر پرویز صاحب آپ معاشرے کے رجحانوں سے پکچر خانی کر رہے ہیں۔ موجودہ حالات کے دھوکے باز سیاست دانوں پر بھی کوئی کہانی تحریر کیجیے گا۔ فیصل مشتاق صاحب آپ نے بھی دل سے احوال میں شرکت کی۔ منزہ سہام صاحبہ اس ماہ املتاس کیوں نہ لگ سکی؟ پچھلے ماہ بھی کہانی کے صفحات کم تھے۔ کیا اس کی رائٹر شازلی سعید مغل صاحبہ کی طبیعت ٹھیک تو ہے ناں؟ آج کل موسم کی وجہ سے بھی کافی لوگ بیمار ہو گئے ہیں، حافظ مون شاہ بخاری صاحبہ آپ کو میری کہانی پسند آئی۔ شکریہ۔ آپ کا تعارف بھی بہت خوبصورت تھا۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش نے بھی احوال میں اچھی باتیں کر کے دل کو خوش کر دیا۔ فیصل عدیم اور حمیرا داہ کینٹ نے بھی دل جیتنے والے بہترین تبصرے لکھ کر گویاں بچی کہانیاں میں زبردست انٹری دی۔ اس ماہ کہانیوں میں بہترین کا انتخاب کرنا بے حد مشکل مرحلہ تھا۔ مگر جو کہانی سب سے اچھی لگی۔ وہ عمران قریشی کی لکھی کنول تھی۔ کنول میں عمدہ منظر نگاری کی وجہ سے ایک لفظ بھی مس نہ کیا۔ گلان سرمونہ صدف کو اس سے پہلے بھی کافی پڑھا ہے۔ ویلڈن میمونہ صدف صاحبہ آپ نے ایک بہترین موضوع پر کہانی لکھ کر گویاں قلم کا حق ادا کر دیا۔ ہم شکل غلام مرتضیٰ کی کہانی اچھی تھی۔ مگر بے حد مختصر تھی۔ مات مہر پرویز صاحب نے بھی ایک چالاک و مکار آدمی کی عیاری سے اس کو جتا دیا۔ اللہ کے نام خط کا موضوع پرانا تھا اس پر آل ریڈی پی ٹی وی پر ایک ڈرامہ بنایا جا چکا ہے۔ تین سوال بھی اس سے پہلے کئی بار نظروں میں سے گزر چکا ہے۔ طاغوت کہانی ٹھیک

Digitized by Google

تھی۔خواب ادھورے نے بے ساختہ آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔مسئلہ یہ ہے بہترین سلسلہ آپ کی ڈائری ایک بہترین انتخاب ہے،شوبز سلسلہ میں پلیز نئی خبریں دیا کریں کہ جیسے آج کل پریانکا کی شادی،ایکن خان اور محبت بٹ کی شادی وغیرہ،شعر وسخن میں سب کے کلام اچھے تھے۔اور سب قارئین سے ایک گزارش ہے کہ پلیز کسی نئے ابھرتے ہوئے شاعر کا شعر نظم وغزل چرانے سے گریز کریں۔اس سے آپ کو کچھ بھی نہیں ملتا۔مگر اس بندے کی دل شکنی ہوتی ہے۔کچھ لوگ تو آج کل کہانیاں بھی چرا رہے ہیں۔یار یہ بالکل غلط کام ہے۔کوئی بھی یہ نہیں چاہے گا کہ وہ نیا ہو یا پرانا لکھاری ہو اس کی کوئی کہانی کو کوئی بندہ چرالے۔اس کام سے کسی کو خوشی تو نہیں مل سکتی۔وسلام۔

☆عثمان! آپ کو بھی نئے سال کی ڈھیروں مبارکباد التماس نامکمل ہی رہ گئی کیونکہ شازلی سعید مغل اپنی مصروفیات کے باعث قسط دینے سے قاصر ہیں یہی وجہ ہے کہ میں مکمل ناول لینے کو ترجیح دیتی ہوں ادارے اور رائٹرز دونوں کی ساکھ اس عمل سے شدید متاثر ہوتی ہے۔بہرحال کیا کر سکتے ہیں۔چوری کرنا تو ویسے بھی گناہ ہے اب اگر جھوٹی شہرت کی چاہ میں کوئی گناہ گار ہونا چاہے تو میرے بھائی ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔یہ تو والدین کی تربیت ہوتی ہے کہ انسان صحیح راستے پر چلتا ہے۔شوبز کے سلسلے میں سب لوگ حصہ لے سکتے ہیں مگر صرف پاکستانی شوبز میں بھارت کی کسی چیز کی پرموشن کی قائل نہیں۔

❤سلمٰی غزل کراچی سے لکھتی ہیں۔پیاری منزہ بہت ساری دعائیں'اللہ آپ کو خوش آباد رکھے نومبر کے شمارے میں اپنا خط پڑھ کر خوشی ہوئی اور پھر خوشی زلفوں کے اسیر پڑھ کر دوبالا ہوگئی دونوں ڈائجسٹ مجھے مل گئے شکریہ۔پُراسرار حویلی 2014ء میں چھپا تھا اور اس پر ایوارڈ بھی ملا تھا اب انشاء اللہ اتنا لمبا وقفہ نہیں آئے گا۔ایک افسانہ بھیج چکی ہوں دوسرا بھیج رہی ہوں کیونکہ کل چھوٹا بیٹا امریکہ سے آرہا ہے بہو اور پوتا پہلے آچکے ہیں 6 جنوری کے بعد فراغت ملے گی مگر یہ مصروفیت خوش کن اور خوشیوں سے بھرپور ہے اسی لیے صبح چار بجے اٹھ کر مضمون مکمل کیا۔14 فروری کو میری باجی رضیہ زمان کی دوسری برسی ہوگی 2018ء میں تو یہ ایک غزل اگر آپ فروری کے دوشیزہ یا سچی کہانیوں میں شائع کر دیں تو ممنون ہوں گی۔خدا خدا کر کے سردی نے جھلک دکھانا شروع کر دی ہے میں تو گرمی کی پوٹ ہوں اس لیے موسم اچھا لگ رہا ہے دسمبر کے دونوں ڈائجسٹ تھوڑے تھوڑے پڑھ لیے ہیں انشاء اللہ بیٹے بہو کے امریکہ جانے کے بعد تبصرہ کروں گی ممکن ہو تو دوسرے افسانے کسی قریبی اشاعت میں لگا دیجیے گا۔

☆سلمٰی جی! مجھے بھی آپ کا خط اور تحریر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔میں آپ کے مفصل تبصرے کی منتظر ہوں۔اللہ رضیہ آنٹی کے درجے بلند فرمائے بہت محبت دی انہوں نے مجھے بہت خیال رکھا بس یہ تو زندگی کا قانون ہے اپنے دور ہو جاتے ہیں۔انشاء اللہ آپ کا افسانہ جلد شائع کروں گی۔

❤نفیسہ فضل محمود کراچی سے لکھتی ہیں۔پیاری بیٹی منزہ سہام ہمیشہ خوش وخرم رہو اپنے شہزادوں کی بہاریں دیکھو آمین سچی کہانیوں کے کیا کہنے ماشاء اللہ روز بروز نکھر رہا ہے ہر چھوٹے بڑے سے تعریفیں ہی سنتی ہوں اللہ پاک تمام ادارے اور قارئین کو صحت و زندگی عطا فرمائے آمین۔ہمارے لکھاریوں کا تو جواب نہیں سب سے پہلے میں ان بیٹے بیٹیوں کا شکریہ ادا کروں گی جو میری تحاریر اور اشعار کو پسند کرتے ہیں۔حمیرا وحید' خضر حیات' ایم حسن نظامی' ڈاکٹر طارق محمود' آکاش' فریدہ فری اور بیٹا شیرازی آپ سب کی محبت و خلوص کا بے حد شکریہ اللہ پاک آپ سب کو خوش رکھے آمین۔میں ان دنوں کافی بیمار ہوں شوگر اور دل کی تکلیف بہت ہے آپ سب کی دعاؤں کی طلب گار ہوں اللہ پاک ہمیں کسی کا محتاج نہ کرے آمین۔غزالہ عزیز' حضرت عامر لیر' الیسی کہانیاں روح میں اتر جاتی ہیں۔مائی نی میں کیوں آ کھاں انیلا حمید راٹھور تعارف' ملازم حسین شیرازی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی زبردست آپ تو ہر فن مولا ہیں۔بیٹا انسانیت کا حق واہ شیرازی بیٹا جی آپ بھی بہت متاثر کرتی ہے۔کنول عمران قریشی ایک دکھی تحریر دوستی کا ناطہ شیخ معظم الہٰی 65ء کا زمانہ یاد آ گیا۔ساتھ ہی آغا سکندر کی اداکاری اللہ غریق رحمت کرے۔دین محمد مریم شاہ بخاری رُلا دیا تم نے' عالم کامل پیر شاہ محمد قادری اچھا ناول ہے۔ہم شکل غلام مرتضیٰ علوی کھوٹا سکہ راکی دلکش اچھی تحریر ہے۔شہباز نے کفارہ ادا کر دیا صبح کا بھولا شام کو گھر آ گیا شریک حیات ایم عاصم نصیحت آموز تحریر میں برباد ہوئی منہریں اختر سبق آموز ہے۔اللہ کے نام خط فرح انیس زبردست' دوسروں کا مان رکھنے والوں کا مان اللہ رکھتا ہے۔فلمی کیڑا پیر نوید شاہ سچی لگن اگر لگن سچی ہو تو انسان کامیاب ہی ہوتا ہے اپنے مقصد میں' محمد ابوہریرہ بلوچ لمحوں کی غلطی عبدالغفار عابد' شاہد رفیق سہو تعین سوال ملا دو پیازہ کے دور کی کہانی لگتی ہے۔زلفوں کے اسیر سلمٰی غزل زبردست مجھے تو پراسرار کہانیاں بے حد پسند ہیں' آج کل کی بچیاں سنتی کب ہیں بڑوں کی نصیحت جس کا خمیازہ تو بھگتنا پڑتا ہے۔آپ کی ڈائری سب بہترین ہاں بابا جی کو عقیدت بھرا سلام اللہ پاک صحت وزندگی عطا فرمائے آمین' دکھ ہوئے تمام منزہ سہام واقعی جن ماؤں کی اولاد چلی جاتی ہے وہ جیتے جی مر جاتی ہیں۔شعر وسخن میں حمیرا وحید ماشاء اللہ باقی غزلیں بھی اچھی ہیں آخر میں تمام اسٹاف لکھاریوں قارئین کے لیے دعا گو.....

URDU TUBE

Digitized by Google

☆ نفیسہ آنٹی! اپنا بہت خیال رکھا کریں' شمارہ پسند کرنے کا شکریہ اور شکریہ نئے سال کے پہلے شمارے کے پہلے احوال میں شرکت کرنے کا آپ سچی کہانیاں کی اولین دور کی ساتھیوں میں سے ہیں اور مجھ سمیت سب کے لیے قابل احترام ہیں۔ ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

محسن علی طالب سا ہیوال سے لکھتے ہیں۔ آپی منزہ سہام السلام علیکم! اللہ پاک آپ کو صحت و ایمان والی لمبی عمر عطا فرمائے آمین۔ سال کے آخری شمارے کا سرورق پسند آیا۔ دکھ ہوئے تمام ہر انسان نے لوٹ کر جانا ہے۔ ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں اچھے انسان جلدی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ خطوط میں جنہوں نے مجھے یاد رکھا ان کا بہت شکریہ مجھے جن کے خط پسند آئے اُن کے نام عامر شہزاد' اور شہ خان' ملازم حسین شیرازی' پرنس افضل شاہین' حافظ مون شاہ' حمیرا وحید اور حسن نظامی پسند آئے۔ بہت سی دعائیں۔ صحافی منیر کے بھائی کے لیے دعا اللہ پاک اُن کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ زاد راہ اچھا سلسلہ ہے۔ فرانس سے ارسال کردہ انیلا کی تحریر عمدہ حقیقت کے قریب تھی سبق آموز تحریر ملازم حسین شیرازی سے ملاقات ابھی رہتی اُن کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ کتاب کا تعارف عمدہ تھا۔ شیخ منعم الٰہی بھی اچھی تحریر لائے۔ مریم شاہ بخاری زبردست تحریر لائیں دین محمد جیسے مخلص لوگ ہوتے ہیں مگر انہیں قربانی دکا بکرا بنا دیا جاتا ہے سب خواب مٹی میں مل جاتے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ عالم کامل سچ جاری ہے۔ غلام مرتضیٰ ویلڈن ہم شمل تحریر نے افسردہ تو کیا مگر سبق آموز تھی اللہ پاک سب کی بیٹیوں کا نصیب اچھا کرے ایسا وقت کسی باپ پر نہ آئے آمین فرح انیس نے عمدہ لکھا۔ سچی لگن محمد ابوہریرہ بلوچ سچ لکھا مگر محبت روح سے کی جاتی ہے جسم سے نہیں یہ ضروری نہیں کہ محبوب کو حاصل کر لیا جائے محبت تو یہ ہے کہ محبوب کی دور سے پوجا کی جائے جسم سے محبت ہوس ہوتی ہے روح سے محبت شفاف پانی کی مانند صاف ہوتی ہے۔ مقدر کا دوزخ ڈاکٹر محمد امین اچھی تحریر لائے برے کام کا برا نتیجہ ہوتا ہے۔ میری تحریر طاغوت اور خط شامل کرنے پر بہت شکریہ آپی دعائیں بے وقوف بوڑھا نے افسردہ کیا خون سفید ہو گیا عمدہ تحریر تھی۔ کلان سرگل سے ہر چیز ممکن ہے خیالی پلاؤ سے کچھ نہیں بنتا۔ خواب ادھورے تسنیم کوثر ویلڈن عمدہ لکھا۔ شبانہ اسلم مجبور عاشق تحریر لائی والدین کا فیصلہ صحیح ہوتا ہے جو اپنے والدین کو خراب کرے عزت نہ کرے وہ آپ کی کیا عزت کرے گی۔ زلفوں کے اسیر سبق آموز تحریر تھی ارے اب خواتین ہوشیار رہیں کہیں یہ تحریر والی بلا آپ کو ہی نہ چمٹ جائے۔ باقی سلسلے اور شمارہ اچھی مثال آپ تھا۔ اللہ پاک سچی کہانیاں کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین۔

☆ محسن بھائی! سچی کہانیاں پر تبصرہ کرنے کا شکریہ میں امید کرتی ہوں کہ آپ ہر ماہ اسی طرح پابندی سے احوال میں شریک ہوا کریں گے۔

شمینہ مشتاق کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم پیاری منزہ سہام آپی اور سچی کہانیاں ٹیلی کو میری جانب سے ڈھیر ساری دعائیں اس بار تو سچی کہانیاں کا ملنا ایک معمہ ہی بن گیا۔ چودہ دن کے طویل انتظار کے بعد موصول ہوا۔ سچی کہانیاں کی جدائی میں ایک ایک دن کس اذیت سے گزارا میں ہی جانتی ہوں آخر یہ ہمارا محبوب ترین رسالہ جو ٹھہرا۔ پھر ہونے پر سہا کہ میرا خط شامل اشاعت نہ تھا۔ ابھی ایک صدمے سے نکلی تھی کہ دوسرے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پر غلطی میری ہی تھی خط بھیجا تھا چین بھیج گیا جاپان' نمبر کا شمارہ پر اسرار نمبر بڑا ہی خطرناک قسم کا پر اسرار نابت ہوا اور کئی لوگوں کی راتوں کی نیندیں اڑا گیا۔ نومبر دسمبر میں لوگ عشق و عاشقی کی باتیں کرتے ہیں جبکہ ہمارے قارئین کا ڈر ڈر کر برا حال ہو گیا۔ اس ہی بات پر تمام لکھاریوں کو بے حد مبارکباد پر اسرار نمبر کے تمام ہی لکھاریوں کی کہانیاں بے حد دلچسپ پُرتجسس اور بلا کی ڈراؤنی تھیں۔ یہاں ناموں کی فہرست تحریر کروں گی تو خط طویل ہو جائے گا۔ تیسری چاپی کو سراہنے کا بہت بہت شکریہ آپ کی چاہت نے اُسے پہلے نمبر کے پائیدان تک پہنچا دیا۔ جس کی میں بہت ممنون ہوں۔ خاص کر محسن علی طالب' عامر شہزاد' ملازم شیرازی' مہر پرویز احمد دلو' فیصل مشتاق' حافظ مون شاہ' مریم شاہ بخاری' ڈاکٹر طارق محمود آکاش' ایم حسن نظامی' خضر حیات اور فیصل ندیم بھٹی نے خصوصی طور پر اپنے خطوط میں تیسری چاپی کا تذکرہ کر کے مجھے چنے کے جھاڑ پر چڑھا دیا۔ دسمبر کے شمارے کا سرورق تو دل موہ لینے والا ہے۔ ایک پیاری من موہنی صورت دعوت نظارہ دے رہی ہے۔ شمارہ ابھی پڑھا نہیں کیونکہ لیٹ ملا ورنہ تبصرہ کرتی' لیکن ایک بات جو صدق دل سے کہنا چاہوں گی کہ منزہ آپی نے اپنے خلوص' محنت و لگن سے سچی کہانیاں کو جو بام عروج عطا کیا ہے۔ وہ قابل تحسین ہے۔ کہانیوں کا معیار اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی سلسلے رسالے کی خوبصورتی میں دن بہ دن اضافہ کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج منزہ آپی کی محبت نے دوشیزہ اور سچی کہانیاں کو کراچی کے نمبر ون جرائد کی فہرست میں لا کھڑا کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ اسی طرح دن دگنی رات چوگنی ترقی کریں۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ اجازت.....

☆ پیاری سی لڑکی! تم جیسے قابل لوگوں کا ساتھ رہا تو سچی کہانیاں اور دوشیزہ کو وہ عروج ملے گا کہ ستارے بھی حیرت سے ان کو تکا کریں گے۔ تمہاری تعریف کے بعد تو میں پھول کر کپا ہو گئی ہوں شمارہ پسند کرنے کا شکریہ کہانی مل گئی ہے اور عشق نمبر کے لیے سنبھال بھی لی ہے۔

فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور آپ کی ٹیم ایمان اور صحت کی بہترین حالت میں ہوں گے پانچ دسمبر کی ٹھٹھرتی شام کو شمارہ ملا۔ ٹائٹل میں حسینہ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے بالوں کو بکھیرے گویا دسمبر کی ٹھٹھرتی رت کو خوش آمدید کہہ رہی ہے ویسے ایک بات ہے سردی کے شروع میں کچھ سردی کو محسوس بھی کرنا چاہیے یعنی بغیر سوئٹر کے بھی لطف لینا چاہیے۔ اگلہ

Digitized by Google

صفحہ پلٹتے ہی قرشی جوہر جوشاندہ کو دیکھ کر فوراً نزلے میں افاقے کے لیے جوشاندہ لے کر آیا اور جوشاندہ پی کر شاہ پڑھنا آگے شروع کیا۔ اشتہارات کو دیکھتے پڑھتے پلٹتے ہوئے منزہ سہام مرزا کے اداریے دیکھ ہوئے تمام پر جا کر نظر ٹھہری۔ یہ اٹل حقیقت ہے کہ ہر ذی روح نے ایک دن ضرور ختم ہونا ہے بس یادیں باتیں اور دکھ انسان کی زندگی کا سرمایہ بن جاتی ہیں۔ زندگی ہی خوشی اور غم ہی زندگی کا نام ہے۔ بلاشبہ نجیبہ ریاض کا دنیا سے چلے جانا ادب کے میدان میں تلافی نقصان ہے ان کی شاعری اور تحریریں ہمارے درمیان زندہ رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ نجیبہ ریاض کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔ اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے بس ایک دن ہم سب نے دنیا سے کوچ کرنا ہے۔ بس آخرت کی فکر کرنے کی ضرورت ہے احوال میں مخلوط کی کل تعداد اکیس ہے۔ ارشاد اقبال چوہان احوال میں کرسی صدارت پر براجمان ہیں۔ دردہ ایم ایمان قاسمی کو احوال میں خوش آمدید طاہر مقصود عامر شہزاد طارم شیرازی فیصل مشتاق طارق محمود آکاش حسن نظامی حمیرا وحید کے مخلوط بہترین تبصرے کے ساتھ موجود ہیں عامر شہزاد طارق محمود آکاش حسن نظامی عروشے خان میرے خط کو پسند کرنے کا شکریہ حسن نظامی صاحب یہ تو آپ کی حسن نظر کا کمال ہے فیصل مشتاق امید ہے کہ آئندہ آپ کے نام کے ساتھ قبولہ شریف ہی لکھا جائے گا کیپٹن صاحب کو سرگودھا سے اتنی محبت ہے شکریہ شاید مجھے لگتا ہے کہ کیپٹن کی سرگودھا سے وابستگی رہی ہے یا کچھ یادیں ضرور ہوں گی۔ کیپٹن صاحب میرے خط میں بھی ایک غلطی آپ نے کی ہے۔ کاشی چوہان کے دور میں جب وہ مدرسے تھے تو ان کا عجیب و غریب رویہ مجھے مطمئن نہ کر سکا پڑھ کر خوشی ہوئی میں نے حیرت لفظ لکھا تھا لیکن کیپٹن نے خوشی لکھا ہے۔ غلام جو بنے سردار حضرت عامر نجیر ہ کی حالات زندگی ان کی ایمانی طاقت نے بہت متاثر کیا اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحابہ کرام جیسی ایمانی قوت نصیب فرمائے مائی نی میں کیوں آکھاں انیلا حمید راضو عورتوں کو ظلم کی بھینٹ چڑھتا دیکھ کر دامن آنسوؤں سے بھر گیا بلے اور اس کی ماں نے دولت کے لالچ میں اپنی ہی کمر کی عزت کو برباد کر دیا جو کہ سراسر معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہے۔ تعارف ملازم حسین شیرازی آپ کی زندگی کے مشکل حالات جن سے آپ گھبرائے نہیں آپ کی ہمت کو سلام پیش کرتا ہوں جو کہ دوسروں کے لیے مشعل راہ بھی ہے۔ انسانیت کا حق ملازم شیرازی بالکل انسانیت کا حق ہے کہ مشکلات میں گھرے ہوئے انسانوں کو مشکلات سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے تو بہ دنیا میں وڈیرے خود کو خدا بنائے بیٹھے ہیں۔ کنول عمران قریشی خوبصورت مگر انوکھی داستان جس میں ہندو مذہب کے بارے میں ستی کا قانون انسانیت کی تذلیل ہے عورت پر ظلم کا رواج ہے ہندو مذہب میں جو کہ لوظریہ ہونا چاہیے ہندو مذہب کے پنڈتوں کے لیے دوستی کا ناطہ شمع معظم الٰہی دوستی کا رشتہ جو کہ بہت پاکیزہ رشتہ ہے مختصر مگر جامع تحریر ہے دین محمد مریم شاہ بخاری ایک دہشت گرد نے دین محمد کے ارمان اور خواب چکنا چور کر دیے بچوں کو ایسے شر پسند عناصر سے بچنے کی ترغیب دینا والدین کی ذمہ داری ہے خدارا اپنے بچوں پر کڑی نگاہ رکھیں۔ عالم کامل پیر شاہ محمد قادری دین اور دنیا کی کشمکش میں لپٹی دلچسپ داستان ہے۔ ہم شکل مرتضیٰ علوی درد سے بھری کہانی پڑھ کر آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ کھوٹ سکہ رائی دلکش شہباز کا ہدایت پا جانا خوش آئند ہے جو کہ سبق آموز نقطہ ہے پوری تحریر میں شریک حیات عاصم مجاہد آج کل کے معاشرے کے مردوں کی بری عادت کی نشاندہی کی ہے۔ بیوی کے معاملات میں اسلام کو نظر انداز کر دیا ہے۔ نبی پاک ﷺ کی ازواج مطہرات کے ساتھ جو رویہ اور شفقت بھرا انداز محبت کا انداز ہمارے لیے مشعل راہ ہے جس پر آج ہم چل کر اپنی دنیاوی زندگی میں بھی نکھار اور سکون پیدا کر سکتے ہیں۔ مات پرویز دولوے وقوف لوگ اپنی شہرت حاصل کرنے کے لیے فراڈیوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اکثر میں برباد ہوئی حمزین اختر سحر کو اپنی زندگی محبت کے نام پر کرنے پر دکھ کہ ہی ملا کم عمری میں والدین کی خاص طور پر بچوں کی تربیت پر توجہ دینی چاہیے۔ اللہ کے نام مخالفرح انیس سبق آموز تحریر ہے غریبوں اور نادار لوگوں کی خدمت کرنے سے ہی سکون مہیا ہوتا ہے اور آپ کے لیے آسانیاں غیب سے پیدا ہوتی ہیں بہترین بات جو کہ بچی کا اللہ پر پختہ یقین تھا کہ اللہ اسے ضرور دے گا جس کی وہ تمنا کر رہی تھی۔ فلمی کیڑا نوید شاہ دلچسپ تحریر نے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ سچی لگن ابو ہریرہ وصبا کو اپنی محبت پر یقین تھا تو آخر کار صبا کو مل گئی۔ خوش قسمتی کی بات ہے جو حرم کو ملتی ہے محسوں کی غلطی عبدالغفار عابد زیبی نے وقار سے نکاح کر کے اچھا کیا۔ لیکن گاؤں کے غلط رسم و رواج نے ان کو گھر بدر کر دیا۔ تین سوال شاہد رفیق سحر زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ انسان غرض کے پیچھے کیوں لگا ہوا ہے زبردست تحریر ہے۔ مقدر کا دوزخ ڈاکٹر امین روح تک زخم کرتی کہانی ہے سچ ہے کہ غلط کام کا انجام بھی غلط ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اکثر پیر بابا جنبلی عورتوں کی عزتیں لوٹ کر اپنا من راضی کر لیتے ہیں۔ طاغوت محسن علی طالب کالا جادو مسلمان کو کافر بنا دیتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ کس طرح وہ طاغوتی طاقتوں سے بچ نکلا اور عام انسان کی طرح ہو گیا۔ غیرت کے نام پر بے غیرتی مور شاہد حسین لڑکی کی محبت کو بے غیرتی سمجھ کر غیرت دکھائی جاتی ہے۔ ظلم اور بربریت کی داستان ہے۔ بے وقوف بوڑھا یعقوب احمانی دل کو ہلا دینے والی تحریر ہے آج تو خون سفید ہو گئے ہیں اپنوں کو کوئی کہیں پر چھتا بوڑھے کا تجربہ سچ ہے عورت کہانی فرحی نعیم کہانی پڑھ کر میری ناقص سوچ نے فیصلہ کیا کہ مرد ظالم تھا۔ کلان سر میمونہ صدف بیا کی شخصیت کو لفل الجلو نے نکھار کر معاشرے میں بیا کا نام روشن کر دیا۔ خواب ادھورے تسنیم کوثر زبردست تحریر

Digitized by Google

ہے بس ادھورے خواب کبھی کبھی تکمیل تک نہیں پہنچتے' مجبور عاشق شبانہ اسلم میں تو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ دونوں کے ساتھ شادی کرلو دونوں کو منا کر' زلفوں کے اسیر سلمٰی غزل روح کو ہلا دینے والی تحریر ہے۔ آپ کی ڈائری بہترین سلسلہ ہے طلبی باتیں جو کہ سبق آموز ہوتی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے میں بابا جی کے فیض سے دکھی لوگوں کو فیض یاب ہوتا دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ بابا جی کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھے آمین۔ شعر و سخن میں حمیرا وحید کی حمد بہت پسند آئی۔ مریم شاہ بخاری کی غزل دل کو چھو گئی ایک کہانی بھیج رہا ہوں امید ہے کہ کسی قسط شمارے میں شامل کریں گی شکریہ۔

☆ بھائی فیصل ندیم! شاندار خط کے ساتھ 2019ء کے شمارے میں آپ نے قدم رکھا ہے بہت مبارک اتنا جامع خط لکھنے پر' آپ کی کہانی اپریل کے مشق نمبر کے لیے محفوظ کرلی ہے۔

❖ فریدہ فخری لاہور سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ سہام السلام علیکم! دسمبر کا شمارہ بھی کہانیاں ملا افسوس اس میں میرا خط نہ شائع ہو سکا بس تاخیر ہو گئی تھی۔ یہ تو بے حد پسندیدہ میگزین ہے اس ماہ کے ورژن کو بے حد مبارکباد پرنس افضل بھائی آپ کیوں نہیں لکھ رہے اس میں ڈاکٹر محمود بھائی آپ کو میرا انٹرویو مختصر لگا بس اتنا ہی لکھ سکتی ہوں حسن نظامی بھائی ڈاکٹر محمود بھائی' اور پرنس بھائی وہ وقت نہیں بھولتا جب ہم اسلام آباد ریشم کی تقریبات سے ایوارڈ لیتے تھے اور شہ خان' عابدہ منظر' حسن نظامی بھائی' فیضہ منظر' جن کو میری غزلیں پسند آتی ہیں ان کا بے حد شکریہ' ارشہ خان جی آپ کا نام ہمیں بہت ہی پسند آیا ہے۔ اپنی غزل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی منزہ جی اس مرتبہ کتابت کی بے حد غلطی تھی اتنی پھیکی تحریریں تھیں کہ پڑھائیں جا رہا تھا خاص کر مسئلہ یہ ہے سب کی کہانیاں پسند آئیں تمام جی کہانیاں کی فیم کو بے حد سلام و دعا منزہ جی جب بھی کہانیاں ایوارڈ کی تقریب ہو خاص کر لاہور میں جیسے پہلے ہوئی تھی میں بھی گئی تھی تو ایوارڈ تقریب میں ہمیں بھی یاد رکھنا اور ایوارڈ بھی دینا کہ ہمیں صرف شاعری اور تبصرے میں تو ایوارڈ مل چکے ہیں شکریہ۔

☆ فریدہ جی! کوشش تو ہوتی ہے کہ غلطیاں نہ ہوں مگر کچھ نہ کچھ خامی رہ ہی جاتی ہے اور بالکل آپ کو بھولیں گے تھوڑی آپ تو خاص مہمان ہوں گی۔

❖ مہر پرویز احمد دولو میاں چنوں سے لکھتے ہیں۔ سلام مسنون! بھولی سی صورت والی حسینہ سرورق پر منتظر نگاہوں سے براجمان تھی۔ آپ نے درست فرمایا ہم خود غرض ہیں لوگوں کو روندتے ہوئے یہ بھی خواہشات ناتمام ہی راتی ہیں۔ احوال کی غفل بہت اپنی اپنی لگی عامر شہزاد کی محبتوں کا ممنون ہوں۔ ایمان افروز تحریر حضرت عامر گورہ کے واقعات مشق نبی ﷺ کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ ہجرت کی عظمت سے مستفید ہونے کے بعد بیماری کی تکلیف ایمان کی خاطر جھیلی۔ کچھ کہانیاں تسلسل سے عاری تھیں یوں آغاز انجام کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ملازم حسین تعارف کے ساتھ ہمدردی کی بہترین تحریر لائے۔ تھوڑی سی خدا ترسی نے یقین کو کلمہ سے کروڑ پتی بنا دیا۔ کاش ہر مسلمان ایسا ہمدرد بن جائے۔ کنول کا آغاز تو مسجد کے چندے سے ہوا۔ لیکن بعد میں بہت سی مصلحتوں میں گھر گئی۔ معظم الٰہی کی دوستی بہت دکھی کر گئی اچھے یار ایک جہان کی مانند ہوتے ہیں کسی مشکل کو نزدیک نہیں آنے دیتے۔ مریم بخاری دین کی بے کناہی ثابت کرتی نظر آئی کہانی کو مزید پالش کیا جاتا تو نکھر آتی۔ عامل کامل تو خوراک کی طرح لازمی جزو بن گئی ہے۔ سلمان شہر والوں کو چمگادڑوں سے کیسے نجات دلاتا ہے صومانہ کی دوستی اور پروفیسر زیدی کی خود غرضی کا انتظار ہے۔ مرتضیٰ طلوعی نے ہم شکل پر ایک بے بسی کو صفحات پر بکھیرا ہے۔ راکی دلکن کا کھوٹا سکہ آخر ماں باپ کا سہارا بنا' کاش ہر ایسا بیٹا تابعدار بن جائے۔ ایم عاصم شریک حیات پر تو حد کتاں تھے۔ لیکن راکی دلکن کی تحریر میں انہیں شریک حیات نے ماں باپ سے سگے بیٹے جیسین لیے اب ان دونوں میں سچا کون؟ فرح انیس کا اللہ کے نام خدا اس ماہ کی خوبصورت ترین تحریر ہے اور آخری جملہ عماد شامی کے روپ میں تم لوگوں کے سامنے ہیں۔ ان کے عظیم ادیب ہونے کی نشانی ہے اس جملے پر ان کی ادبی عظمت کو میری طرف سے خلوص بھرا سلام قبول ہو۔ ابو ہریرہ نے آخر کار صبا کو منزل مقصود پر پہنچا دیا۔ عبدالغفار عابد کی لمحوں کی غلطی نے زینی کی غلطی کا طوق وقار کے گلے میں ڈھول کی طرح ڈال کر بجانا شروع کر دیا۔ تین سوال جیسی تحریریں گرمی کے موسم میں چوپال میں گاؤں کے بزرگ بچوں کو سناتے ہیں۔ ڈاکٹر امین قلیوری دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید' سلمٰی کو مجبوراً اجاز سے دھوکہ کرنا پڑا' محسن علی طالب آخر کار بگڑے نوجوان کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ فرحی نعیم' میمونہ صدف' سلمٰی غزل آپ کی تحریریں بھی لاجواب تھیں۔

☆ بھائی پرویز! میں منتظر تھی کہ آپ کے خط کی کیونکہ میری خواہش تھی کہ 2019ء کے احوال میں سب شریک ہوں۔ کوئی پیچھے نہ رہ جائے کیونکہ آپ سب میرے لیے بہت اہم ہیں۔ اس آخری خط کے ساتھ اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے اور سچی کہانیاں سے متعلق کوئی بھی بات ہو بلا جھجک مجھ سے کہیے۔ میں منتظر رہوں گی۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام مرزا

Digitized by Google

غلام جو بنے سردار

حضرت ابوفکیہہ یسار ازدیؓ

اُمِ ایمان (غزالہ عزیز)

حضرت ابوفکیہہ یسار ازدی ابتدا میں قریش کے خاندان بنی داد کے غلام تھے۔ بعد میں جب رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ قریش کے ساتھ ساتھ عرب کو دینِ حق کی دعوت دی تو اس زمانے میں حضرت ابوفکیہہ بنو جمح کے غلام بن چکے تھے۔ امیہ بن خلف جمحی اپنے غلاموں پر ظلم و ستم کرنے میں بہت بڑھا ہوا تھا۔

حضرت ابوفکیہہ غلام ہونے کے باوجود دل کے فقیہ تھے چنانچہ آپ کے کانوں میں جب دینِ حق کی پکار پہنچی تو آپ فوراً آگے بڑھے اور حق کی مختصر جماعت میں شامل ہو گئے۔

امیہ بن خلف ان کی اس جرأت پر آگ بگولہ ہو گیا اور ان کو اپنے مظالم کا نشانہ بنانے لگا۔ اس نے اپنے خاندان والوں کو بھی کھلی چھوٹ دے دی تھی کہ جس طرح چاہیں حضرت ابوفکیہہ پر مظالم ڈھائیں۔

یہ ظالم ان مظلوم غلاموں پر نت نئی سزاؤں کو آزماتے۔ دوپہر کے وقت سخت دھوپ میں حضرت ابوفکیہہ کو منہ کے بل لٹا کر اوپر بھاری پتھر رکھ دیے۔ یہاں تک کہ سخت گرمی اور اذیت سے وہ بے ہوش ہو جاتے لیکن اس قدر سختی اور مظالم ان کے منہ سے شرک کا کوئی کلمہ نہ نکلوا سکے۔

ایک دن شقی القلب امیہ بن خلف نے حضرت ابوفکیہہ کو دونوں پاؤں سے رسی سے باندھا اور پھر گھسیٹتا ہوا باہر لا کر تپتی ہوئی ریت پر ڈال دیا۔ امیہ کا بیٹا صفوان بھی باپ کے پیچھے پیچھے پہنچا اور حضرت ابوفکیہہ سے پوچھا۔

''کیا میرا باپ تیرا رب نہیں ہے؟''

حق کے شیدائی ابوفکیہہ نے فوراً جواب دیا۔

''ہرگز نہیں.....! میرا رب اللہ تعالیٰ ہے جو سب کا خالق و مالک ہے اور جو سب کو روزی دیتا ہے۔''

صفوان یہ جواب سن کر طیش میں آ گیا اور حضرت ابوفکیہہ کا گلا زور سے دبایا کہ ان کی زبان باہر نکل پڑی اور وہ بے حس و حرکت ہو گئے۔ صفوان اور امیہ دونوں باپ بیٹا سمجھے کہ یہ ختم

Digitized by G

رازق

ایک مسافر تھکا ہارا رات کو کسی گاؤں کی مسجد میں پہنچا۔ امام صاحب موجود تھے۔ مسافر نے ان سے کھانا طلب کیا تو امام صاحب نے پوچھا۔

''کیا تم نے نماز پڑھی؟''

مسافر بولا۔ ''بخدا' میری عمر اسی برس ہے' میرے خدا نے آج تک رزق دینے سے پہلے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے نماز پڑھی یا نہیں؟''

مرسلہ۔ فاطمہ وہاب' کوٹ ادو

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ آپ ﷺ نے فرمایا۔

''جو شخص چاہے کہ اللہ تعالیٰ سختیوں اور بے چینیوں کے وقت اس کی دُعا قبول فرمائے۔ اسے چاہیے کہ خوشحالی کے زمانے میں زیادہ دُعا کیا کرے۔

☆ میں نے سورج سے نور' چاند سے روشنی طلب کی مگر مجھے اپنے دل کے نور سے زیادہ کہیں روشنی نہیں ملی۔

☆ میں نے جنگ کے اوزاروں کو استعمال کیا اور چیزوں کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گیا مگر قرض سے زیادہ بوجھل میں نے کسی چیز کو نہیں پایا۔

☆ میں نے سمندروں میں سفر کیا اور بڑے خطروں سے دوچار ہوا مگر بادشاہ کے دروازے پر کھڑے ہونے سے زیادہ خطرہ کہیں نہیں پایا۔

☆ میں نے غصے سے بڑھ کر جبکہ وہ آدمی پر غالب آجائے اور کوئی آگ نہیں دیکھی۔

مرسلہ۔ تنزیلہ شاہ' اسلام آباد۔

URDU HUB
A HOME OF ENTERTAINMENT

ہو گئے ہیں۔ اسی وقت حضرت ابوبکرؓ وہاں سے گزرے انہوں نے یہ دردناک منظر دیکھا تو دل بھر آیا۔

اسی وقت ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ کو امیہ بن خلف سے خرید کر آزاد کر دیا۔

لیکن آزاد ہونے کے باوجود بے کس و بے بس ابوفکیہہ رضی اللہ عنہ مشرکین عرب کے مظالم سے محفوظ نہ تھے چنانچہ جب ہجرت حبشہ کی اجازت ملی تو 6 ہجری میں حبش چلے گئے۔

حد درجہ مظالم سہنے کے بے باعث قویٰ کمزور اور ضعیف ہو گئے تھے صحت جواب دے گئی تھی' چنانچہ جنگ بدر سے کچھ پہلے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

حضرت ابوفکیہہؓ ان اولوالعزم اور ثابت قدم مسلمانوں میں شامل تھے' جنہوں نے حالات کی سختی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور توحید کے مقابلے میں کفر کا انکار سخت ترین نامساعد حالات میں بھی کرتے رہے اور یوں ان کا شمار سابقون الاولون کی جماعت میں ہوتا ہے۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

لاہور سے ارسال کردہ نئے سال کی خصوصی تحریر

نیو ایئر نائٹ

نئی زندگی کی ابتدا کرنے والے خودسر اور خود پرست لڑکے کی کہانی جو ماں باپ اور بہنوں کی آنکھوں کا تارہ تھا.....

حنا بشریٰ

روشنیوں میں نہایا..... پھولوں اور خوشبوؤں سے مہکا یہ جہاں پیغام دے رہا تھا ایک نئے خوشیوں بھرے سال کا..... جس میں کامیابیاں جشن منائیں گی۔ اور اُداسیاں دم توڑ دیں گی۔ ایسا سال جس میں امیدوں کے روشن دیے اندھیری راہوں میں اُجالا پھیلا دیں گے۔ مرجھائے چہرے پھر سے کھل اٹھیں گے مگر میرے لیے تو یہ سال اب بے معنی ہے۔ نہ اس میں میرے لیے کوئی خوشی ہوگی اور نہ ہی کامرانی..... نہ ہی قہقہے نہ ہی شادمانی' میرے لیے تو تاحیات اب ہر آنے والا سال ایک جیسا رہے گا۔

اُداسیوں اور پچھتاوؤں سے بھرا..... میں ان اندھیروں کا شکوہ کسی انسان سے تو نہیں کرسکتا۔

نہ ہی اپنے والدین سے اور نہ ہی کسی عزیز دوست سے..... کیونکہ اندھیرے تو خود میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر میں لکھ لیے ہیں۔ میں تو کاتبِ تقدیر سے بھی شکوہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی کرنے کا کوئی حق رکھتا ہوں۔ خوشیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرکے ناکامیوں اور مایوسیوں کو خود اپنے گلے لگایا ہے۔

نہ اب میں کسی کا گریبان پکڑنے کا حق رکھتا ہوں اور نہ ہی چیخنے چلانے کا..... میرے کیے کی یہ سزا کافی ہے کہ میں بے بسی سے پچھلے دو سالوں سے کبھی ڈوبتے ہوئے سورج اور ابھرتے ہوئے اُجالے کو دیکھتا ہوں۔ نئے سال کی آمد پر اٹھنے والا شور میں سنتا ہوں مگر کسی پتھر کی طرح..... جس کو کسی نے زمین میں ایک مخصوص جگہ پر گاڑھ دیا ہو اب نہ تو وہ زمین کے اندر اپنی مرضی سے اور دھنس سکتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے باہر نکل سکتا ہے۔

دو سال پہلے میں بھی انسان تھا..... لیکن میں نے خود کو اور اپنے نصیب کو پتھر بنا لیا ہے۔ ایسا پتھر جو زمانے کی ٹھوکروں پر ہے میرا قصہ سنیے' عبرت کا سامان ہے ہر اُس نوجوان کے لیے جو نئے سال کی آمد پر جوش کے مارے پاگل ہوا جا رہا ہے۔

نیو ایئر نائٹ جوں جوں قریب آتی جا رہی ہے ہر نوجوان کے دل و دماغ پر دیوانگی سی سوار ہوتی جا رہی ہے کہ نیا سال یوں منایا جائے کہ سال کی

Digitized by Google

ابتدا یادگار بن جائے' مگر انسان کو تو اندازہ بھی نہیں ہوتا وہ اکثر سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے..... وہ ابتدا و آغاز کی باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ حالات و واقعات اُس کو انتہا و اختتام کی طرف لے جا رہے ہوتے ہیں۔

میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ جہاں ہر ضرورت کے لیے ترسنا پڑتا تھا۔ ایڑیاں رگڑنی پڑتی تھی پھر کہیں جا کر ان تھک مشقت کے بعد وہ ضرورت پوری ہوا کرتی تھی۔ میں پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بڑی منتوں کے بعد میں پیدا ہوا تھا گھر بھر کا لاڈلہ اور آنکھوں کا تارا تھا۔ بہنوں کی تو جان تھا۔ یہاں کوئی فرمائش اپنی تو تلی زبان میں کی وہاں وہ بے چاریاں میری خواہش کی تکمیل میں جُت جاتیں' ان بے چاریوں کو تو اپنا آپ بھول جاتا اور میری فکر پڑ جاتی کہ بس کسی طرح 'چھوٹے' کی ننھی منی خواہشیں پوری کر دیں۔

انسان کی فطرت عجیب ہے جو بھی چیز کثرت سے ملنے لگے اُس کی طرف سے ناقدری اور لاپروائی پیدا ہونے لگتی ہے۔ طبیعت میں بے حسی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور انسان بہتر سے بہترین کی تلاش میں بھٹکنے لگتا ہے دل میں حسرتیں اور تمنائیں کروٹ لینے لگتی ہیں۔ چھوٹی چیز بڑی کے لیے اور بڑی عالیشان کے حصول کے لیے دل کو الجھائے رکھتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ چل پڑا۔ میری بہنیں اپنی تمام خواہشات مار کر ماں باپ سے چھپ چھپا کر میری فرمائشیں پوری کرتیں۔

وہ خود محرومی کا کڑوا گھونٹ امرت سمجھ کر پی جاتیں مگر میری خواہشات کا پیالہ ٹھنڈے شیریں

Digitized by Google

شربت سے بھرنے کی تگ و دو میں لگی رہتیں۔ میرا بستہ ٹوٹ جاتا تو وہ پیسے جوڑ کر مجھے نیا بستہ لے کر دیتیں۔ خود سلائی کر کے چپل پہن کر مجھے نئے جوتے خرید کر دیتیں خود پیوند زدہ کپڑے پہن کر مجھے کڑکتا کلف زدہ لباس تیار کر کے دیتیں۔ مجھے خوش دیکھ کر اُن کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتیں.....

جبکہ میرا دل مزید خودغرض ہوتا جا رہا تھا ہر پل ایک انجانی سی بے چینی رہنے لگی۔ بے کلی کا ایک ننھا سا پودا اُگ آیا تھا۔ جو دن بہ دن تیزی سے تشنہ آرزوؤں کی چھاؤں میں بڑھتے پھولتے تناور درخت بننے لگا۔ جس میں نہ کوئی پھل تھا اور نہ ہی پھول.....بس کانٹے ہی کانٹے تھے۔ جس میں ہر کسی کے لیے تکلیف تھی کسی کے لیے ٹھنڈی چھاؤں نہ تھی۔ جو محرومیوں کے سائے میں پلتا ایک زہریلا سا درخت تھا۔

''نہیں کھانی مجھے روز روز دال.....!'' میں گوشت کے لیے بھوک ہڑتال کر دیتا۔

''مجھے نہیں پینا یہ گندا سا لال شربت.....!'' میں اعلیٰ مشروبات کے اشتہار جگہ جگہ دیکھتا تو خود بھی پیاسا رہتا اور گھر والوں کو بھی تگنی کا ناچ نچا دیتا۔ جیسے جیسے میں بڑا ہو رہا تھا میرے نخرے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک فرمائش پوری ہوتی تو دوسری کے لیے گھر والوں کی دوڑ لگوا دیتا.....اگر میرا مطالبہ پورا ہو جاتا تو ٹھیک ورنہ میں خود اذیتی میں اس حد تک چلا جاتا کہ خود کو کمرے میں بند کر دیتا۔ کئی کئی دن بھوکا رہتا' خود کو زخمی کرتا بلیڈ یا تیز دار چھری سے خود کو اذیت دیتا اور ماں بہنوں کو دکھ پہنچاتا' اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بھی مجھے رحم نہیں آتا تھا۔ اپنی کسی خواہش کو پورا نہ کرنے کی انہیں جی بھر کر سزا دیتا۔

اور سزا بھی ایسی کہ وہ سب تڑپ اٹھتے' پھر الٹے سیدھے ہو کر مجھ دیوتا کے قدموں میں چڑھاوے چڑھاتے تو پھر کہیں جا کر دیوتا کا عتاب تھمتا۔

جب تک چھوٹا تھا ابو نے میرے چونچلے اور ناز نخرے برداشت کیے لیکن جب بڑا ہوا تو میری عادات' طور طریقوں پر اعتراض ہونے لگا۔ وہ ہر بات پر مجھے ٹوکتے میری ہر غلط حرکت اور بری عادت پر میرا سختی سے احتساب لیا جاتا۔ میں کتنا وقت تعلیم میں اور کتنا آوارہ گردیوں میں لگاتا ہوں اس کا محاسبہ کڑے انداز میں کیا جاتا تو میرا دماغ غصے میں کھولنے لگتا۔ ویسے بھی ہم بیٹے بھی بڑی خبیث فطرت کے مالک ہوتے ہیں.....احسان فراموش' خودسر.....خودغرض اور اپنی ہی ذات کے پجاری .....جب تک ہماری مرضی کے مطابق سب کچھ ہوتا رہے اور ہماری خواہشات پوری ہوتی رہیں اس وقت تک ہمارا دماغ ٹھیک رہتا ہے اور جیسے ہی ماں باپ نے حکم عدولی کی ہم وہیں ان کے باپ بن جاتے ہیں۔

انہیں آنکھیں دکھانے لگتے ہیں کہ جیسے ہم اُن سے نہیں بلکہ وہ ہم سے مانگ کر کھاتے ہیں۔ ہم ان کے محتاج نہیں بلکہ وہ ہمارے محتاج ہیں ان کے بڑھاپے کا سہارا ہمارے سامنے دب کر رہیں اور اپنی خیر منائیں..... جبکہ ہم بیٹے تو وہ دیمک زدہ لکڑی ہوتے ہیں جو نہ اپنے کسی کام کی اور نہ ہی دوسروں کے کسی کام آ سکے۔ مگر پھر بھی ہمیں اپنے مرد ہونے پر غرور ہوتا ہے اور پھر اکلوتے ہونے کا احساس اور گھمنڈ تو ہمارا ذہنی توازن ہی الٹا دیتا ہے کہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو اپنی باتوں سے یہ احساس دلاتے ہیں۔

''تمہاری اس مختصر سی سلطنت کے ہونے والے وارث اور ولی عہد ہیں تمہارا مستقبل اور بڑھاپا ہمارا محتاج ہے اس لیے ہماری سیوا دل کھول کر کی جائے۔'' اور اگر کوئی سیوا کرنے سے انکاری ہوتا اور

Digitized by Google

مجھے کھری کھری سناتا تو میرا دماغ پاگل ہوجاتا کہ مقابل کی جان ہی لے لوں اور اپنے راستے کا پتھر ہٹا دوں۔

''کیوں میاں..... کتنا کما کر دیتے ہو جو ماں بہنوں کے سامنے ہر وقت فرمائشوں کا ڈھیر لگائے رکھتے ہو؟'' میں میٹرک میں تھا میری آئے روز فرمائشیں بڑھنے لگیں تو خبر ابو تک پہنچی تو انہوں نے مجھے کٹہرے میں کھڑا کرلیا۔ میری دانست میں انہوں نے میری توہین کی تھی۔ اپنے ولی عہد کی توہین..... ایسے بوڑھے بادشاہ کو تو جبراً معزول کر کے زندان میں ڈال دینے کا حکم ہونا چاہیے تھا مگر میں یہ سب چاہ کر بھی نہ کرسکا۔

''ابو..... اتنے کم جیب خرچ میں گزارا نہیں ہوتا' میرے دوست ہزاروں لے کر آتے ہیں اور میرے پاس یہ سو پچاس.....'' شرمندہ ہونے کی بجائے میں نے اپنی تنگی کا شکوہ ان کے سامنے ڈھٹائی اور دھڑلے کے ساتھ کردیا۔ میرے خیال کے مطابق تو انہیں احساس ہونا چاہیے کہ ایک جوان لڑکے کی سو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اپنی اکلوتی اولاد کو کوئی یوں ترسا کر رکھتا ہے۔

''ہاں تو کیوں آگ نہیں لگا دیتے اپنے اس خواہشات کے ٹوکرے کو جو کبھی خالی ہونے کا نام نہیں لیتا..... تمہارا باپ فیکٹری میں معمولی سا ملازم ہے کوئی فیکٹری کا مالک نہیں ہے اور تمہاری بہنیں سلائی کڑھائی کر کے اگر کچھ جوڑ لیتی ہیں تو تمہاری نظر ہر وقت اسی پر لگی رہتی ہے شرم کرو..... ڈوب مرو..... بے حیا اولاد.....'' ابو کے یہ الفاظ میرے تن بدن میں آگ لگا دیتے۔ دل تو چاہتا کہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ان سب سے دور ہو کر انہیں ایسی سزا دے جاؤں کہ عمر بھر میری یاد میں روتے ہوئے اپنی بینائی یوں کھو بیٹھیں کہ جیسے 'حضرت یعقوبؑ یادِ یوسف میں روتے آنکھوں کی روشنی سے محروم ہوگئے تھے۔ مگر میں ایسا نہ کرسکا مجھ جیسے بیٹوں سے آرام اور مڈحرامی بھلا کہاں چھوڑی جاتی ہے۔ گھر چھوڑنے کی دھمکی تو صرف وقتی بلیک میلنگ ہوتی ہے جبکہ دماغ میں تو کوئی اور ہی کیڑا ناچ رہا ہوتا ہے کہ چلو کم ہی سہی مگر سہولیات اور آرام میسر تو ہیں نا..... طعنے ملتے ہیں' سختی ہوتی ہے مگر پھر بھی رات کو گھر آنے پر تیار بستر اور گرما گرم کھانا تو مل ہی جاتا ہے نا..... اگر گھر چھوڑ دیا تو خواہ مخواہ دربدری کا عذاب اور مشقتیں برداشت کرنا پڑے گی۔ بس یہی خود غرضانہ سوچ مجھے کسی انتہائی قدم سے روک لیتی تھی۔ جبکہ حالت تو دل کی یہ ہونے لگی تھی کہ ابو کو کھانے میں زہر ملا کر کھلا دوں اور اپنے راستے کی رکاوٹ ہٹا دوں۔

اور پھر دل کھول کر من مانی کروں اپنی زندگی انجوائے کروں ..... جوانی بھرپور طریقے سے گزاروں اور ماں بہنوں پر جی بھر کر حکمرانی کروں..... لیکن یہ محض ایک خواب تھا جس کی تعبیر کچھ نہ تھی۔ جوانی کے نشے میں چور مجھ بدبخت کو یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ سایہ پدر کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے باپ وہ سورج ہوتا ہے جس میں تمازت تو ہوتی ہے مگر اس کے ڈوب جانے سے زندگی میں سوائے تاریکی کے کچھ نہیں ہوتا' مگر ایسی باتیں وقت پر سمجھ ہی کس نافرمان بیٹے کو آتی ہیں۔ اس وقت تو دماغ پر اولاد نرینہ ہونے کا تکبر ہی اتنا سوار ہوتا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ہی سلب کردیتا ہے۔ دماغ پر فرعونیت سوار ہوجاتی ہے اور پھر فرعونیت کو قابو کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی' فرعون کو کیفر کردار تک پہنچانے والی ذات صرف اللہ کی ہوتی ہے۔

میں نے تھرڈ ڈویژن میں روڈھو کے کے ایف اے کرلیا۔ ویسے بھی تعلیم میں میری دلچسپی کا جو عالم تھا ایسا ہی رزلٹ آنا تھا بجائے کہ میں نادم ہوتا

Digitized by Google

میری تو اکڑ کا یہ عالم تھا کہ سینہ پھلا کر مچلنے لگا تھا۔ دنیا والوں کان کھول کر سن لو میں ایف اے پاس ہوگیا ہوں۔ کوئی میرے منہ لگنے کی اب جرأت نہ کرے اگر کسی نے بھول کر بھی ایسی جسارت کی تو اپنی ذلت کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔ گو کہ یہ ایک احسان تھا میرا ایف اے پاس کرنا جو میں نے پوری انسانیت پر کر دیا تھا۔ اب سب پر فرض ہوگیا تھا کہ میرے سامنے نظروں کو جھکا کر رکھیں۔

گھر والے چاہتے تھے کہ میں گریجویشن تو کم از کم کرتا تاکہ کسی معقول ملازمت کا حقدار بن سکتا مگر میں تو ایف اے پاس کر کے ہی ایسا نشے میں تھا کہ مجھے گریجویشن کرنے کی کوئی تمنا نہیں تھی اور ویسے بھی میری تمنا کے ہونے یا نہ ہونے سے فرق بھی کیا پڑتا تھا اتنے گھٹیا نمبروں پر مجھے گریجویٹ کالج میں داخلہ ملنا ہی کہاں تھا۔

☆.....☆.....☆

ابو کی کوششوں سے میں ان کے ساتھ فیکٹری میں ملازم ہوگیا۔ کچھ تنخواہ بھی پُرکشش تھی اور ماحول بھی آرام دہ..... اے سی کی ٹھنڈی ہواؤں میں میرا دماغ آسمانوں پر اڑنے لگا تھا۔ میں جو بھی کماتا گھر والوں کو کچھ نہ دیتا بلکہ سب کچھ عیاشیوں میں اڑا دیا' ابو اکثر امی سے جھگڑتے۔

''اب تو تمہارا بیٹا بھی کمانے لگا ہے اس سے خرچے کے پیسے لینا تمہارا اور تمہاری بیٹیوں کا حق ہے۔'' لفظ حق سن کر میرا دماغ کسی بپھرے بھیڑیے جیسا ہونے لگتا مجھ جیسے مطلبی بیٹوں کی بڑی گھٹیا سوچ ہوتی ہے۔ حق کا لفظ صرف اپنے لیے اچھا لگتا ہے۔ اگر ہم سے کوئی اپنے حق کی بات کرے تو مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ خدمت کروانے کا ہمارا حق ہوتا ہے ناز و چونچلے اٹھوانے کا ہمارا حق ہوتا ہے۔ اور ہمارے پیارے مجبور ہوتے ہیں کہ یہ سارے حقوق خلوص دل سے پورے کریں۔

''کیوں جی..... کس چکر میں آپ لوگوں کا خرچہ لگاؤں..... آپ سب ابو کی ذمے داری ہیں میری نہیں..... اگر ابو سے اتنی بیٹیوں کا بوجھ نہیں برداشت ہوتا تو سوچ سمجھ کر پیدا کرنی تھی نا.....!''

بدزبانی اور بدلحاظی کی آخری حدوں کو چھوتا ہوا میں ہر احساس سے عاری ہوجاتا۔ میں یہ بھول جاتا کہ میں اتنی بکواس اپنے باپ کے بارے میں کر رہا ہوں۔ اس باپ کے بارے میں جس نے بیس سال صرف مجھ پر خرچ ہی خرچ کیا بغیر کسی مطالبے کے.....

اور یہ زہر میں اُن بہنوں کے بارے میں نکال رہا ہوں جو مجھ خودغرض کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے لیے رات بھر بیٹھ کر سلائی کرتی اور اور میرے لیے پیسے جوڑتی تھیں اور صلے میں کچھ نہیں مانگتی تھیں۔

''میرے اپنے خرچے پورے نہیں ہوتے انہوں نے اپنا پاکٹ پال لیا ہے۔'' میری کوری کراری باتوں پر ماں بہنیں تو چپ سادھ لیتیں مگر ابو بالکل میرا لحاظ نہ کرتے۔

''کس نے کہا تھا اتنی فوج بڑھانے کو.....!''

ایک روز میں ایسے غلیظ الفاظ استعمال کرتے ہوئے چلا رہا تھا کہ ابو کی برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے ڈنڈا پکڑا اور دھوبی کے کتے کی طرح مجھے پیٹ ڈالا بیچ میں کوئی مجھے بچانے آتا تو ابو اُس کو بھی دھکیل دیتے شاید میری نافرمانیاں بچپن سے سہہ کر اب وہ تھک چکے تھے۔ اُس دن وہ شاید مجھے گھر سے باہر نکال دیتے اگر ماں اپنی ممتا کا واسطہ دے کر اُن کے پیروں میں نہ گر جاتیں یہ مار میں نے اُس وقت تو برداشت کر لی مگر دل میں اس بات کو بھلا نہ سکا میرے دل میں اپنے باپ کے لیے انتقام کا جوالہ مکھی بھڑک اٹھا۔ دل چاہتا تھا کہ اپنے

Digitized by Google

باپ کو بھی ایسی مار ماروں' ہاتھ سے تو میں ایسا نہ کر سکا مگر میری ایک حرکت ان کے لیے دردناک مار ہی ثابت ہوئی۔

اپنے خرچوں کو پورا کرنے اور عیاشیوں میں اڑانے کے لیے میں نے فیکٹری میں ہیر پھیر شروع کر دی۔ میں نے دو تین لڑکوں کے ساتھ مل کر غبن کا پلان بنایا اور اچھی خاصی رقم فیکٹری کے اکاؤنٹ سے ایسے نکلوائی کہ سارا الزام ابو کے سر آ گیا وہ جو ساری زندگی ایمانداری سے کام کرتے رہے تھے اُن پر فراڈ کا کیس بن گیا۔ پوری فیکٹری اُن پر تھوتھو کر رہی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ اس ہوشیاری سے کیا کہ کسی کو بھی مجھ پر شک نہ ہو سکا۔ جہاں ابو کے سائن کی ضرورت پڑی وہاں بھی میں نے کمال مہارت سے یہ فریضہ سرانجام دیا کہ کوئی اصل چور کو نہ پکڑ سکا۔ ہر نظر میں ابو کے لیے نفرت تھی۔

''جناب آپ کا بیٹا یہ حرکت کرتا تو وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ جوانی میں انسان سے ایسی غلطیاں سرزد ہو جایا کرتی ہیں مگر آپ نے اس عمر میں ایسا کیا؟'' میں دل کھول کر قہقہے لگاتا۔ ابو کا جھکا ہوا سر میرے دل کو سکون دے رہا تھا۔ ابو اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکے ہر بات اُن کے خلاف تھی۔ فیکٹری والے تو ابو پر کیس بنوانے والے تھے مگر موت نے یہ نوبت ہی نہ آنے دی۔ ابو کو دل کا دورہ پڑا اور اپنا کیس اللہ کے حوالے کر کے وہ منوں مٹی تلے چلے گئے۔ مجھے اس سارے قصے کا کوئی دکھ نہ تھا ماں اور بہنوں کا رو رو کر برا حال تھا مگر میری آنکھ میں ایک آنسو نہ تھا۔ میں نے ابو سے اُس روز کی مار کا بدلہ لے لیا تھا۔ جو غلطی انہوں نے منتوں مرادوں سے مجھے مانگ کر کی تھی اُس کی یہ سزا تو بنتی تھی کہ اُن کی زندگی چھین لی جاتی۔ میں اپنے باپ کا قاتل تھا مگر مجھے اپنے کسی فعل پر کوئی افسوس نہ تھا میرا دل پتھر کا ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

غبن کی ہوئی رقم کو میں نے دونوں ہاتھوں سے اڑایا۔ شراب نوشی کرنا اور حسن و شباب کے مزے لوٹنا میرے محبوب مشغلے بن گئے تھے۔ اسی دوران امی بہنوں کی شادی کے لیے مجھ سے کچھ رقم مانگتی تو میری حالت خزانے پر کنڈلی مار کر بیٹھے اژدھے جیسی ہو جاتی جو خزانے کو ہاتھ لگانے والے کو ڈس کر کالا پیلا کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ کبھی کوئی بہن میری خود غرضی اور بے حسی پر مجھے آئینہ دکھاتی تو میں بغیر کسی لحاظ کے انہیں بری طرح سے مارتا کہ اگلی بار وہ میرے منہ لگنے سے پناہ مانگتی۔ وہ مار جو میں اپنے باپ کی برداشت نہ کر پایا تھا جس نے مجھے زہریلا ناگ بنا دیا تھا میں پورے استحقاق کے ساتھ اپنی بہنوں کو آرام سے مار لیا کرتا تھا۔ اور کسی میں جرأت نہ تھی کہ میرا ہاتھ روک سکتا..... امی نے قرضے مانگ کر تین بیٹیوں کا فرض ادا کیا مگر مجھے ذرا حیا نہ آئی۔ میں نے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ میرا ضمیر مردہ ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے ابدی نیند سلا دیا تھا۔

''اپنی بیٹیوں کی شادیاں کرنا آپ کا ہی فرض بنتا ہے..... اگر یہ سب میری اولاد ہوتیں تو تب میں ان کی فکر کرتا۔'' ہم مردوں کو اپنی اور دوسرے کی اولاد کا فرق بھی خوب معلوم ہوتا ہے۔ ابھی باپ بنے نہیں ہوتے اور دل میں اپنی اولاد کا درد پہلے سے ہی جاگ جاتا ہے۔ امی میرے جواب پر دکھی ہو کر مجھے کوسنے لگتیں۔

''وسیم تجھے اللہ پوچھے گا۔'' وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے کوستی مگر میں ذرا نہ ڈرتا۔ مجھے ان کی بددعا سے کوئی خوف نہ آتا تھا۔ نہ ہی اپنے رب کے قہر سے..... انسان میں جب فرعونیت بڑھنے لگے تو وہ بے خوف ہو جاتا ہے۔ اُس کی رسی دراز کر دی جاتی ہے۔

Digitized by Google

تا کہ وہ سرکش گھوڑے کی طرح جہاں بھاگنا چاہے بھاگتا رہے۔ جہاں چاہے منہ مارے..... جیسی مرضی تباہی مچائے کیونکہ اُس کا کڑا حساب لینے کا فیصلہ آسمانوں میں ہو چکا ہوتا ہے۔ میں اس بات سے قطعی بے خبر سرپٹ بھاگتا جا رہا تھا۔

حرام میرے منہ کو لگ چکا تھا۔ عورت میری کمزوری بنی تو حرام کاری میری عادت ثانیہ بن گئی۔ اپنے ان سب تماشوں کو پورا کرنے کے لیے فیکٹری والوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔ میں اس کام میں اتنا طاق ہو چکا تھا کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہوتا تھا میں نے فیکٹری مالکان کے ہو بہو سائن کرنا بھی سیکھ لیے تھے۔ میں اتنا کام نہیں کرتا تھا جتنا فارغ اوقات میں بیٹھ کر مالکان کے دستخط کی پریکٹس کرتا تھا۔ میں یہ لوٹی ہوئی رقم اپنی عیاشیوں پر اڑاتا' اُس کے علاوہ دوسری برائیوں میں بھی طاق ہو چکا تھا۔ سینئرز کی عزت نہ کرنا' جونیئرز پر خواہ مخواہ کا رعب ڈالنا' بداخلاقی کرنا' جھوٹ بولنا' فیکٹری میں سب ہی میری بداخلاقی سے تنگ تھے مگر مجھے تو اپنے خونی رشتوں کی پرواہ نہیں تھی غیروں کی بھلا کیا کرتا' گھر والے اپنی ضرورتوں کے لیے سدا ترستے رہے مگر مجھے رحم نہ آیا شروع شروع میں بات ہزاروں تک رہی جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ کسی کو مجھ پر شک نہیں ہو رہا تو میں نے لاکھوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے شروع کیے۔ نئے ماڈل کی شاندار بائیک خریدلی۔

بائیک خریدنے پر مجھے وہ شوق بھی ہو گیا جو میری عمر کے ہر آوارہ گرد لڑکے کو ہو جاتا ہے ون ویلنگ کا شوق..... جان ہتھیلی پر رکھ کر بائیک چلا کر راہگیروں کی نظروں سے توصیف حاصل کرنے کا جنون..... میں شہر کی کشادہ سڑکوں پر دیوانوں کی طرح نت نئے طریقوں سے بائیک چلاتا اُلٹے سیدھے کرتب دکھا کر خود کو بہت بڑا ہیرو سمجھتا ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچتا کہ ذرا سی بھی بے احتیاطی مجھے عمر بھر کے لیے معذور کر سکتی ہے میری جان جا سکتی ہے۔ مگر ون ویلنگ کرنے والا کوئی آوارہ 'چھچھورا' یہ باتیں سوچتا ہی کب ہے۔ اگر ماں اور بہنیں اس خطرناک کھیل کی نوعیت سمجھانے کی کوشش کرتیں تو اس کا جواب بھی انتہائی لاپروائی سے دیا جاتا۔

''زندگی ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں..... اب اس کو بھی انجوائے نہ کروں تو کیا اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دوں۔ خود کو ترسا کر وقت سے پہلے قبر میں جا کر لیٹ جاؤں۔'' دن بہ دن میرے ٹھاٹ باٹ بڑھنے لگے تو میرے کولیگ جن میں سے اکثر نہایت ایماندار تھے ان کو میری حرکات مشکوک لگنے لگیں۔ دس بارہ ہزار کی تنخواہ میں میری اس درجے کی شان و شوکت انہیں کھٹکنے لگی تو انہوں نے مجھ پر خفیہ نظر رکھنی شروع کر دی۔

میں اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ میری انکوائری نہایت خاموشی اور راز داری سے شروع ہو چکی ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے جب انسان کی شامت کا وقت قریب آ جاتا ہے تو اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی جاتی ہے تا کہ وہ کچھ دیکھ نہ سکے۔ اس کے کانوں میں سیسہ ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ کچھ سن نہ سکے۔

اس کی محسوسات کی صلاحیتیں کمزور کر دی جاتی ہیں کہ غور و فکر نہ کر سکے اور نہ ہی خطرے کو بھانپ سکے بالکل اس 'غافل مویشی' کی طرح جو شیر کے حملے سے پہلے بے خبر آزادانہ کھا پی رہا ہوتا ہے..... گھوم پھر رہا ہوتا ہے..... اس کو لگتا ہے کہ ہر طرف شانتی ہی شانتی ہے اس کا کوئی دشمن نہیں ہے جو اس پر حملہ آور ہونے کے لیے آنکھ رکھے ہوئے ہے اور پھر اس کی یہی غفلت اس کی موت بن جاتی ہے۔

Digitized by G

☆.....☆.....☆

اس دوران امی بیمار ہوگئیں ظاہر ہے ایسی مائیں بیمار ہی ہوجاتی ہیں جن کی بے حسی' مردہ ضمیر اولاد اپنی عیاشیوں میں مگن اپنی ذات پر کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہو۔ میری بے حسی دیکھتے ہوئے میری بڑی شادی شدہ بہن مجھ سے بری طرح لڑ پڑی۔ اس نے مجھے میری بے حسی اور سنگدلی آئینے میں دکھائی تو کسی جنگلی خونی بکرے کی طرح پاگل ہوگیا اور ٹکر مار کر اس آئینے کو ہی چکنا چور کردیا۔ نہ مجھے اپنا آپ غلط لگتا تھا اور نہ ہی اپنے کردار کے بارے میں کچھ غلط سننا برداشت تھا۔

''امی..... ایسی اولاد کے لیے آپ مزاروں پر چراغ جلا کر منتیں مانگا کرتی تھیں۔ ایسی سنگدل اور نافرمان اولاد سے تو بہتر تھا کہ آپ کا کوئی بیٹا ہی نہ ہوتا اور نہ ہی ہمارا کوئی بھائی..... ایسی بدکار اولاد جو صرف ذلت کے سوا کچھ نہیں۔'' میری بہن نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا سو فیصد حقیقت تھی مگر سچ کس کو برداشت ہوتا ہے۔ مجھے بھی یہ سچ کسی زوردار تھپڑ کی طرح لگا تو میرا دماغ گھوم گیا۔ اپنی شان میں گستاخی پر میں نے اپنی بڑی بہن کو بے دردی سے پیٹ ڈالا اور وہ بھی اس بھیانک طریقے سے کہ وہ لہولہان ہوگئی۔ اس کو اسپتال میں داخل کروانا پڑا تو اس پر کافی خرچہ آیا امی نے میرے آگے ہاتھ جوڑے کہ' کچھ پیسے دے دوں' کتنی مجبور تھی وہ ماں جو اپنی زخمی بیٹی کے علاج کے لیے پیسے اس شخص سے مانگ رہی تھی جس نے اسے اس حال پر پہنچایا تھا میرے دل میں اس وقت نفرتیں بھری تھیں مجھے کسی کی پرواہ نہ تھی۔

''وسیم..... تجھے اللہ کا واسطہ ہے رحم کر اپنی بہن پر وہ مرجائے گی۔'' وہ بدنصیب ماں میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر بلک بلک کر روتی رہی..... مگر میرے دل کے پتھر میں یہ آنسو سوراخ نہ کرسکے۔

''اور پھر وہ مرگئی۔'' زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے سچ مچ مرگ ء۔ میری وہ بہن جو مجھے ہاتھوں سے نوالے بنا کر کھلاتی تھی میں نے اسے مار دیا۔ جو میری فرمائشیں پوری کرنے کے لیے راتوں کو جاگ کر سلائی کیا کرتی تھی میں نے اسے مار دیا۔ جو میرے نخرے اٹھاتی تھی اور میری وجہ سے ابو سے ڈانٹ کھاتی تھی میں نے اسے مار دیا ابو کے بعد میں نے اپنے گھر کے ایک اور فرد کی جان لے لی مگر مجھے اس کا ذرا برابر بھی افسوس نہ تھا پولیس تفتیش کرنے آئی کہ موت طبعی ہے یا پھر کوئی انسان ذمے دار ہے۔ مگر میری ماں نے اس موقع پر بھی مجھے پولیس کی تفتیش سے بچالیا۔ وہ ایک اولاد کھو چکی تھی دوسری کھونے کا حوصلہ نہیں تھا انہوں نے تفتیش سے بچانے کے لیے مجھے اپنی سہیلی کے ہاں دوسرے شہر بھجوادیا۔

اس دوران مجھے خبر ملی کہ فیکٹری مالکان کو میرے خلاف غبن کے بہت سے ثبوت مل چکے ہیں اور وہ مجھے تلاش کررہے ہیں۔ ایسے حالات میں میرا روپوش ہونا ہی بہتر تھا۔ جاتے ہوئے بھی میں اچھی خاصی رقم پندرہ بیس لاکھ پر ہاتھ صاف کرچکا تھا۔ کچھ عرصے پولیس میری تلاش میں رہی اور پھر ٹھنڈی پڑگئی۔

☆.....☆.....☆

ایک کے بعد ایک صدمے نے امی کو دل کا مریض بنایا تو میری غیر شادی شدہ بہن نے مجھے مدد کے لیے پکارا۔ میرے پاس پیسے علاج کے لیے تھے مگر میں نے صاف انکار کردیا۔

''پتہ بھی ہے کہ میں آج کل بے روزگار ہوں کہاں سے علاج کے پیسے دوں۔'' وہ میرا انکار سن کر سیخ پا ہوگئی۔ خوب چیخی چلائی روئی دھوئی۔

Digitized by Google

''موت تو ایک دن سب کو ہی آنی ہے چاہے علاج کرواؤ یا نہ کرواؤ کون سا علاج معالجے سے ہم امی کو بچالیں گے..... ہاں اگر آپ کو اتنا ہی درد ہے تو خود کمانا شروع کردو۔'' وہ میری خبیث سوچ اور غلیظ ذہنیت سمجھ نہ سکی۔

''کیا مطلب.....!''

''مطلب یہ کہ آپ جیسی خوبصورت لڑکی اگر 'کال گرل' بن جائے تو راتوں رات لاکھوں کما سکتی ہے کروائیں اپنے حسن کو کیش اور پوری سخاوت کے ساتھ امی کے علاج پر پیسہ خرچ کریں۔'' انتہا تھی یہ ایک بیٹے کی بے حسی کی..... بھائی کی بے غیرتی کی..... مگر میں وہ انتہا چھو گیا تھا۔ میں اس لمحے انسان نہیں جانور بن چکا تھا اور جانور بھی وہ جو سب جانوروں میں بے حیا اور بے شرم سمجھا جاتا ہے۔ میں خنزیر بن گیا جو اپنی جوان بہن کو خود 'کال گرل' بننے کا مفت مشورہ دے رہا تھا۔ مناسب علاج نہ ملنے کی وجہ سے امی دنیا سے چلی گئیں۔ مجھے نہ افسوس کے اژدھے نے ڈسا اور نہ ہی پچھتاوے کے بچھوؤں نے ڈنک مارے کہ میں ان کی میت کو کندھا دینے ہی چلا جاتا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں گیا تو پولیس مجھے دھر لے گی۔

☆.....☆.....☆

مجھے روپوش ہوئے سال گزر گیا۔ میں اس قید سے عاجز آچکا تھا۔ میں ایک بار پھر سے کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا تھا۔ زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ دسمبر کی آخری دم توڑتی شامیں میرے اندر پھر سے جینے کی امنگیں پیدا کررہی تھیں۔ میں نئے سال کی ابتدا شاندار طریقے سے کرنے کا خواہشمند تھا۔ میرے ذہن میں مستقبل کے حوالے سے کئی پلان تھے کہ غبن کے پیسوں سے ذاتی کاروبار شروع کرلوں گا۔ زندگی میں پھر سے مزے ہی مزے ہوں گے مگر اس سے پہلے میں دوستوں کے ساتھ شاندار یادگار انداز میں نیو ایئر نائٹ منانا چاہتا تھا۔

یخ بستہ دسمبر کی آخری راتوں میں دوستوں کے ہمراہ شہر کی کشادہ سڑکوں پر ہم جنونی انداز میں بائیک دوڑا رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہونے والی بارش نے سڑکوں کی پھسلن میں اضافہ کردیا تھا۔ ہم آزاد پنچھیوں کی طرح اڑ رہے تھے۔ حلق سے بے ہنگم قہقہے اور بے ڈھنگی آوازیں نکال کر اپنے جوش و جذبے کا اظہار کررہے تھے۔

''ہیپی نیو ایئر.....!'' اور پھر زور دار چیخیں سڑکوں کی رونق بڑھانے لگیں۔

ایک دو جگہ ہم سب دوستوں نے ٹریفک کے اصولوں کو بھی توڑا مگر جوانی دیوانی ہو تو ہر اصول اور پابندی کو روندتی چلی جاتی ہے۔ ہم بھی اس وقت جوانی کے نشے میں دیوانے ہوئے جارہے تھے۔ اتنے دنوں بعد قید خانے سے کھلی فضا میں آیا تھا میری تو خوشی بے قابو ہوئی جارہی تھی۔ خوشی جب اوور ڈرنک کی طرح دماغ کو چڑھی تو پھر الٹی سیدھی حرکتیں کرتے ہوئے اپنا جنون اور شوق ون ویلنگ پھر سے جاگ اٹھا۔ میں نے جوشیلے انداز میں بائیک کا اگلا ٹائر تھوڑا سا اٹھایا تو میری دیکھا دیکھی میرے دوستوں نے بھی میری تقلید کی۔ کچھ منچلے تو ہاتھ چھوڑ کر بائیک چلا رہے تھے سڑک پر موجود راہگیروں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی بعض ناگواری سے گھور رہے تھے۔ لڑکیوں کے نشیلے نینوں میں ہمارے لیے توصیف نظر آئی تو بے خودی بڑھنے لگی۔ اب بائیک کو نئے نئے طریقوں سے چلاتے کبھی اٹھاتے' موڑتے ہوئے کرتب دکھانے لگے کبھی بائیک پر لیٹ کر کرتب دکھاتے مگر دل کی بے قراری ختم نہیں ہورہی تھی۔

Digitized by Google

''یار وسیم..... ذرا سنبھل کر سڑکوں پر پھسلن بہت ہے اب بس کردے۔'' میرے دوستوں نے میرا جنون دیکھ کر مجھے وارن کیا مگر وسیم نے زندگی میں اپنے ماں باپ کی نہیں سنی تھی کسی کی کیا سنتا۔

''اوئے کیا سمجھ رکھا ہے تم نے اپنے بھائی کو..... ون ویلنگ کا چیمپئن ہوں ..... چیمپئن.....!'' میں نے شیخی بگھارتے ہوئے مزید کرتب دکھانے شروع کیے۔ انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا کہ اگلا قدم اگلا پل اُسے کہاں پہنچا سکتا ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے انسان اپنی بربادی کا انتظام کررہا ہوتا ہے۔ میں نے جوش میں اگلا ٹائر اتنا زیادہ اٹھالیا کہ زمین کے بہت قریب ہی تھا۔

''ہیرو..... ہیرو.....!' کچھ منچلوں کی آوازوں نے میرے جوش کو آگ لگائی' تو جنون کے شعلے پوری شدت سے بھڑکنے لگے۔ بالکل ایسے ہی شعلے میری بائیک کے پچھلے ٹائر سے بھی نکلے جو مجھے تو نہ دکھائی دیے مگر میرے دوستوں کی چیخ و پکار بلند ہوئی۔

''وسیم..... بائیک روک دے..... ورنہ مرے گا.....!'' میرا دوست چلایا۔ انسان کی جب شامت سر پر پہنچ جاتی ہے تو پھر کان آنکھیں سب بند کردیے جاتے ہیں میں اپنی دھن میں مگن رہا۔ گڑگڑ کی زوردار آواز کے ساتھ میری بائیک کے پچھلے ٹائر میں سے شعلے بلند ہوئے تو میرے اوسان خطا ہوگئے۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ نے میرا کنٹرول بائیک پر سے ختم کیا تو طوفانی شور کے ساتھ میری بائیک سڑک پر گر کر رگڑتی چلی گئی اور ساتھ ہی میں بھی بہت بری طرح زمین پر رگڑ کھاتا ہوا گرتا چلا گیا۔ میرا وجود فٹ پاتھ کے ساتھ فٹبال کی طرح ٹکرایا اور میرے کانوں نے دھماکے کے ساتھ بائیک کے پرخچے اڑنے کی آواز سنی۔

میرے حواس مختل ہوئے تو دماغ بالکل سن ہوگیا۔ ابھی پہلی قیامت صغریٰ ہی ٹوٹی تھی کہ دوسری قیامت بھی ٹوٹ پڑی آئل ٹینکر میری ٹانگوں کو کچلتا ہوا تیزی سے نکل گیا۔ اور پھر میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔

فرعون کی فرعونیت کا انجام ہوگیا تھا۔ ون ویلنگ کے شوق نے مجھے عمر بھر کی معذوری دے دی تھی میری کمر کے مہرے ٹوٹے اور آئل ٹینکر نے میری ٹانگوں سے مجھے محروم کر ڈالا۔ میرا بایاں بازو بھی ٹوٹ گیا تھا۔ بس اگر کچھ سلامت رہا تو میری آنکھیں' میرا دماغ' اور میرا داہنا ہاتھ' قدرت نے مجھے عبرت کا نمونہ بنا ڈالا تھا۔ لوگوں کو خود پر رحم کھاتا ہوا دیکھتا ہوں' حالانکہ میں رحم کے قابل نہیں ہوں..... میں اپنی آنکھوں سے اپنی بے بسی دیکھتا ہوں قدرت نے میرا ہاتھ سلامت رکھا تاکہ میں اپنے ہتھ سے اپنا جرم لکھوں اور لوگوں تک پہنچاؤں۔ میرا دماغ سلامت رکھا تاکہ میں پچھتاؤں کے دردناک عذاب سے گزروں۔ اپنی غلطیوں اور گناہوں کو فراموش کرکے میں جو ایک نئے سال ..... ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے چلا تھا مجھے علم بھی نہیں تھا کہ اب میری زندگی کا اختتام لکھ دیا گیا ہے۔ میں دنیا والوں کی نظروں میں تو زندہ رہوں گا مگر میرے اندر موت واقع ہوچکی ہوگی۔ اپنے اتنے پیارے اور مخلص رشتوں کے ساتھ جو ظلم اور بے حسی کرکے مجھ جیسے نوجوان اگر خوشیوں کی تمنا کرتے ہیں تو وہ محض خود کو دھوکا دیتے ہیں ہم خوشیوں کے آغاز کا پلان کرتے رہ جاتے ہیں اور تقدیر ہمارے نصیب میں دکھوں کا آغاز لکھ دیتی ہے۔ اور پھر کوئی آنے والا سال نہ ہی نیا ہوتا ہے اور نہ ہی خوشیوں بھرا.....!

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

منچن آباد سے ارسال کردہ تحریر

ناقص العقل

عورت کو ناقص العقل کہنے والوں کی شاید اپنی عقل گھٹنوں میں ہوتی ہے..... ندیم نے بھی یہی ثابت کیا تھا.....

حسین خواجہ

پیکر جذبات صنف نازک کے خمیر کو حساسیت کے چشمے کا پانی دیا جاتا ہے اسی لیے تو وہ اس قدر نازک ہوتی ہے کہ اس کے ٹوٹنے پر شور بھی نہیں ہوتا ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ عورت کو ناقص العقل سمجھا جاتا ہے جبکہ یہ امر اپنی جگہ بجا ہے کہ ایک کامیاب آدمی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

کیا ایک عورت کا وجود صرف اور صرف بچے پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے؟ کیا بیوی حاصل کرنے کا ایک یہی مقصد ہوتا ہے؟ میں نے سوچ لیا تھا کہ آج ندیم سے پوچھ کر رہوں گی آخر کیوں ندیم مجھے ناقص العقل سمجھتا ہے آخر میں کیوں نہیں اس کو ایک اچھا مشورہ دے سکتی جب بھی میں حالات زندگی سے تنگ آ کر اس کو کسی کام کا مشورہ دوں یا کچھ سمجھانے کی کوشش کروں تو وہ مجھے کہہ دیتا ہے۔

''تم کیا جانو عورت تو ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔'' ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی جو ندیم کا مخصوص انداز تھا جس سے میں جان جاتی تھی کہ ندیم آ گئے ہیں خیر تو میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''جی آپ آ گئے ہیں؟''

''نہیں ابھی تک دوکان پر ہی ہوں۔''

''ندیم آخر اتنا غصہ کیوں؟''

''تم احمقانہ سوال کرو اور میں اس پر غصہ بھی نا کروں۔'' ندیم موٹر سائیکل اندر لے آئے اور میں دروازہ بند کر کے کچن میں چلی گئی اب مجھے ندیم کے ایسے رویے کی شاید عادت سی ہو گئی تھی کچھ برا ہی نہیں لگتا تھا بس کبھی کبھی دکھ ہوتا تھا کہ آخر ندیم ایسا کیوں ہے بس انہی سوچوں میں گم ہو کر ندیم کے لیے کھانا گرم کیا اور لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا ندیم اب تک چار سگریٹ پی چکا ہے اور پانچواں سگریٹ اس کے ہاتھ میں ہے میں نے کھانا بیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ندیم آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہ سگریٹ آپ کے لیے کتنی نقصان دہ ہے۔''

Digitized by Google

''کم از کم تم سے تو زیادہ ہی پتا ہوگا۔''

''برا فسوس آپ چھوڑتے پھر بھی نہیں۔''

''تمہیں کیا پتا مجھے کتنی فکریں اور پریشانیاں ہیں۔''

''تو کیا ان کا حل صرف سگریٹ ہی ہے۔''

اس پر غصے سے ندیم نے کہا۔

''اب تم کیا چاہتی ہو؟''

''ندیم سگریٹ پینے کی وجہ سے آپ کے پسینے میں بدبو زیادہ ہوگئی ہے۔''

''اچھا تو صاف صاف کہو نا کہ اب تمہیں مجھ سے بو آتی ہے۔''

''افسوس کہ آپ میری بات کا الٹ مطلب نکالتے ہیں۔''

''اچھا تو تم الٹی بات کرو اور میں اس کا مطلب بھی نا نکالوں۔''

''ندیم کیا آپ میری بات کا مثبت مطلب نہیں نکال سکتے۔''

''شازیہ اب بچے بڑے ہوگئے ہیں اور ان کے سامنے میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا' اب پلیز تم مجھے مجبور مت کرو۔''

ندیم کی اس بات پر میں چپ چاپ کمرے سے باہر آگئی بچوں کو کھانا دیا اور خود گہری سوچوں میں گم ہوگئی کہ ندیم کے آنے سے پہلے کیا کیا سوچ کر بیٹھی تھی کہ ندیم آئے تو اس کے ساتھ یہ یہ بات کروں گی لیکن ندیم نے سب بھلا دیا اور ماضی میں دھکیل دیا کہ شادی سے پہلے کیا کیا سوچا تھا اور اب کیا کیا ہو رہا ہے اے کاش ندیم کبھی تو مجھے سمجھنے کی کوشش کریں بچے اب بڑے ہو رہے ہیں ان کے مستقبل کا کچھ سوچا جائے لیکن افسوس اس پر بھی اس کی روایتی سوچ کہ ہمارے ماں باپ نے تو ہمارے لیے کچھ نہیں سوچا تھا اور ہم تو پھر بھی کامیاب ہیں' آخر میں کروں تو کیا کروں بس

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

Digitized by Google

انہی سوچوں میں میں گم تھی کہ پتا ہی نہیں چلا کب شام سے رات ہوگئی اور ندیم نے مجھے آواز دی۔

''شازیہ بات سنو۔''

''جی آئی۔'' جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو ندیم کہنے لگے۔

''بچے کیا کر رہے ہیں؟''

''ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔''

''اچھا دروازہ بند کردو۔''

''ندیم آپ تھوڑا انتظار کرلیں بچے اب بڑے ہوگئے ہیں ایسے اچھا نہیں لگتا اور ویسے بھی بچوں پر ان چیزوں کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔'' میری اس بات پر ندیم آگ بگولہ ہوگئے اور کہنے لگے۔

''صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ اب میں تمہیں اچھا نہیں لگتا فضول میں بہانے کیوں بنا رہی ہو۔''

''ندیم اس میں اچھا لگنے یا نا لگنے والی کون سی بات ہے تم میرے شوہر ہو تمہارا حق ہے لیکن تم بات کو تھوڑا سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''اچھا تو اب مجھے بچوں کی فکر نہیں ہے۔''

''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔''

☆.....☆.....☆

بچوں کو اسکول کے لیے روانہ کر کے میں نے ندیم کے لیے ناشتہ بنایا اور کمرے میں لے گئی میرے اٹھانے سے پہلے ہی ندیم اٹھے ہوئے تھے اور سگریٹ کے کش پر کش لگائے جا رہے تھے۔

''ندیم کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو؟ پلیز اتنی سگریٹ مت پیا کرو۔''

''شازیہ تمہیں کیا پتا کہ میں کتنا پریشان ہوں؟''

''ندیم تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ نہیں ہے۔'' میرے اس جواب پر ندیم نے قہقہہ لگایا اور کہا۔

''ورنہ تم بھی سگریٹ پر سگریٹ پیا کرتیں۔''

''حد ہے ندیم کیا اپنے مسئلوں کا حل صرف سگریٹ ہی ہے۔''

''اچھا اگر ایسی بات ہے تو آج تم کوئی حل بتا دو؟''

''ندیم میں نے تمہیں یہ کام شروع کرنے سے پہلے ہی منع کیا تھا لیکن تم نے میری ایک نا مانی اور آج ہم کتنی پریشانی سے گزر رہے ہیں اگر بیٹی کی شادی کے لیے کوئی پالیسی لی ہوتی تو اس کی شادی پر کام آجاتی اب نادیہ دس سال کی ہوگئی ہے اور دس سال کا پتا ہی نہیں چلا اور ایسے میں مزید دس سال گزر جائیں گے اور اُن کا بھی پتا ہی نہیں چلنا اگر تم نے پہلے کوئی پلاننگ کی ہوتی تو آج تمہیں کوئی کاروباری پریشانی نا ہوتی جب سے اپنی شادی ہوئی ہے آج تک تم نے میری کوئی بات نہیں مانی۔''

''شازیہ کیا تمہیں پتا ہے کہ عورت کو ناقص العقل پیدا کیا گیا ہے؟'' ندیم کا یہ کہنا تھا کہ میرا دماغ شل ہوگیا اور میں نے خاموشی اختیار کرلی ندیم باتھ روم چلا گیا جب واپس آیا تو میں نے پوچھا۔

''ندیم ساتھی کا کیا مقصد ہوتا ہے؟''

میرے اس سوال پر ندیم نے شرارتاً کہا۔

''یار کل رات ہی تو بتایا تھا.....''

ہمارے ہاں یہ تو بتایا جاتا ہے کہ عورت ناقص العقل ہے لیکن ایک اچھی بیوی کی خصوصیات نہیں بتائی جاتیں میں جان چکی تھی کہ جب تک ندیم ساتھی کا مطلب نہیں جان جاتا تب تک ہمارے حالات نہیں سدھرنے والے.....

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

گوجرہ سے ارسال کردہ ایک لڑکی کا المیہ

بے وقوفی

حسین اور ماڈل دکھنے کی تمنا اکثر جان لے لیتی ہے

آصفہ کئی دنوں تک زہریلا چونا چاٹتی رہی تھی.....

غلام مرتضیٰ علوی

آصفہ بظاہر کتاب کھولے مطالعہ پاکستان کی کتاب سے کل ہونے والا ٹیسٹ یاد کر رہی تھی مگر حقیقت میں اِس وقت اس کا دماغ کتاب سے بھٹک کر اپنے ایک پرانے مسئلے کے حل میں کھویا ہوا تھا۔ قارئین کرام وہ مسئلہ یہ تھا کہ آصفہ جونہم کی طلب علم تھی۔ قدرت نے اس کو قدرے گندمی رنگ اور فربہ جسم سے نوازہ ہوا تھا جو کہ ایک بڑا مسئلہ بن کر آصفہ کے دماغ سے چمٹ گیا تھا۔ اس کے خیال سے وہ بہت موٹی اور کالی ہے اور اب وہ دبلی پتلی اسمارٹ اور حسین ہونا چاہتی تھی۔

آٹھویں تک تو آصفہ محلے کے مقامی اسکول میں ہی زیرِ تعلیم رہی مگر اب وہ شہر کے ایک بڑے اور اعلیٰ ہائی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ اس اسکول میں گورنمنٹ کے دوسرے اسکولوں کے ساتھ کھیلوں کے مقابلے مینا بازار اور علمی کوئز مقابلے وغیرہ بھی باقاعدگی سے ہوتے رہتے تھے۔ آصفہ کو اسکول کی کرکٹ ٹیم اور اسکوائش کے کھیل میں حصہ لینے کا بہت شوق تھا۔ وہ اسکول میں ہونے والے ڈراموں میں بھی حصہ لینا چاہتی تھی۔

مگر جب اس کو اسکول کی اسپورٹس ٹیچر مس فضیلت نے ٹرائی لیتے ہوئے نوویں اور دسویں کلاس کے کرکٹ میچ میں شامل کیا تو قدرے موٹے جسم کی وجہ سے اس کو بیٹنگ اور رننگ کرتے وقت بہت سانس چڑھ گیا اس ہی طرح فیلڈنگ میں اس سے بروقت گیند پکڑی نا جاسکی تو دو بار چوکا ہو گیا۔ تب دوسری لڑکیوں نے اس کا بہت مذاق اڑایا۔ میچ کے بعد وہ اسکول کے ایک کونے میں بیٹھ کر دیر تک روتی رہی کہ اچانک اس کی اسکول میں واحد دوست شائلہ اِدھر آنکلی جس نے اِس کو چپ کرایا۔ جس کے بعد وہ اسکول سے گھر کی جانب روانہ ہوئی۔ قارئین کرام آصفہ اس دن کی بے عزتی (جو اس کے موٹے جسم کی وجہ سے کھیلنے میں ہوئی تھی) بھول نہ سکی۔ اب بھی بظاہر گھر میں وہ کتاب کھولے پڑھ رہی تھی مگر دراصل وہ یہ سوچ رہی تھی کہ میں دبلی پتلی کیسے ہوں۔ میرا چہرہ کیسے صاف ہو۔

Digitized by Google

رات کو اِس نے حسب معمول اپنے بڑے بھائی کا اسمارٹ فون اٹھایا اور نیٹ چیک کرنے لگی۔ (آصفہ کے امی ابو نے آصفہ کو سادہ فون لے کر دیا ہوا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ جب وہ دہم میں فرسٹ پوزیشن لے گی تو اِس کو اعلیٰ قسم کا اسمارٹ فون لے کر بطور تحفہ دیا جائے گا) اچانک ایک جگہ سرچ کرتے کرتے وہ چونک پڑی یہ ایک آن لائن ویب تھی جس کے پہلے صفحے پر ہی آصفہ کے لیے خوشیوں کا پیغام تھا۔ یہ ایک دوائی کا اشتہار تھا جس کو کھانے سے جسم پتلا ہو جاتا تھا اور چہرے پر لگانے والی کریم سے رنگ گورا گورا ہو جاتا تھا۔

آصفہ خوشی سے جھوم اٹھی اور اس نے جلدی جلدی کاغذ قلم لے کر ویب کا فون نمبر اور ای میل نوٹ کیا۔ اور کاپی کا ورق پھاڑ کر اس کو اپنے بیگ میں چھپا لیا۔ دوسرے دن اسکول سے چھٹی کے بعد شائلہ کے گھر جا کے آصفہ نے اپنی سہیلی کے اسمارٹ فون سے اِس آن لائن اسٹور پر آرڈر دے دیا۔ شائلہ نے اِس سے پوچھا بھی کہ کیا کر رہی ہو۔ مگر اس نے کہا۔ میں نے اسٹور سے میک اپ کی ایک چیز منگوائی ہے اور فون نمبر تمہارا دیا ہے اس لیے اب وہ اسکول کے پتے پر کوریئر کے ذریعے ارسال کریں گے جس کو ہم اسکول میں ہی وصول کر لیں گے۔'' تو قارئین کرام آن لائن اسٹور پر آرڈر دینے کے پانچویں دن کوریئر کا ملازم اسکول میں دو ہزار کا کیش آن ڈیلیوری پارسل لے کر آ گیا جس کو آصفہ نے شائلہ کے ساتھ مل کر وصول کر لیا۔ مگر شائلہ کو کھول کر پھر بھی نا دکھایا کہ یہ کیا ہے۔

اسکول بیگ میں چھپا کر بریک کے وقت اِس

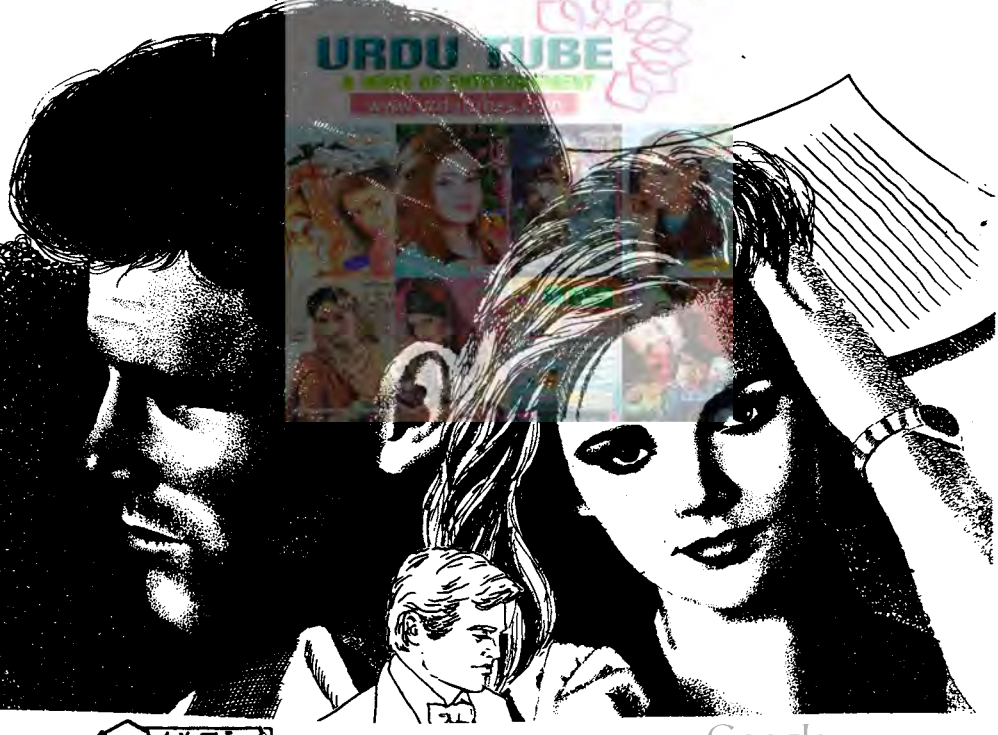

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT

Digitized by Google

نے پارسل کھولا تو ایک کریم چہرے پر لگانے والی تھی ایک ڈبی گولیوں کی تھی جو صبح شام کھانی تھی آصفہ ان دوائیوں کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھی۔ کوریئر والوں کا ریپر اور گتہ اس نے اسکول کے ردی ڈالنے والے ڈرم میں ڈال دیا اور جب شام کے وقت وہ گھر آئی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا وہ دس پندرہ دن میں ٹی وی پر آنے والی ماڈل کی طرح ہو جائے گی۔ مگر دوستو اس کو کیا پتا تھا کہ آگے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

دوسرے دن سے ہی اس نے امی سے چھپا کر گولیاں کھانا شروع کر دی اور سوتے وقت رنگ گورا کرنے والی کریم چہرے پر لگانے لگی۔ گولیاں کھانے کے چھٹے دن کا واقعہ ہے اسکول میں اچانک اس کی طبیعت خراب ہوئی الٹیاں آنے لگیں پہلے تو اس کی سہیلی شائلہ نے اس کو پانی پلایا مگر جب الٹی نہ رکی۔ تو وہ بھاگ کر اسکول ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے پاس گئی جنہوں نے اسکول میں دستیاب طبی امداد دی۔ مگر طبیعت نہ سنبھلنے پر مقامی اسپتال کو فون کر دیا ساتھ ہی آصفہ کے ابو امی کو بھی فون کر دیا۔

جب تک ایمبولینس آصفہ کو اسپتال لے کر جاتی آصفہ کے بھائی ابو اور امی بھی اسپتال کے مین گیٹ پر آ گئے اِدھر ایمبولینس آئی اُدھر ڈاکٹروں نے آصفہ کا چیک اپ شروع کر دیا۔ خدا خدا کر کے آصفہ کو ہوش آیا تو وہ امی ابو بھائی شائلہ اور دوسرے رشتے داروں کی طرف دیکھ کر رو پڑی۔

قارئین کرام ڈاکٹروں نے جب آصفہ کے ابو کو کہا۔ لگتا ہے بچی چونا نماز ہر کھاتی رہی ہے۔'' تو وہ حیران رہ گئے کہ آصفہ تو کبھی کوئی دوائی استعمال نہیں کرتی تھی یہ؛ اکثر کیا کہہ رہے ہیں۔

آصفہ کا معدہ واش کرنا پڑا اور وہ ایک ماہ اسپتال میں رہی تب کہیں جا کر دوائی کے زہریلے اثرات اس کے خون سے ختم ہوئے' شائلہ نے آصفہ کے والدین کو بتایا کہ اس نے ایک بار کسی غیر معروف ویب اسٹور سے کچھ منگوایا تھا جو اس نے مجھ سے بھی چھپایا تھا۔'' جس پر اُس کے گھر والوں نے اس کے کمرے کی تلاشی لی تو گھٹیا کوالٹی کی دوائی اس کی الماری سے برآمد ہوئی جس کو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تو ڈاکٹر نے کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ بچی اپنے موٹاپے اور گندمی رنگت کو اتنا زیادہ دل پر لے گئی کہ اس نے کسی بڑے سے پوچھے بنا ہی گھٹیا دوائیں منگوا کر کھانی اور لگانی شروع کر دیں۔ جس نے اس کو بہت زیادہ نقصان پہنچا دیا۔ اگر بچی ہر روز مناسب ورزش اور متوازن خوراک استعمال کرتی تو چند ماہ میں ہی دبلی ہو جاتی۔'' تو قارئین کرام آپ نے دیکھا کہ آصفہ اپنی ناسمجھی میں خود سے دوا منگوا کر استعمال کرنے لگی جس سے اس کو بے پناہ نقصان ہوا۔ لہٰذا آپ بھی کبھی بھی ٹی وی یا انٹرنیٹ کے دل کش اشتہارات سے متاثر نہ ہوں نہ ہی کبھی بھی خود سے کوئی بھی دوا منگوا کر کھائیں۔ بلکہ آپ کو جب بھی کوئی مسئلہ ہو تو کوالیفائیڈ ڈاکٹر کے پاس جا کر چیک اپ کرائیں اور اس کی دی ہوئی دوائیں ہی کھائیں کیونکہ گیا وقت کبھی لوٹ کر واپس نہیں آتا اور صحت ایک بار خراب ہو جائے تو پھر تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ ہمیں اپنی بچیوں کو سمجھانا چاہیے کہ مکمل اعضاء اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں اور بناوٹی دنیا کے رہنے والوں کا عام زندگی بسر کرنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لہٰذا کمرشل لوگوں کی باتوں کو دل سے نہ لگانا ہی بہتر ہے۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

پکھی واس

کڑوی حقیقتوں کو آشکار کرتی سچی تحریر..... غور سے دیکھیے

یہ سارے مناظر ہمارے آس پاس ہی ہیں.....

مجید احمد جائی

صبح کا وقت ہے، ہوا میں خنکی رقص کر رہی ہے، میں مین روڈ پہ کھڑا گاڑی کے انتظار میں ہوں۔ میری منزل بہت دُور ہے۔ گاڑی کے اسٹاپ پر آنے تک میں اللہ تعالیٰ کی فطرت سے دِل لبھا رہا ہوں۔ بے نیاز ربّ نے اِنسان کو کیا کچھ عطا کر دیا۔ کیا کچھ اُس کی دسترس میں کر دیا۔ موٹر گاڑیاں، ہوا جہاز، پہلے پرندوں کو ہوا میں اُڑتے دیکھتے تھے اب اِنسان ہوا میں اُڑتا پھرتا ہے۔

اِنسان ہوا میں اُڑتے اُڑتے بُھول سا گیا ہے۔ اِس کے اندر بھی ہوا بھر گئی ہے۔ غرور، تکبر، انا، لالچ، حرص، نفرت کی ہواؤں سے مالا مال ہو گیا ہے اور اِنسان ہو کر اِنسان کو ہی نوچ کھانے پر تُل گیا ہے۔ کیا اِنسان نے ترقی کر لی ہے؟ یہی ترقی ہے تو جنگلوں میں رہنے والا اِنسان ترقی کی لسٹ میں سرفہرست ہے۔

میں جہاں کھڑا ہوں میرے ایک طرف سر سبز کھیت ہیں، جن میں گندم کی فصل لہلہا رہی ہے۔ کیکر، ٹاہلی کے درخت ننگے سر کھڑے ہیں۔ ان کی معصوم کونپلیں شاخوں میں سر چھپائے ڈری سہمی سی ہیں اور بہار کے آنے کی اُمید لگائے چھپ چھپ کے سر اُٹھاتی ہیں۔

سرسبز کھیتوں کے ساتھ بہت بڑا کالج ہے۔ یہاں ملک کے ہونہار طالب علم یونیفارم میں ہنستے مسکراتے، بن ٹھن کے صبح سویرے آتے ہیں اور پھر سہ پہر کو اُداس تھکے تھکے خماری آنکھوں سے، بوجھل قدموں کے ساتھ گھروں کو روانہ ہوتے ہیں۔ جانے دن بھر کیا پڑھتے ہوں گے، کیا سیکھتے ہوں گے، ؟ میرے دِل میں تجسس سا ہے۔ جاننے کی کوشش نہیں کر سکتا کیونکہ گیٹ پر گن سنبھالے گارڈ سے گھبراتا ہوں۔

جس اسٹاپ پہ میں کھڑا ہوں، وہاں اُس روڈ پر گاڑیاں بھاگم بھاگ دوڑتی چلی جاتی ہیں۔ چھوٹی بڑی، موٹر گاڑیاں، ٹرک، ٹرالر، موٹر سائیکل، بچارو، بسیں، مرسیڈیز ہارن بجاتی پلک جھپکتے گزری جاتی ہیں۔ پھر گدھا

Digitized by Google

ریڑھی بھی کہیں سے آن نکلتا ہے اور گدھا بان لمبے موٹے ڈنڈے سے گدھے کو مارتا ہوا جاتا ہے۔

جانے اِنسان گدھا ہے یا گدھا اِنسان ..... مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اِنسان گدھے کے ساتھ گدھا کیوں بن جاتا ہے۔؟ گدھے کی طرح کھانے لگا ہے، بلکہ چرنے لگا ہے، کھڑے کھڑے کھاتا ہے، اُسی کی طرح ہنکتا ہے، ہنہناتا ہے۔ گدھے دولتیاں مارتے ہیں تو اِنسان دو ہتھائیاں مارنے لگا ہے ورنہ اِنسان اور گدھے میں زیادہ فرق نہیں رہا۔

گاڑیاں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں بھاگ رہی ہیں اور بیچاری سڑک بے حس، بے جان پڑی درد سہہ رہی ہے۔ ٹائروں کی رگڑیں کھاتے کھاتے اس کی رنگت کالی سیاہ ہوگئی ہے، پتھریلی جلد سے بنی یہ سڑک صبر کر رہی ہے۔ جی ہاں صبر سیکھنا ہے تو سڑک سے سیکھیں۔ بیچاری چُپ چاپ سب کی سہتی رہتی ہے اور اُف تک نہیں کرتی۔ اس پر ہر طبقے کے لوگ سفر کر کے منزل کو پہنچتے ہیں۔ یہ منزل تک پہنچاتی ہے۔ سیدھا راستہ دکھاتی ہے اور بھٹکے ہوئے مسافروں کو گھروں تک پہنچاتی ہے۔ یہ کسی سے صلہ نہیں مانگتی اور ہر وقت اپنے رب کی حمد و ثنا میں مشغول رہتی ہے۔ ہاں اُس ذات کے ذکر میں بندہ مشغول ہو جائے تو بڑی سے بڑی مصیبت ٹل جاتی ہے، ہر تکلیف دُور ہو جاتی ہے۔ سڑک نے بھی یہی راستا اختیار کر لیا ہے اور جتنی بڑی بھی تکلیف ہو یہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہتی ہے۔ اِس نے صبر سیکھ لیا ہے اور

URDU TUBE

Digitized by Google

اِنسان نائب ہو کر بھی نہیں سیکھ سکا۔

سڑک کے دونوں طرف گاڑیاں آجا رہی ہیں اور طرح طرح کے لوگ محوِ سفر ہیں۔ ننھے بچے گاڑیوں کے شیشوں سے سر باہر نکال کر ماحول سے، خدا کی قدرت کے نظارے کرتے جاتے ہیں اور نوجوان شیشوں کی اوٹ سے درختوں، عمارتوں کے نظارے کر رہے ہیں۔ کہیں الہڑ مٹیار نظر آجائے تو اِن کا بس نہیں چلتا کہ گاڑی کو روک لیں اور اُس مہ جبیں کو دیکھتے رہیں۔ یہ نہیں تو وہ الہڑ مٹیار گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتی رہے۔

سڑک کی اِس طرف کالج کی بڑی عمارت شان و شوکت سے کھڑی ہے اور اس کی سامنے دیوار پر قائداعظم کھڑے خطاب کر رہے ہیں اور علامہ محمد اقبال سوچنے کے انداز میں قلم لیے محو بیٹھے ہیں۔ جیسے خضرِ راہ لکھ کر بیٹھے ہوں۔ یوں دیوار کو معلومات کا خزانہ بنایا گیا ہے۔

قصہ مختصر ہمارے ہاں دیواریں بولتی ہیں اور اِنسان گم صم سوچنے کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ دیواروں سے یاد آیا شاید ہی پاک سرزمین کی کوئی دیوار ایسی ہو جس پر کوئی اشتہار نہ ہو ورنہ جس کو نے بھی جاؤں سیاست سے لے کر عاملوں تک دیواریں خبریں دیتی ہیں۔ پبلسٹی کرتی یہ دیواریں، دیواریں کم اشتہاری مہم زیادہ لگتی ہیں۔ عاملوں کے حیرت انگیز کارنامے، محبوب قدموں میں، کاروبار میں رکاوٹ کی بندش کا حل، بیوی غلام، شوہر زیر، دُشمن ایڑھیاں رگڑتے پھریں گے، امتحان میں یقینی کامیابی کے مقولے عام دیکھنے کو ملتے ہیں۔

میں حیران ہوں اتنے عاملوں کے ہونے کے باوجود اس ملک میں کاروبار کیوں بند ہیں؟ بیویاں کیوں روٹھ جاتی ہیں۔؟ شوہر، بیوی کو چھوڑ کر دوسروں کی بیویوں کو کیوں تاکتے پھرتے ہیں۔؟ محبوب قدموں میں کیوں نہیں پڑے ہوئے؟ معیشت کا پہیہ جام کیوں ہے؟ ملک قرضوں میں کیوں ڈوبا ہوا ہے۔؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہر طرف کامیابیوں کے سیلاب کا طوفان ہوتا لیکن ناکامیوں کا منہ دیکھا جاتا ہے۔ جس کو دیکھو پریشان ہے۔ جس کو دیکھو کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا پھرتا ہے۔ چہرے زردی مائل، ماتھے پر شکن، اُلجھے اُلجھے، بیماریوں کا اژدھام سا ہے۔ کون سی بُرائی ایسی ہے جو معاشرے میں نہیں ہے۔ اب تو بیچاری دیواریں بھی دُہائی دیتی ہیں۔ ظالمو! ہمیں اب تو معاف کر دو۔ ہماری بھی زیست ہے۔ جس طرح تم اپنی زندگیاں گزارنے کے لیے ہمیں استعمال کرتے ہو، ہمیں بتاؤ ہم زیست کیسے گزاریں۔۔ تمہاری جگہ ہم ہوتیں تو شرم سے مر جاتیں۔ یوں ہماری زندگیاں کیوں خراب کرتے ہو۔ ہمیں معاف کیوں نہیں کر دیتے۔؟

اِنسان اشرف المخلوقات ہے۔ عقل و شعور میں سرتاج ہے۔ پھر جانے اس عقل کو دیمک کیوں چاٹ گئی ہے۔؟ دیواریں بھی ان کی عقل کو شاباش دیتی نہیں تھکتی، کیونکہ خود ہی لکھتے ہیں ''دیوار پر لکھنا منع ہے'' یہ جملہ دیوار پر لکھ کر خود ہی جرم کر رہے ہیں۔ اسی طرح ''دیوار کے ساتھ پیشاب کرنا منع ہے'' اوپر یہی لکھا ہوتا ہے اور نیچے اِنسان بیٹھا پیشاب کر رہا ہوتا ہے۔ کیا اِنسان نے انہی کارناموں میں ترقی کی، اِنسان ارتقاء کے مراحل عبور کرتے کرتے یہاں تک پہنچا ہے۔

اِنسان نے سیکھا بھی ہے تو غلطی کو دُہرانا۔ غلطی کر کے پچھتاتا نہیں ہے۔ اپنے کیے پر شرمندہ نہیں ہوتا۔ یہی اِنسان کی سب سے بڑی

Digitized by G

خامی ہے اور اِنسان کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ جب بھی تکلیف، مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اپنے رب، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ میں بھی اس وقت اللہ تعالیٰ کی فطرت کے نظاروں میں محو تھا۔ سڑک کے اُس جانب صابن فیکٹری سے آلودہ، زہریلا دھواں فضا کو آلودہ کر رہا ہے اور دوا یکٹر چھوڑ کر دوسری فیکٹری چاولوں کو پالش کرنے کی ہے۔ یہاں ملاوٹ کا کام عروج پر ہے، کھوٹے کو کھرا کیا جاتا ہے۔ اس فیکٹری کے مین گیٹ کے سامنے گاڑیوں کی لمبی قطار لگی رہتی ہے۔ گاڑیاں ایسی کہ جب چلتی ہیں ایسے لگتا ہے اینٹوں کا بھٹہ چل رہا ہے۔ دھواں چھوڑتی یہ گاڑیاں آلودگی میں اضافہ کر رہی ہیں۔ اس فیکٹری کے ساتھ عوامی ہوٹل ہے، یہ اس ہوٹل کا نام نہیں ہے بلکہ یہاں عام لوگوں کے لیے کھانا تیار ہوتا ہے۔ مزدور طبقہ یہاں سے دوپہر کا کھانا کھاتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ یہاں خالص روٹیوں کا ملنا محال ہے لیکن شراب اصل ملے گی۔ سالن ہانڈی کی بات نہ کریں۔ یہاں گدھوں گھوڑوں کا گوشت پکتا ہے۔ ویسے بھی حرام گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ یہ میرا تجربہ نہیں ہے اور نہ ہی ایسے کسی ہوٹل پہ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا ہے لیکن ایسا سُن ضرور رکھا ہے۔ ڈرائیور حضرات اور مزدور اپنے پیٹ کا دوزخ یہاں سے بھرتے ہیں کیوں کہ اِن کو روٹیاں اور سالن سستا مل جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں پیٹ کے اندر تو پیں چلنے لگتی ہیں۔

ہوٹل کا ماحول بھی اتنا اچھا نہیں ہے۔ ہر طرف آلودگی ہی آلودگی۔ جہاز ٹائپ ڈرائیور یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھار پولیس والے بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ ڈرائیور یہاں چرس، افیوم کے سگریٹ بھر رہے ہیں اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں تحلیل ہو رہے ہیں۔ نشے کے تمام لوازمات پولیس والے ہی فراہم کرتے ہیں اور اپنی پاکٹ میں اضافہ کرتے ہیں۔

اس ہوٹل کا ماحول رات کو کچھ اور بھی عیاش ہو جاتا ہے۔ شراب کے جام چھلکتے ہیں، شراب بکتی بھی ہے، شراب خریدی بھی جاتی ہے اور جام کے جام پیے بھی جاتے ہیں۔ کبھی کبھار یہاں امیر زادے بھی آ ٹھہرتے ہیں اور شراب اور شباب کے مزے اُڑاتے ہیں۔ رات بھر یہاں ماحول گرم رہتا ہے اور جب موذن رب کی طرف پکارتا ہے تو یہاں ماحول ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور لوگ یہاں اوندھے بے حال پڑے ہوتے ہیں۔ کسی کی ٹانگیں پیٹ کے ساتھ لگی ہیں اور کوئی کتے کی طرح پڑا ہے۔ کسی کا سر دوسرے کے پیروں میں ہے اور کسی کی بانہیں کسی کے سر کے نیچے۔ یوں ایک دوسرے سے جڑے بے حال پڑے ہیں۔ یہ اِنسان کم اور کتے زیادہ لگتے ہیں۔ جیسے سردی میں کتے توڑی کے ڈھیر میں پڑے ہوتے ہیں۔ صبح سورج سر پر آجاتا ہے تو یہ جاگ اُٹھتے ہیں اور سُرخ لال آنکھوں سے گاڑیوں میں بیٹھ کر نکل جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود تو موت کی طرف جا ہی رہے ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے آشیانے بھی اُجاڑ دیتے ہیں۔ سہاگن کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنا دیتے ہیں۔ خوشیاں چھیننے والے سانپ ہیں۔

ان جیسے ہوٹل ہی ہوتے ہیں جہاں جرائم سکھائے جاتے ہیں۔ یوں سمجھیں ایسے ہوٹل جرائم اکیڈمی کے طور پر کام آرہے ہیں اور اس سے کم ظرفی یہ ہے کہ قانون کی بغل میں ہوتے

Digitized by Google

ہیں۔ایسے تو نہیں کہتے چراغ تلے اندھیرا۔۔۔

میرا دِل ان کو دیکھ کر بھی نہیں کڑ رہا۔ایسے حادثاتے تو روز دیکھتا ہوں۔زیست حادثات کی آماجگاہ ہی تو ہے۔یہ تو ہمیں سکھاتی ہے، بتلاتی ہے۔آخرت کی زیست کی تیاری کیسے کرنی ہے .....؟ وہاں کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی بتاتی ہے.....آہ.....ہم بے عقل.....غور وفکر کریں بھی تو سہی۔

میں اِنسان ہوں اور حساس دِل رکھتا ہوں۔ معاشرے میں پھیلی بے حسی کو دیکھتا ہوں تو دِل خون کے آنسو روتا ہے۔میں دل ہی دل میں کراہتا ہوں، کیوں کہ میں طاقتوار نہیں ہوں۔ میرے پاس اقتدار نہیں ہے۔میں بولتا ہوں تو میری آواز کو دبا دیا جاتا ہے۔عام آدمی کر بھی کیا سکتا ہے۔؟ بُرائی دیکھتا ہے روک نہیں سکتا..... ہاں مگر بُرائی کو بُرا ضرور گردانتا ہے۔کرپشن کے بڑے بڑے اژدھے پھن پھیلائے بیٹھے ہیں .....کیا سُناؤں.....کس کو سُناؤں۔

یہاں کھڑے کھڑے میری آنکھوں نے جو دیکھا 'دِل دہل گیا ہے' ایسے لگتا ہے کسی نے میرے دِل کو پکڑ کر مٹھی میں بھینچ دیا ہے.....اور خون کی بوندیں ٹپ ٹپ نیچے جسم کی دُنیا، جسم کی زمین کو سیراب کر رہی ہیں۔

اِن دو فیکٹریوں کے درمیان دو اکیڑ کی خالی زمین میں سسکتی زندگیاں.....اُف .....! سڑک کے اُس جانب بہت بڑا کالج .....اِس طرف دو فیکٹریاں اور درمیان میں یہ خالی زمین اور سسکتی زندگیاں۔۔۔ایک طرف اِنسان بہت اونچا ہے اور یہاں اِنسان کیا انسانیت ہی نہیں ہے۔جانور اور اِنسان ایک جیسے ہیں۔جھونپڑیوں میں بستے پکھی واس لوگ۔۔۔یہاں کوڑا کرکٹ کے بڑے بڑے ڈھیر پہاڑ بنے ہوئے ہیں۔تھوڑا آگے مشرق کی طرف صابن فیکٹری کا زہریلا پانی جوہڑ کی صورت کھڑا ہے۔یہاں مچھر پرورش پا کر اپنی نسل کو بڑھا رہے ہیں۔میں حیرت زدہ ہوں کہ ان مچھی واسیوں کو ملیریا کیوں نہیں ہوتا۔۔؟ اِن کو ڈینگی کیوں نہیں لپیٹ میں لیتا۔۔؟ اِن کی عورتیں پہاڑ بنے کوڑے کے ڈھیر سے کچھ تلاش کر رہی ہیں۔مختلف آلودہ شاپر اُلٹ پلٹ رہی ہیں۔جس کی بدبو نے فضا کو بھی آلودہ کر رکھا ہے اور جو یہاں سے گزرتا ہے ناک پہ رومال رکھنا نہیں بھولتا اور پرندے بھی یہاں سے نہیں گزرتے۔لیکن یہ لوگ۔۔۔ان کی عورتیں ۔۔۔۔اُف۔یہ عورتیں کیوں اس بدبودار میں رہتی ہیں اور یہاں کیا تلاش کر رہی ہیں۔کیا اِن کی سونگھنے کی حس بے کار ہو چکی ہے۔؟ تعفن زدہ بدبو کے بھبکے کیوں اِن کی نتھوں میں داخل نہیں ہوتے۔۔؟ آخر کیا مجبوری ہے۔

اِن کے بچے ننگے دھڑنگے آلودہ زہریلے پانی میں کھیل رہے ہیں۔ان کے مریل کالے بچے جن کے جسم پر گوشت نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔اس پانی میں کھیل کر بیماریوں کی لپیٹ میں نہیں آتے۔۔۔ایسے بہت سے سوال میرے ذہن میں اُدھم مچائے ہوئے ہیں۔

میری نظر ایک جھونپڑی کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔جھونپڑی کے داخلی راستے کے سامنے مریل سا کالا کتا پڑا اونگھ رہا ہے۔اُسے کوئی خبر نہیں کیا ہو رہا ہے، کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے۔وہ مست پڑا اپنی نیند پوری کر رہا ہے۔جانے اس کالے کتے کو یہاں کیا حاصل ہوتا ہے۔؟ آج کا اِنسان روزی روٹی کیلئے مارا مارا پھرتا ہے اور یہ کتا بے فکر سو رہا ہے۔آخر اسے یہاں کیا حاصل ہوتا ہوگا۔کسی محل

Digitized by Google

کی چوکھٹ پہ پڑا ہوتا تو شاید یہ یوں لاغر، مریل سا بھی نہ ہوتا۔ عیش کی زندگی جیتا ۔۔۔ روز گوشت کے مزے اُڑاتا۔۔۔ یہاں پڑے اِسے کیا ملتا ہوگا۔۔۔ لیکن ہاں یاد آیا کتا تو وفادار جانور ہے۔ شاید وفا نبھا رہا ہے۔۔ ہاں وفادار ہے۔۔۔ میں حیران ہوں کتا اپنے عمل سے جنت میں پہنچ گیا اور اِنسان۔۔۔۔؟

کتا اپنے مالک کو نہیں چھوڑتا۔۔۔ اُسے نہیں بھلاتا..... یہ احسان فراموش نہیں ہے ۔۔۔۔ آہ۔۔۔ مگر انسان۔۔۔؟ کیوں غفلت کی زندگی جی رہا ہے۔؟ اپنے مالک کی آواز پر لبیک نہیں کہتا۔۔۔ یہ اِنسان کیوں بھٹک رہا ہے۔۔؟

اِن جھونپڑیوں میں چھوٹی بڑی، بوڑھی جوان زندگیاں جی رہی ہیں۔ اِن کی شباب چڑھتی لڑکیاں بہت سُندر ہیں، جیسے کوئلے سے ہیرا نکلتا ہے اسی طرح جھونپڑیوں میں خوبصورت، حسین، سُندر لڑکیاں پلتی ہیں۔

میں ابھی اُسی جگہ کھڑا ہوں۔ میں جھونپڑیوں میں بستی زندگیوں کا جائزہ لے رہا ہوں۔ تڑپتی، سسکتی، بے بس۔۔۔۔ اور شاید بے حس یہ زندگیاں غربت کے آخری درجے پر اپنے مہ و سال، اپنے شب روز بسر کر رہی ہیں۔۔۔

دوسری طرف امیر کبیر ملوں کے مالکان مرسیڈیز میں یہاں سے ضرور گزرتے ہوں گے۔ اُن کی نظریں اس طرف اُٹھتی تو ہوں گی ۔۔۔ پھر یہ بے حسی نہیں ہے۔ کہ یہ مذندگیاں بُنیادی ضروریات سے محروم ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد دو گز کا کفن ہی نصیب ہوتا ہے اور کسی کو یہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ دو گز کا کپڑا امیر کو بھی ملتا اور غریب کو بھی..... لیکن نہیں۔ یہاں بھی لوگوں نے فرق ڈال دیا ہے۔

امیروں کو اُن کی چھوڑی ہوئی جائیداد، بینک بیلنس سے عمدہ کفن ملتا ہے اور ان پاپی واسیوں کو مانگا تانگا بھیک ملا دو گز کا ٹکڑا ملتا ہے۔ آخر مرنا تو سب نے ہی ہے۔۔۔

ابھی میں کھڑا یہی سوچ ہی رہا تھا کہ وزیر کی گاڑی پروٹوکول سے یہاں سے گزرتی ہے ۔۔۔ آہ ۔۔۔ وہ کالا کتا۔۔۔۔ نیند سے جاگ کر روڈ کراس کرتے ہوئے اس گاڑی کی زد میں آکر خونم خون ہو گیا ہے اور پولیس کے نوجوان اس کے مالک کو ڈھونڈ رہے ہیں۔۔۔

یہ کتا کس کا ہے؟ ہر طرف شور مچا ہے اور پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ یہ کسی دُشمن کی چالبازی تو نہیں ۔۔۔ وزیر کو نقصان پہنچانے کے لیے کالا کتا کیوں چھوڑا گیا۔۔؟ ایک پولیس والا کہہ رہا ہے پولیس حرکت میں آچکی ہے اور غریب، بے بس پاپی داس سُرخ آنکھوں اور غمگین دِل کے ساتھ آنسوؤں کی برسات میں نہا رہا ہے۔ آج اُس کا رفیق، اس کا دوست ''کالا کتا'' امیر وزیر کی گاڑی کے نیچے آکر زندگی کی بازی ہار گیا ہے ۔۔ پاپی داس بولتا ہے تو مرتا ہے اور نہیں بولتا تو اندر کی آگ بجھ نہیں سکتی۔ وہ کس کا سوگ منائے۔ کالے کتے کا یا اپنی زیست کا۔۔۔ بولتا ہے تو جیل میں جاتا ہے اور اندھے مقدمہ میں جیل کی صعوبتیں کاٹ کاٹ کر مر جائے گا۔ بڑی مشکل میں ہے۔ وہ کھل کر اپنے دوست کا سوگ بھی نہیں منا سکتا۔ کیسا کڑا وقت آن پہنچا ہے۔۔

ایک راہ گیر جس کی عمر پچاس سے اوپر لگتی ہے بڑبڑاتا ہوا گزر گیا ہے۔ نفرت بھرے لہجے میں کہتا ہوا جاتا ہے۔ اونہو۔۔۔ ان امیر زادوں کو موت کا خوف کیوں ستائے ہوئے ہے جو اپنے ارگرد حفاظت کرنے والوں کی فوج لیے پھرتے ہیں

Digitized by Google

۔جو اتنے پروٹوکول سے گزرتے ہیں ۔بندوقیں تانے سیکورٹی والے ان کی حفاظت کر رہے ہیں کہیں کوئی دُشمن ان کو ہلاک نہ دے ۔۔۔۔وہ رے زندگی ۔۔۔۔تیرے کھیل نرالے ۔۔۔

ایک طرف قطار در قطار گاڑیاں ''وزیر'' کو موت سے بچائے ہوئے ہیں لیکن نہیں موت تو کسی سے نہیں ڈرتی وہ تو سونے کے پنجرے میں بھی آجاتی ہے ۔وہ زمین کی تہہ در تہہ چھپے ہوئے کو موت کا ذائقہ چکھاتی ہے ۔موت برحق ہے ۔۔موت نے کسی کو نہیں چھوڑا ۔۔پھر یہ کیوں موت سے گھبراتے ہیں ۔۔۔یہ مرنا کیوں نہیں چاہتے ۔۔۔حقیقت سے کیوں منہ پھیرے ہوئے ہیں ۔جس موت سے ''وزیر'' ڈرتا ہے اُس نے ایک دن اُسے آلینا ہے ۔۔موت نے بھلا کسی کو چھوڑا ہے جو وزیر کو چھوڑے گی ۔۔۔

غریب دلیر ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بہادری سے سینہ تانے اُس کے سامنے کھڑا ہے ۔۔ہاں مگر اُسے پیٹ کے لالے پڑے ہوئے ہیں ۔بھوک کی موت اُسے مار ڈالے گی ۔اُسے ڈر ہے کہیں آج روٹی کے لیے مزدوری نہ ملی تو اُس کے بچے ایک دن اور فاقے پر رہیں گے ۔۔۔وہ بچوں کو بھوکا سوتا نہیں دیکھ سکتا' ہائے مجبوری ..... مجبوریاں ..... اِنسان کو کمینہ بنا دیتیں ہیں ۔

وزیر کالج کے اندر چلا گیا ہے اور کالج کی کنٹین کا عملہ کچرے (باقیات) کے ڈرم ان جھونپڑیوں کے سامنے بنے پہاڑ پہ پھینکنے آرہے ہیں ۔پکھی واسیوں کی عورتیں ، بچے اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں ۔بچی کھچی روٹی کے ٹکڑے اِن کے بچوں کے پیٹ پال سکتے ہیں ۔کسی ڈبے میں دودھ کی بچی دو بوندیں ان کی پیاس بجھا سکتی ہیں ۔اتنا کچھ پا کر ان کے چہرے روشن ہو گئے ہیں ۔شاید آنے والی رات اچھی گزر جائے گی ۔

کالج کے لاؤڈ اسپیکر سے گرجتی آوزیں نکل رہی ہیں اور وزیر کی آواز گونج رہی ہے ۔طالب علم ، اساتذہ خطاب سُن رہے ہیں میڈیا والے فوٹو اُتار رہے ہیں ۔وزیر چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے ''غربت کا خاتمہ کر دیں گے ، گاؤں گاؤں ، شہر شہر کا ہر بچہ تعلیم حاصل کر سکے گا ۔اِس ملک میں کوئی بھوکا نہیں رہے گا ..... اور میری آنکھیں نم ہیں' سڑک کے اُس پار غریبوں کا ہجوم کچرے کے ڈھیر سے سوکھی خشکی روٹیوں کے ٹکڑوں کے لیے لڑ رہے ہیں جیسے کتے لڑتے ہیں ۔۔دیوانگی سے سامان سے بھرے آلودہ شاپر ، اُلٹ پلٹ رہے ہیں ۔

میں نم آنکھوں اور مغموم دِل کے ساتھ گاڑی کے انتظار میں کھڑا ہوں اور وزیر کی آواز کی گونج میری سماعتوں سے ٹکرا رہی ہے ۔کاش ! یہ وزیر یہاں ان پکھی واسیوں کو آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ۔ان کی گاڑیاں لمحہ بھر کے لیے ان بھوک وافلاس میں بلکتے بچوں کے پیٹ بھرنے کے لیے رُکتی ۔۔۔وزیر کی جوشیلی آواز ابھی بھی میری سماعتوں میں پڑ رہی تھی لیکن اِسی لمحے جس گاڑی کے انتظار میں کھڑا ہوں ، آرُکتی ہے اور میں نم آنکھوں ، مغموم دِل کے ساتھ منزل کے خواب من میں سجائے اُس میں سوار ہو جاتا ہوں ۔میرے بچے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے ۔گاڑی منزل کی طرف رواں دواں ہے لیکن میرا لاشہ ، میرا وجود ، میرا دِل ان پکھی واسیوں کے پاس رہ گیا ہے ۔۔۔۔جانے کیسے جیتے ہوں گے ۔۔کیسے شب و روز گزرتے ہوں گے ۔؟

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

غزلیں

غزل

اب کوئی بہن ہے نہ بھائی ہے
میں ہوں بس اور میری تنہائی ہے

وہ تو کہتی تھیں سدا ساتھ نبھاؤں گی تیرا
کیسے کہہ دوں کہ میری بہن بڑی ہرجائی ہے

کوئی دنیا میں نہیں آتا ہے رہنے کے لیے
اُن کی یادوں نے مہک چار سو پھیلائی ہے

ان کی لہجے کی کھنک اور وہ محبت کی ہنسی
ہر طرف پھیل گئی اور ہر طرف چھائی ہے

تُو تو یادوں میں میری رہتی ہے خوشبو کی طرح
تجھ کو نہ بھولنے کی میں نے قسم کھائی ہے

وہ فرشتہ نہ تھی پر تھی وہ فرشتوں جیسی
میری بہنا نے تو جنت میں جگہ پائی ہے

زندگی کیا ہے، لمحوں کی یہ کہانی ہے
جانے والی نے مجھے بات یہ سمجھائی ہے

وہ تو خوشبو تھی فضاؤں میں بکھری ہے غزل
اس کی یادوں نے میری زندگی مہکائی ہے

شاعرہ: سلمٰی غزل کراچی

غزل

بچپن کی تصویر کو پاکر روئی ہوں
میں ایسی تقدیر کو پاکر روئی ہوں

کتنا ظلم کیا ہے مجھ پر حاکم نے
عدل کی زنجیر ہلا کر روئی ہوں

صحراؤں میں سسی بن کر آئی تھی
پنوں کے کچھ خواب سجا کر روئی ہوں

تیرے پیار کا صدمہ کتنا گہرا تھا
ہر اک کو میں حال سنا کر روئی ہوں

کاغذ سے کچھ نقش بنائے ہاتھوں پر
میں ایسی جاگیر کو پاکر روئی ہوں

شاعرہ: فریدہ فری۔ لاہور

غزل

دوسروں پہ کیا کھلوں خود سے بھی پوشیدہ ہوں میں
قیمتی پتھر ہوں لیکن نا تراشیدہ ہوں میں

میں خود اپنا سائباں ہوں یہ مجھے معلوم ہے
اور یہ بھی جانتی ہوں کہ بوسیدہ ہوں میں

میرے اندر ہی بسی ہے میری ساری کائنات
میں بدن میں قید ہوں لیکن جہاندیدہ ہوں میں

لوگ مجھ کو جانتے ہیں سیدھی سادی دوستو
یہ مگر میں جانتی ہوں کتنی پیچیدہ ہوں میں

عین ممکن ہے کہ رفعت ہو نہ کچھ بھی منکشف
لیکن اپنی جستجو میں کتنی سنجیدہ ہوں میں

شاعرہ: رفعت وحید راولپنڈی

☆☆.....☆☆

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT

Digitized by Google

میانہ روی

زندگی کے ہر معاملے میں توازن رکھنے والے ہی زندگی بسر کرتے ہیں ورنہ زندگی تو ایسے ویسے بھی گزر ہی جاتی ہے..... ایسے خاندانوں کا قصہ جو انتہا پسندی سے برباد ہوئے اور اعتدال پسندی کی وجہ سے آباد بھی.....

مومینہ بتول

''بی بی..... زینتے..... خوش بختے.....! خان لالہ نے آپ کو سرکار اعلیٰ میں بلایا ہے تاکہ ظہرانہ شروع کیا جاسکے۔'' گل زاری نے پیغام رسانی کا فریضہ انجام دیا۔ خوش بختے اپنی سوچوں سے یکدم باہر آگئی۔

انگریز اتالیق اس کو پڑھا کر گئے بیس منٹ ہو رہے تھے سرکار اعلیٰ..... خان لالہ رزق کے احترام میں کھانے کی محفل کو سرکار اعلیٰ کا نام دیتے تھے۔

کیونکہ رزق ہمیشہ اعلیٰ سرکار رب العالمین کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ دونوں بہنیں اچھی طرح سر ڈھانپ کر اٹھ کھڑی ہوئیں انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ خان لالہ پیروی رسول میں اپنی بیٹیوں کی شمولیت کے بغیر کھانا شروع نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ کی طرح خان لالہ نے اٹھ کر اُن دونوں کا استقبال کیا۔ پھر خوش بختے کی طرف سالن بڑھایا۔ تاکہ کھانا شروع کیا جاسکے۔

گھر کی سب عورتیں شریک طعام تھیں۔ دادی..... ماں..... دونوں پھوپیاں' تینوں بھابیاں اور بچے..... خان لالہ نے تشکرانہ انداز میں سکون کی سانس لی جبکہ اُسی کھانے میں شریک خوش بختے کے حلق میں نوالے پھنس رہے تھے۔ صبح ہی سے اس کی یہ کیفیت تھی جو وقتاً فوقتاً اُس پر اثر انداز ہوتی تھی اس صورت میں وہ یکدم ہی سب سے بیزار ہو جاتی تھی۔

حالانکہ اُسے اور حویلی کی تمام عورتوں بچوں کو ہر آسائش میسر تھی۔ معمولی چیزوں سے لے کر' جدید ٹیکنالوجی سمیت ہر شے حاصل تھی۔ مگر ہاں ایک شخصیت اک عزت نفس جیسی خالصتاً چیز پابند سلاسل جو تھی۔

یہ شمالی وزیرستان کی پاکستانی حدود میں واقع..... حویلی کی منظر کشی ہے۔ جہاں جلال خان المعروف خان لالہ کی جدی پشتی حویلی میں خاندانی روایات روزِ اول کی طرح جیتی جاگتی ہیں۔ وہ روایات..... جس سے فرار ناممکن ہے وہ روایات کی پاسداری فرض عین کی طرح اس خاندان کی ہر عورت پر لازم ہے۔ واجب ہے' اور اس روایتی عمل برادری کے لیے جیتے جاگتے کتنے وجود خاک ہو گئے تھے۔

Digitized by

اچھا کھانا پینا..... پہننا اوڑھنا سیر وتفریح کے تمام مواقع' خاندانی قیود کے ساتھ حاصل تھے..... بچپن سے بہترین تعلیم وتربیت دینی علمی تعلیم کے لیے آئے بہترین اساتذہ جو بھاری بھرکم معاوضے پر انہیں علم کی میراث عطا کرتے تھے۔

ٹی وی کمپیوٹر' موبائل نیٹ جیسی سہولیات بھی میسر تھیں مگر اُس کی نگرانی کا ہمہ وقت عملہ بھی موجود تھا جو..... اُن کی ہر ہر چیٹ پر نظر رکھتا تھا۔ خوب لمبی چوڑی حویلی..... جدید اور قدیم طرز کی بنیاد پر بنی جس کے وسیع وعریض میدان نما صحن میں خوبصورت باغیچے' آبشاریں' سبزہ' موسمی غیر موسمی پھل کے پھل دار گھنیرے درخت..... اُسی میدان کے ایک طرف بچوں کے لیے..... پرندہ گھر' سوئمنگ پول' ٹیبل ٹینس کورٹ' کرکٹ کی باؤنڈری وال کیا نہیں تھا خان لالہ کے..... اپنے بچوں کو ہر سہولت گھر میں ہی دی ہوئی تھی۔

خوبصورت فانوس' اٹالین فرنیچر' بیش قیمت پینٹنگز غرض دنیا کی جدید سے جدید اشیا کو ان لوگوں کے لیے منگوایا گیا تھا تو ''پھر کیا تھا''

جو..... کچھ..... نہ کچھ غلط ہونے کا احساس دلاتا تھا خوش بختی کو وہ ہمیشہ سے حساس واقع ہوئی تھی اُس کی زیرک نگاہوں سے بظاہر سب اچھا ہونے کے باوجود کچھ اچھا نہیں جیسا باریک سوال پوشیدہ نہیں تھا۔

وہ غور سے اپنی پھوپیوں کے سرخ انار جیسے بھرے بھرے چہرے کی طرف دیکھتی تو اُن دیکھی شکستہ لکیروں کے جال دکھائی دیتے۔ بظاہر مطمئن و مسرور زندگی گزارتی' وہ بچپن سے سنتی آئی تھی کہ جوان ہونے کے بعد ان عورتوں کے رشتے خاندان میں موجود نہ ہونے کی بنا پر وہ کنواری بوڑھی ہو رہی

تھیں۔ان کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی۔

یہ خان لالہ کا ہی ظرف تھا کہ جائیداد اور بیٹی باہر بیاہ کر..... اپنا سر نہیں جھکانا چاہتے تھے سو انہیں ہر سہولت میسر تھی۔ اُن کا حق نہیں بخشوایا تھا زبردستی بڑی پھوپی نے از خود اپنا تمام حق بھائی کے حق میں دینے کے بعد دنیا سے کنارہ کر کے ایک راہبہ کی سی زندگی اختیار کر لی تھی۔

خود کو حجرہ نما کمرے میں خدا کے حضور چھوڑ رکھنے کے لیے باقی زندگی کے تمام پہلوؤں سے منہ موڑ لیا تھا مگر دوسری دو پھوپیاں حویلی کی قیود میں آزاد تھیں۔ اچھا کھاتیں اچھا پہنتیں ہر آسائش موجود تھی پھر پھر کیا تھا..... کہ ان کے وجود میں گھلی اُداسی' خوش بختے کو اداس کر دیتی تھی..... اُسے اپنی اُن پھوپیوں کی زندگی کھوکھلی لگتی۔

ایک جیسے دن ایک جیسی بے ضرر راتیں' سہاگ' شادی بچے ارمان خواہشیں چاہنا چاہے جانے والے..... جیسے جذبہ کیا ان کے دل میں نہ ہوں گے مگر حویلی اور خان لالہ کی خود ساختہ عزت پر وہ اپنے ارمان اپنی امنگوں کو..... کچل کر جی رہی تھیں۔ قید میں بلبل کی طرح بس یہ قید حدود اربعہ کے لحاظ..... بڑی ڈھیلی حویلی کے اندر ہی تک کی تھی۔ خوش بختے تتلی کی طرح پھول پھول تک رسائی چاہتی تھی۔ ذہنی آسودگی.....

''اِس خاندان کی کسی عورت کو آرزو رکھنے امنگ پالنے کی اجازت نہ تھی۔'' رنگ خوشبو سے محبت تو کر سکتی تھیں مگر انہیں پانے کی جسارت نہیں گویا وہ انسان نہیں جس کے سینے میں دل اور دل میں ارمان ..... نہیں..... خان لالہ کہتے تھے۔

''عورت کو اسلام نے بڑا رتبہ دیا ہے۔ لہٰذا اُن کی عزت اُن کی تکریم لازم ہے۔ ان پر رحم کرنا اور پیار سے پیش آنا چاہیے۔ اُن کی حفاظت ضروری ہے وہ خاندان کی عزت کا وہ فیگ ہیں جو ذرا بھی داغدار ہوا تو..... کالر میں نہیں سجایا جا سکتا لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی خوش بختے کو بہت سے ادارک ہو چلے تھے گویا وہ بھی..... جوانی..... منہ زور خواہشوں کو کچلنے کے لیے تیار ہو جائے۔

چاہنا اور چاہے جانے والے جذبے جو اب اُس کے دل میں پنپنے لگے تھے سے منہ موڑ لے ہر خواہش کو ارمان اور ہر ارمان کو..... دل میں ہی گھوٹ لے..... کیونکہ اُسے نظر آ رہا تھا تینوں بن بیاہی پھوپیاں..... جو خاندان میں جوڑ نہ ملنے کے باعث..... ہر ارمان ہر خواہش..... ہر جذبے پر بڑے بڑے قفل لگا کر جی رہی تھیں باقی دو پھوپیوں کے اولاد نرینہ کافی بڑی عمروں کے اور بال بچے دار تھے۔ چھوٹے چاچا اور منجھلے چاچا کے بچے آپس میں رشتے میں بندھے ہوئے تھے سب سے چھوٹا ماموں بے اولاد تھے اور خالاؤں کو اللہ نے صرف بیٹوں سے نوازا تھا۔

بڑے ماموں کا ایک بیٹا تھا جو اللہ لوک تھا دوسرا اپنی کلاس فیلو سے شادی کر کے انگلینڈ جا چکا تھا اور اس حویلی کے لیے یہ بڑی بات نہ تھی۔ اولاد نرینہ کچھ کرتی پھرے وہ جائز ہے 'مرد تھے' خاندان کو آگے نسل دینے والے تھے حاکم تھے..... سو ہر پابندی سے آزاد تھے۔

زینتے..... اُس کی چھوٹی بہن بہت لاابالی تھی برستی بارش..... میں بھولتے جھولے' اچھا کھانا..... خوش رہنا..... حویلی کی عطا کردہ ہر سہولت کو خوشی خوشی اپنا کر مسرور رہنا..... مگر خوش بختے اس بہت اچھے کے اندر چھپے اندھیروں کو خود اپنے اور زینتے کے لیے دیکھ رہی تھی۔ مہیب اندھیرا گہرا جامد..... بلک ہول..... گویا اُن دونوں کو نگلنے کے لیے تیار تھا اور افسوس صد افسوس..... کا مقام تھا اُس کی ماں

Digitized by

دونوں پھوپیاں اپنی بچیوں کو سہاگ کی سرخ اوڑھنی میں ملفوف کر کے انہیں پیا دیس بھیجنے کی خواہش کے باوجود..... لب سی لینے پر مجبور تھیں خاندان میں حویلی میں اُن کا جوڑ کا کوئی رشتہ نہ تھا۔

اور باہر..... بیاہ دینا کا تصور..... اپنی پگ کو خود غیروں کے قدموں میں رکھ کر بے عزت ہونے کا شوق کس کو ہوتا ہے۔ سو بہت سے خدشات کنڈلی مارے اُس حویلی کے جہاندیدہ عورتوں کے ساتھ ساتھ خوش بختے کی دامن دل کو کاٹ رہے تھے۔ اُن کے زہر بھرے ڈنگ پہلو میں اترنے کے باوجود وہ عورتیں..... خاموش تھیں۔ جی رہی تھیں..... ایک دوسرے سے نظریں چرا کر خوش بختے..... اپنا زیادہ وقت مطالعہ میں گزارنے لگی تھی۔

اُس نے دین اسلام کی کئی تصدیق شدہ کتب کا باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ مگر کہیں بھی اُسے اپنے ذہن میں پلنے والے سوالات کا جواب نہیں ملا تھا کہ اسلام نے کہاں اور کس حد تک عورتوں کے حقوق پر پابندی لگائی ہے۔''

مگر..... کہیں بھی نہیں کسی بھی..... جگہ اُسے اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا تھا بلکہ اُس نے تو پڑھا تھا کہ تمام مذاہب میں ایک دین اسلام ہی تو ہے جس نے سب سے پہلے عورت کو عزت دی مقام دیا اُس کے حق جاری کیے اُسے مسند اعلیٰ پر فائز کیا بیٹی رحمت قرار دی تو بہن بھائیوں کا مان..... بیوی کو دین مکمل کرنے کی سند عطا کی تو ماں کو جنت سے تشبیہ دے کر..... اُس کے قدموں میں بیش بہا جنت ڈھیر کر دی۔ تو پھر.....

خان لالہ اُس کا خاندان حویلی کا نسل در نسل فلسفہ..... کیوں عورت کو پردے میں ملفوف کر کے اُن کو زندہ درگور کر رہا ہے۔''

(یہ دین اسلام تو نہیں)

ہاں..... ایسے مسخ شدہ اسلام کی خود ساختہ تشریح کہہ سکتے ہیں..... تو پھر..... یہ تو اور خطرناک صورت حال ہے..... شریعت خداوندی سے منہ موڑ کر..... خود ساختہ اصول کو..... فرض کر لینا گناہ کبیرہ ٹھہرا۔

یہ تو انتہا پسندی ہے..... جبکہ دین جگہ جگہ اعتدال پسندی کا حکم دیتا ہے..... میانہ روی اختیار کر ہر معاملے میں..... تو پھر..... یہ سب کیا ہے؟

اُس نے ازدواج رسول ﷺ نامی کتاب میں پڑھا کہ ''حضرت عائشہؓ اپنے حجرے میں عورتوں کے مسائل اُن کے حل پیش کیا کرتیں تھیں..... اور آپ ﷺ جب سفر پر جاتے تو باری باری اپنی ازواج کو ساتھ لے کر جاتے..... اُن سے حسن سلوک روا رکھتے..... ہنسی مذاق بھی فرماتے..... اُن کا خیال بھی..... اور حدود میں رہتے ہوئے ہر مسلمان عورت کو اُس کے اپنے تمام حق بھی..... دینے کا حکم بھی فرماتے آپ ﷺ کی پہلی زوجہ حضرت خدیجہؓ آپ کے نکاح میں آنے سے پہلے ہی تجارت جیسے خالص مردانہ..... کاروبار سے منسلک تھیں آپ ﷺ کی شریک حیات بننے کے بعد بھی آپ ﷺ نے اجازت دی کہ وہ اپنی تجارت جاری رکھ سکتی ہیں۔''

جب آپ ﷺ رحمتہ اللعالمین بنے..... اپنی زوجہ کو..... معاشرے کے ایک فعال رکن ہونے سے روکا تو پھر..... ہم پر اجداد کی پابندیاں چہ معنی دارد..... عورت کے لغوی معنی چھپا ہوا کے ہیں لہٰذا قرآن میں فرمایا۔

''اپنے سینے پر اوڑھنیاں ڈھلکا لو اور اپنی نگاہیں نیچی رکھو۔'' اس فرمان کو مان کر عورت باقی تمام شرعی کام کر سکتی ہے..... اُم عطیہ یہ بی بی آپ ﷺ کے ساتھ 6 لڑائیوں میں گئیں یہ وہاں زخمیوں کو علاج و مرہم پٹی کرتی تھیں۔ فاطمہ بنت خولہ.....

Digitized by Google

غزوہ میں صحابیوں کے ساتھ رہیں' زخمیوں کو سنبھالتیں اُن کی مرہم پٹی کرتیں۔

پھر..... یہ تو سراسر..... غلط ہے۔ دین اسلام جیسے آسان دین کو مشکل ترین بنا کر پیش کرنے والے..... خود ساختہ' اور اسلام جیسے اعتدال پسند مذہب کو انتہا پسند بنانے والے اُس کے اجداد سراسر اسلام کے نام پر دھبہ تھے خوش بخت کو..... اپنے خاندان سے پھر مرد سے بیزار ہونے لگی تھی۔

وہ گھنٹوں سوچتی احادیث پڑھتی سمجھتی پھر اپنا اور اپنے خاندان کا موازنہ کرتی تو ذہنی کلفت یکدم ہی بڑھ کر نفرت کا روپ دھار لیتی.....

''یہ اسلام نہیں.....''

ہمارا..... ہمارے بڑوں کا طرز عمل غلط ہے بہت غلط..... اس کے حویلی کے مردوں کی اعلیٰ تعلیم نے بھی انہیں باشعور مسلمان نہیں بنایا تھا۔

اللہ رب العزت نے تو ہر معاملے میں اعتدال کو پسند فرمایا ہے۔

''ہر ہر معاملے میں میانہ روی اختیار کرو۔ اعتدال کرو انتہا پسندی تو انسان کو مشکلات میں کھڑا کر دیتی ہے۔'' سوچ سوچ کر وہ ڈپریشن کا شکار ہو رہی تھی۔ برائے نام کھانا اور زندگی کی باقی مصروفیات سے الگ تھلگ رہ کر وہ ہر شے سے گویا خود سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ ہمت باندھ کر اپنے خان لالہ سے اُن روایتی..... زنجیریں کو توڑ دینا چاہتی تھی اور کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی اس کے اندر گرہیں پیدا کر رہی تھیں۔ ہر سوچ..... عمل پذیر نہ ہونے پر ایک گانٹھ کی صورت اُس کے دل و دماغ کو باندھ رہی تھی۔ پہلے حویلی کی عورتوں نے..... پھر خان لالہ نے اُس کی دگرگوں حالت کو محسوس کیا تو شہر بھر کے مایہ ناز ڈاکٹروں کی فوج کو بلوا لیا گیا..... اب اس کے مختلف ٹیسٹ دوائیں شروع کی گئیں..... مگر وہ..... لب کوسی کر اپنے وجود کو قتل کر رہی تھی۔ لاتعداد بیمار سوچوں نے اُس کے اندر کی بہادر لڑکی کو بھی مار دیا تھا۔

حوصلہ کر کر کے وہ یکدم ہی ہار جاتی..... کچھ کہنے کچھ پوچھنے..... اپنی حویلی کی مظلوم عورتوں کا..... جواب حق طلب کرنے کی جسارت کرنے کی..... ناکام کوشش نے اُسے ذہنی بیماری میں مبتلا کر رکھا تھا اُسے اذیت پسند بنا دیا تھا کہ وہ خود کو سوچوں کے کہرے میں کھڑا کر کے خود کو اذیت دے کر گویا حویلی کے فرسودہ رسم و رواج سے انتقام لے رہی تھی ہر خوشی ہر غم ہر احساس سے بیگانہ..... شعور کے بہترین ادارک حاصل کر کے کچھ نہ کر سکنے کا غم' اُسے حواسوں کی دنیا سے دور..... بہت دور لے گیا تھا علم..... اُس کی آزمائش بن گیا تھا۔ آگہی نے اُسے تمام پہلوؤں سے آگاہ کر کے بے بسی سے جکڑ دیا تھا۔ وہ شعور سے آگاہ ہو کر بے شعور ہو گئی تھی عقل پر خرد غالب آ گیا تھا۔

وہ بقول ڈاکٹر ذہنی مریض بن چکی تھی۔ کون سمجھتا وہ حق پر ہے مگر بے بس..... پ کٹے پنچھی جیسی کولہو کے بیل کی طرح زندگی کے خود ساختہ اصولوں پر گول گول گھومتی' مگر اُس کی آنکھیں اور شعور تو جاگ رہا تھا کبھی تو اسے اپنے معاشرتی بے قاعدگیوں کا احساس ہوا تھا مگر وہ کوئی حل تلاش نہ کر پائی تھی۔

سو..... اُس کے اعصاب نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ پہلے نفسیاتی کہلائی پھر پاگل..... مگر..... مگر اس دیوانے پن میں بھی اُس کا ذہن جاگ رہا تھا..... مگر ہونٹوں پر خاموشی کا جامد قفل روح پر پڑا بوجھ قید تنہائی کا شکار ہونے کا اذیت ناک آنے والا کل اُسے واقعی عقل کی دنیا سے دور لے گیا تھا وہ اپنے پرائے اچھے برے کی تمیز پار کر گئی تھی ہر چہرہ..... سیاہ اندھیرہ..... ہیبت ناک سناٹا' ہر امنگ ہر خواہش ہر

Digitized by

تمنا پور پور قتل ہو کر اُس کے وجود کو کاٹ رہی تھی۔

خان لالہ کے حکم پر ..... حویلی کے بہترین پر آسائش کمرے کو..... اُس کا کمرہ قرار دیا گیا تھا بہترین ڈاکٹرز کی زیر نگرانی..... وہ کمرہ اُس کے لیے عقوبت خانہ بنا دیا گیا تھا..... وہ خونخوار ہو گئی تھی تبھی تو اس کے پیروں میں نہ دکھائی دینے والی زنجیر باندھ دی گئی تھی۔ گویا وہ زندہ دفنا دی گئی تھی پابند سلاسل کر دی تھی۔ پوری حویلی اپ سیٹ ہو گئی ایک جیتی جاگتی باشعور لڑکی رنگ خوشبو کی باتیں کرتی تتلیوں کو پکڑتی سپنے بنتی خوشیوں کو پانے کے لیے آسمان کی بلندی کو چھو لینے کی خواہش سمندر سے گہری محبت..... چاند تاروں سے باتیں کرتی وہ زندہ جیتی جاگتی لڑکی فرسودہ رسموں کے ہاتھوں..... سخت گیر ہاتھوں میں مردہ تتلی کی طرح رنگ چھوڑ کر مرجانے والی خان لالہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اور آ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ایسے ہی لوگوں کے لیے فرمایا ہے خدا نے کہ.....

''بے شک انسان بڑے خسارے میں ہے۔''

اور انتہا پسندی کے پاسدار خان لالہ کا خاندان خسارے میں مبتلا ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ حالانکہ صبح ہو چکی تھی مگر ایک کھڑکی اور ایک دروازے والے چھوٹے سے کمرے میں موٹے بھاری پردے پڑے تھے۔

وہ جانے کب سے سو رہی تھی..... نیند تھی کہ مدہوشی..... ڈرنک کی زیادتی سے..... اُسے ہوش میں آتے آتے 24 گھنٹے لگ گئے فین کی گھر گھر سے وہ حواسوں میں لوٹ رہی تھی حلق اندر تک کڑوا اور خشک تھا اسی وجہ سے اُسے کھانسی کے پھندے لگ رہے تھے اور انہی پھندوں سے اُس کا مدہوش پن ٹوٹا تھا۔ پیاس شدت سے لگ رہی تھی۔

اور پیاس کی شدت ہی اُسے ہوش میں لائی تھی۔ زبان اکڑ رہی تھی اور پورا بدن اینٹھ رہا تھا..... حلق میں گویا کانٹے اُگ آئے تھے۔

کھانستے ہوئے ہی اُس نے بستر پر ہاتھ مار کر اپنا موبائل اٹھایا اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اُس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں..... جیسے اُس نے آستین سے صاف کیں اُسے یاد آنے لگا کہ کل رات یا شاید پرسوں رات تک وہ ایک نائٹ کلب میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ تھی۔

ساری رات ڈرنک ڈانس ہلہ گلہ کرنے کے بعد وہ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لوٹی تھی۔ بستر پر گرنے کے بعد اُسے کچھ ہوش نہیں تھا کب ولسن اُس کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہوا اُسے کچھ خبر نہ تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے اپنے آپ کو گھسیٹا واش بیسن پر منہ دھونے لگی ٹھنڈے پانی کی نرم سی پھوار اُسے مزید ہوش میں لے آئی تھی پھر اپنے لیے تلخ ترین سیاہ کافی کا مگ تھام کر اُس نے موبائل اٹھایا اور میسجز چیک کیے پہلا میسج اُس کے باس کا تھا..... دوسرا روزی اُس کی چھوٹی بہن کا..... ماما کا بھی میسج تھا جانے کیسے انہوں نے اُسے یاد کیا تھا اور کل اسے انوائٹ کیا تھا۔

ڈیوڈ نے بھی پورے سال ڈیڑھ سال بعد یاد کیا تھا جانے کہاں تھا آج کل وہ..... اور پھر ایک میسج ڈوڈی کا بھی تھا اُس کی دوسری بہن..... اُسے ایک مرتبہ پھر مدد کے لیے طلب کر رہی تھی کیونکہ اُس کا بوائے فرینڈ چھوڑ چکا تھا اُسے..... اور وہ دوسری مرتبہ ماں بننے جا رہی تھی..... ولسن نے بھی میسج چھوڑا تھا اس عہد کے ساتھ کہ زندگی کے سفر میں اگر کبھی پھر ملاقات ہوئی تو..... وہ اُس بھرپور لطف انگیز ملاقات کی تجدید ضرور کرے گا..... نشاط انگیز

Digitized by Google

ملاقات کے شکریہ ولسن بیسٹ آف لک ڈیئر اس میسج کے ریڈ کرتے ہی اُس کے وجود میں طوفان سا اٹھا ایک نفرت کا..... طوفان..... آئی ہیٹ یو ولسن آئی ہیٹ یو مائی فٹ طیش میں آ کر اُس نے مکا دیوار پر دے مارا مگر ذہنی تکلیف کے باعث اُسے جسمانی چوٹ محسوس ہی نہ ہوئی تھی۔ یکدم ہی گویا وہ کئی دنوں کی بے ہوشی سے حواسوں میں لوٹ آئی۔ اُس کا ضمیر اُس کا ماضی..... کوڑے کی طرح اُس کے وجود پر برسنے لگا تھا۔

ہمیشہ کی طرح..... وہ ہٹنے لگی تھی اپنے ایمرٹمنٹ کو تہس نہس کر کے..... آئی ہیٹ یو..... کی گردان کرتی زمین پر گر گئی اب اُس کا ساکت وجود خاموش تھا اُس کی مالکان منزا یوا ایک نرم دل عورت تھی پھر یہ تیسری مرتبہ ہوا تھا اُس کے سامنے وہ شدید نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوئی تھی۔

لہٰذا ایوا نے ریسکیو کو فون کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی ریسکیو کی گاڑی ڈاکٹر سمیت موجود تھی۔

اور وہ اسپتال منتقل ہو چکی تھی۔ بروقت طبی امداد بہترین ڈاکٹرز کی زیر نگرانی..... اچھی دواؤں اور سب سے بڑھ کر اسپتال اور ڈاکٹروں سے ملنے والی ہمدردی..... توجہ..... لگاوٹ سے..... وہ بہتر ہو چلی تھی اُس وقت بھی وہ رات کی دوا لینے کے بعد سسٹر کی ہدایت پر عمل کرتی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی دواؤں کی وجہ سے اُس کا ذہن کچھ سن سا ہو رہا تھا اور وہ دھیرے دھیرے نیند کی وادی میں اتر رہی تھی مگر نہیں ایسا نہیں تھا سونے جاگنے جیسی کیفیت میں پھر وہ ایک مرتبہ ماضی میں پہنچ چکی تھی۔ اُس کی بند آنکھوں میں ایک پانچ چھ سالہ بچی گھوم رہی تھی۔

شاید وہ بھی کسی رات کا ہی پہر تھا جب بچپن کی میٹھی نیند میں وہ کچھ شور سا سن کر بیدار ہوئی تھی۔ اچانک کچھ نہ سمجھ آنے والی بات پھر اسے احساس ہوا کہ اُس کے ماں باپ میں ہمیشہ کی طرح کسی بات پر بحث ہو رہی ہے۔ پھر تکرار بڑھی وہ سہم سی گئی۔

''امی.....'' تیز تیز آواز میں ابو کو کچھ کہہ رہی تھیں۔ پھر یہ لڑائی شدید ہو گئی شاید اُس نے سہم کر تکیے میں منہ چھپا لیا۔

اس کے بابا واپس امریکہ جانے والے تھے اور امی ہمیشہ کی طرح بضد کہ وہ اپنی فیملی کو بلائیں..... پاپا مجبور تھے۔ بقول ان کے ابھی بچے چھوٹے ہیں پھر وہاں کا ماحول..... جلد کیچ کریں گے پھر یہاں ان کی والدہ ہیں وہ اکیلی ہیں کیونکہ پاپا دادی کی اکلوتی اولاد تھے جنہیں دادی نے بیوگی میں پالا تھا نو عمر بیٹیاں اور شیر خوار بیٹا پھر وہاں اُن کی کوئی ایسی جاب بھی نہیں تھی کہ وہ فیملی افورڈ کر سکیں۔

بس خدا کا کرم تھا کہ جانے کیسے وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ گئے تھے اور کافی عرصہ بعد سٹیزن شپ حاصل کر چکے تھے فیملی لے جا سکتے تھے مگر افورڈ نہیں کر سکتے تھے اور یہی بات اُس کی ماں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس بار پھر واپسی سے پہلے دونوں میں زبردست جھگڑا ہو رہا تھا۔ جو کئی روز سے ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آخر دادی نے ہی اس کا حل نکالا..... اور بہت مشکل سے پاپا کو فیملی ساتھ لے جانے پر راضی کیا تھا۔ 6 سالہ شبانہ اُس وقت بھی دادی کے قریب ہی تھی اور کسی بزرگ کی طرح اُن کی گفتگو سن رہی تھی۔ اُس کا ادارک بہت گہرا تھا وہ کم گو مگر بہت حساس بچی تھی۔

اُس کے ذہانت بھی اپنی عمر کی بچیوں سے کئی گناہ زیادہ تھی۔ سو وہ نہ صرف معاملہ سمجھ رہی تھی۔ بلکہ اُس کے اچھا یا برا ہونے کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی۔ وعدے کے مطابق فی الحال تو پاپا اکیلے ہی گئے تھے مگر دو سال کے اندر اندر فیملی کو بلوا لیا تھا۔

Digitized by Google

دادی نے جانے سے صاف منع کیا تھا۔ سو وہ اپنی بڑی بہن کے گھر شفٹ ہوگئیں۔ امی نو سالہ شبانہ چھ سالہ داؤد اور ڈیڑھ سالہ روزینہ کو لے کر عازم امریکہ ہوگئیں۔ جہاں پہنچنے کے دوسرے دن ہی اُن کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں رہنا آسان نہیں پاپا دن رات شفٹوں میں کام کرتے اور ایک بیڈ جو کہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ ایک کمرے میں شیئر کرتے اب کیمیلی کی وجہ سے ایک کمرے کا سہی انہوں نے سستے علاقے میں اپارٹمنٹ کرائے پر لیا تھا۔

جہاں کوئی سہولت زندگی میسر نہیں تھی بلکہ جواری بھکاری، ہپی لڑکوں کا وہ پسندیدہ علاقہ تھا زیادہ تر نیم خواندہ افراد رہائش پذیر تھے۔ چند روز میں ہی امی کی ہمت جواب دے گئی تھی مگر وہ ہار مان کر پاپا کے اُن کو یہاں بلوا لینے کا فیصلہ صحیح ثابت کرنا چاہتیں تھیں سو انہوں نے پاپا کے سختی سے منع کرنے کے باوجود گھر سے نکلنا شروع کیا بلڈنگ کے گھروں میں شناسائی بڑھائی رفتہ رفتہ انہوں نے لوگوں سے مراسم کیے شادی سے پہلے وہ ایک نرس تھی۔

اُسی صلاحیت سے لوگوں کے کام آنا شروع کیا پھر جلد ہی ایک معمولی اسٹور پر ملازمت حاصل کرلی پاپا کی طرح اب امی بھی اپارٹمنٹ کو لاک کر کے جانے لگیں تھیں..... عجیب عسرت بھرے غیر مانوس سے دن تھے۔ جو وہ چھوٹے بھائی بہن کو سنبھالتے صبح یا رات کا بچا کھانے یا پھر کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے نیچے تعفن زدہ گلی میں آوارہ لڑکوں کو دیکھتے گزارتی۔

پاپا کی انتھک محنت اور پرزور یقین کہ وہ بھی اسکول جائے گی اُس کے معصوم ذہن میں خوشی کی امنگ جگایا کرتا تھا پاکستان میں وہ فورتھ اسٹینڈرڈ میں تھی مہینوں کی شبانہ روز محنت کے بعد پاپا اُن کو ایک ٹرسٹی اسکول میں داخل کرپائے تھے مگر اب مسئلہ چھوٹوں کا تھا امی نے تو 'تو نہیں اور سہی' والی مثال پر پورا اترتے ہوئے کہیں اور جگہ ملازمت کرنی شروع کردی تھی اور وہ..... کسی حد تک معیار زندگی اوپر لے جانے میں کامیاب بھی ہورہی تھیں۔

مگر اس تمام کاوش میں سب سے زیادہ نقصان داؤد کا ہورہا تھا۔ اُس نے گلی کے آوارہ..... بچوں سے دوستی گانٹھ لی تھی۔

مغربی معاشرے کے ڈھکے چھپے تباہی کے جراثیم کامیابی کے خوبصورت چولے میں بھلا کس کو نظر آتے..... کم وبیش عرصہ تین سال اس گندے غلیظ بگڑے ہوئے محلے میں گزارنے کے بعد امی ایک نسبتاً بہتر علاقے میں شفٹ ہونے میں کامیاب ہوپائیں تھیں۔

مگر اب..... مغربی معاشرے کے اپنائے انداز داؤد میں پرورش پاچکے تھے شبانہ نے بہت چھوٹی عمر میں ایک ذہن اور مامتا ماری کا رول پلے کرنا شروع کردیا تھا اسکول کے بعد سے وہ گھر اور بہن بھائیوں کو اپنے ساتھ رکھتی، مگر اب داؤد اُس کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ وہ اندر سے خوفزدہ تھی۔

اور جب پہلی بار اُس نے داؤد کو اسموکنگ کرتے دیکھا تو ایک ایک ماں کی طرح فکرمند ہوگئی تھی۔ پاپا سے کچھ کہنا گھر میں ہنگامہ ہونا تھا..... وہ جس طرح بھی ممکن تھا اولاد کو نظر میں رکھتے تھے مگر..... ایک ماں کی طرح خیال تو نہیں کرسکتے تھے امی اب..... ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کررہی تھیں۔ رفتہ رفتہ انہوں نے تمام مغربی رنگ اپنالیے تھے۔

شدید محنت کرکے ان کی زبان بھی بولنے لگی تھیں وہ آزادی کے آخری سرے تک جانے کو بولڈ سمجھتیں تھیں۔ ان کی نظر میں وہ ایک فعال عورت کی طرح کامیاب رہی تھیں۔ اُن کا حلقہ احباب بڑھ گیا

Digitized by Google

تھا۔

وہ مشرقی نسوانیت کو کب کا ٹھکانے لگا چکی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب شبانہ نے انہیں داؤد کی سگریٹ نوشی کی لت کے بارے میں بتایا تھا۔

''اوہ اچھا.....'' وہ لمحہ بھر کو اپ سیٹ ہوئیں پھر میں دیکھتی ہوں کہہ کر تیار ہونے لگی تھیں آج کل وہ اپنے باس کے بہلاوے پر پرسنل سیکریٹری بننے کی خواہش مند تھی' اسی بات پر گھر میں کافی دن سے لڑائیاں چل رہی تھیں پاپا کا کہنا تھا کہ وہ ایک مشرقی ماں کی طرح اپنے بچوں کی دیکھ بھال کریں اور وہ مغربی ماں بھی بننا نہیں چاہتی تھیں اُن کا مطالبہ تھا پاپا خود جاب چھوڑ کر بچوں کو دیکھیں اب وہ گھر چلا سکتی ہیں تو جواب میں پاپا برداشت نہ کر پائے اور اُن کا ہاتھ اٹھ گیا بس یہیں غضب ہو گیا تھا۔ امی نے فوراً پولیس طلب کر لی تھی۔

اُس ایک واقع کے بعد پاپا بالکل چپ ہو گئے تھے مگر اندر ہی اندر وہ جتنا اپنے بچوں کو اس معاشرے کی برائیوں سے بچا سکتے تھے کوشش کرتے ہاں بہر حال وہ امی کو اپنے دل و دماغ سے نکال چکے تھے امی کو بھی اب ان کی پرواہ نہیں تھی۔ بس یونہی کھینچا تانی میں زندگی گزر رہی تھی۔

یہ گھرانہ کامیابی کے نام پر گناہوں کی دلدل میں جا گرا تھا اُن کا گھر ٹوٹ پھوٹ کا..... شکست و ریخت کا شکار ہو چکا تھا۔ داؤد اب ڈیوڈ کہلوانے لگا تھا اسکول چھوڑ کر آزاد زندگی اور خوشی کے نام پر ہپی ٹولی میں شامل ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا نشہ آور ادویات سے آگے..... ڈرگس کی لت میں پڑ گیا تھا۔ امی نے بھی پاپا سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

البتہ بچوں کو انہوں نے اپنے باس کے دیے بڑے اپارٹمنٹ میں آ کر رہنے کی آفر ضرور کی تھی۔ پاپا نے بہت خاموشی سے انہیں آزاد کر دیا تھا۔ مگر شبانہ کسی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑی تھی اُس نے رو رو کر چیخ چیخ کر اپنے گھر کی تباہی کا ذمہ دار ماں کو ٹھہرایا تھا۔ کس طرح وہ پاکستان میں ایک صاف ستھرے مشرقی ماحول کے پروردہ تھے اب یہاں..... وہ..... ایک بگڑا..... ناکام گھرانہ کے فرد ہو گئے تھے۔ اُس نے ماں کا دامن پکڑ پکڑ کر دھائی دی۔

امی ماں تو بچوں کو تمام برائیوں سے پاک رکھنے کے لیے انہیں اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے آپ کیسی ماں ہیں کہ صرف معیار زندگی بلند رکھنے کے لیے اپنے بچوں کو بھی زمانے میں اکیلا چھوڑ دیا بگڑنے کے لیے.....

کیا آپ کو اپنا مسلم ہونا یاد نہیں..... آپ اپنا دین اپنا معاشرہ اپنا مقام سب بھول گئیں۔ امی نے اُس کی تمام باتیں سنیں پھر دھیرے سے اُسے خود سے الگ کیا۔ اور بنا کچھ کہے گھر سے نکل گئیں۔

داؤد تو معمول کی طرح گھر میں نہ تھا شبانہ ان کے ساتھ جانے سے انکاری تھی سو وہ روزینہ کو ساتھ لے گئیں ہر اٹھتے قدم اُسے امی سے دور بہت دور لے جا رہے تھے۔ عزت' پاکیزگی' وقار' مامتا' گراوٹ شرمساری' بے باکی' مغربی عفریت سارے اچھے برے جذبے اُس کی آنکھوں میں چنگاریاں بھر رہے تھے اُس کے وجود کو بھسم کر رہے تھے امی اب اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔

اُن کو لے جانے کے لیے ڈرائیور کار سمیت موجود تھا وہ اپنے باس سے شادی کا فیصلہ کر چکی تھیں ایک خوفناک گہرا مہیب اندھیرا تھا جو اُس کے وجود کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ آہنی کڑے کی طرح جکڑ رہا تھا اُسے اور شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے فرمایا خدا نے.....

''اور ہم نے اُن کے دلوں پر مہر ثبت کر دی قفل

Digitized by Google

لگا دیا اب وہ اندھے گونگے بہرے ہیں۔"

جہنم میں جانے کے لیے ایک اور مسلم گھرانہ تیار تھا۔ ڈیوڈ نے پاپا کو خرافات بک کرامی کی ہمدردی حاصل کی اُن کے نئے شریک زندگی کو سراہا اور امی سے اچھی خاصی رقم بٹور کر اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گھومنے چل دیا' روزینہ امی کے ساتھ تھی۔

ماں کی غلط روش اور باپ کی لاتعلقی نے شبانہ کو بوڑھی روح بیمار ذہن بنا دیا تو ماں کے ساتھ نے روزینہ کو زندگی انجوائے کرنا سکھا دیا وہ ماں کی روش پر چل پڑی تھی بس اب باپ بیٹی ہی ساتھ تھے خاموشیاں اُن کی زبان بن گئی تھی نفرت غصہ شرمندگی بے بسی نے..... اُس کے اعصاب سلب کرنا شروع کر رہے اور جب پاپا بھی اُسے چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئے تو وہ اُس اکیلے گھر میں کسی بوڑھی روح کی طرح منڈلاتی رہ گئی زخم زخم وجود..... کرچی کرچی ذات بے ہنگم آزاد زندگی اور اس کے قاتل داؤ پیچ کسمساتی روی تکلیف دہ صورت بنی اُس کے ابہام کو پراگندہ کرتی رہی' وہ کڑھ کڑھ کر سوچ سوچ کر ہذیانی ہونے لگی تھی پاپا کی موت نے اُس کی روح قالب میں آخری زہریلی کیل ٹھونک ڈالی کچھ اس طرح کہ وہ خود نفسیاتی کیس بن گئی۔

پھر برین ہیمبرج کی بنا پر اسپتال منتقل کر دیا گیا ایک ہفتے بعد ممی اُسے ڈسچارج کروا کر اپنے نئے شوہر کے اپارٹمنٹ لے گئیں تھیں اُس کا از حد خیال رکھ رہی تھیں اور وہ بھی عرصہ بعد ماں کی رفاقت کو محسوس کر رہی تھی۔ کسی ناسمجھ ننھی بچی کی طرح اُسے خود کو ممی کا سنبھالنا اچھا لگ رہا تھا بہت اچھا..... وہ ہر نشے سے بے نیاز ماں کو اپنے اردگرد منڈلاتا دیکھ کر مسرور ہوتی' کچھ عرصہ کے لیے اُسے اعصابی بیماری نے ہر قصے کو کیا بھلایا اُس نے خود..... دل و ذہن سے پاپا دادی پاکستان' داؤد روزینہ اپنے حالات سب کچھ کھرچ ڈالے ایک ماں کی ذرا سی التفات..... اُسے اپنے افکار سے دور لے گئی۔

وہ بالکل کسی پیدا ہوئی معصوم بچی کی طرح خود کو محسوس کر رہی تھی۔ ہر شے سے نابلد اور اس سب دورانیے کو کتنا عرصہ لگا محض چند ہفتے' یا کچھ دن..... مگر یکے بعد دیگرے دو شاکس اُسے ایسے لگے کہ پھر اُس کا اپنا آپ جل اٹھا اُس نے اپنے افکار اپنے خیالات اپنے حالات اپنا مذہب اپنا معاشرہ اپنا اقدار یاد آ گیا..... پہلے تو اُسے ممی کے نام نہاد غیر مسلم شوہر سے ممی کے غیر موجودگی میں اپنا دام وصول کرنے کے فارمولے نے اور اسی دن کی رات روزینہ المعروف روزی کے اپنے بوائے فرینڈ کو چھوڑ کر اُس کی ناجائز اولاد کو فخر سے گھر لانے اور ممی کا روزینہ اور اس کے بچے کو پُرجوش خیر مقدم نے یکبارگی اُس کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا تھا۔

"یہ گناہ ہے..... حرام ہے..... ایک مسلم ماں ایک مسلم بیٹی کس بے باکی سے اپنے مذہب کا اپنے اقدار کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ آئی ہیٹ یو میں نفرت کرتی ہوں تم سب سے' ماں جیسے مقدس رشتے کو غلیظ بدبودار کرنے والی عورت سے حیا' نفس پردہ جیسے خوبصورت جذبوں کا شرمناک سودا کرنے والی بہن سے..... نکل جاؤ تم سب میرے سامنے سے آئی ہیٹ یو آئی....." اُسے ممی کے پرتعیش ڈرائنگ روم کی زینت بننے والے قیمتی اشیا کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیا تھا وہ ایک بار پھر ہوش سے خرد کی طرف چل پڑی تھی۔

ممی کے نام نہاد شوہر نے ایمبولینس اور پولیس طلب کر لی تھی۔ اس مرتبہ ڈسچارج ہونے پر وہ..... پاکیزگی کی صف سے بہت نیچے اتر کر بھٹکنے والے بدخو کی طرح اسفلین سافل میں جا گری تھی۔

اپنی ذات پر..... ظلم کر کے سراپا انتقام بننے والی'

Digitized by Google

راہ ہدایت کا دامن چھوڑ کر..... ماں سے انتقام لینے کا فیصلہ کرنے والی..... اور اب اس انتقام کا نشانہ اپنی ماں کو بنانے کے لیے اُس نے بے حد گری ہوئی حرکت کی تھی۔

نہایت غیر اخلاقی اُسے اپنے نفس کے مارے غیر مسلم باپ کو..... اپنا دیوانہ بنا کر اپنی ماں سے بھرپور انتقام لیا تھا اور جس دن اُس کی ماں اُسے اُس کی غلطی کا احساس دلانے اُس کے پاس پہنچی تھیں وہ دن اُس کی فتح کا دن تھا اُس نے نشے میں ہونے کے باوجود اپنی ماں سے گزرے سالوں کی ایک ایک گھڑی کا احساس دلا کر اُسے ذلیل کیا۔ اگرچہ وہ خود اس عمل سے گزر کر اپنی نگاہوں میں رد ذلیل ہوگئی تھی۔ وہ خود پامال ہو چکی تھی۔

اور ماں کو ذلیل کر کے گھر سے نکال دینے کے بعد ہی وہ نائٹ کلب گئی تھی۔ جہاں اُس کی ملاقات ولسن سے ہوئی تھی اور وہ اُسے اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لے آئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد ولسن کے ساتھ گزارے کیف انگیز لمحات کی یاد نے اُس کے وجود کو چیر ڈالا تھا اُس کے اندر کی ڈری سہمی مشرقی لڑکی کو بیدار کر دیا تھا جس کا آنچل حیا اور تھا شرم جس کی عادت..... پردہ اُس کی زینت تھا۔

اسلام جیسے اعتدال پسند مذہب کو انسان نے انتہا پسند بنا ڈالا تھا۔ کچھ تو غلط تھا مگر کہیں..... بہت کچھ غلط تھا۔

''انسان بڑے خسارے میں ہے۔'' وہ اور اُس کا خاندان بھی بڑے خسارے میں تھا خالی ہاتھ..... خالی دامن..... تہی داماں اُس کی روح اُس کے جسد خاکی سے جدا ہو رہی تھی۔ میانہ روی کے دامن کو چھوڑ کر انتہا پسندی اپنانے والے رد ذلیل خاکی پتلے.....

☆.....☆.....☆

''صبح کاذب کا اندھیرا چھٹ چکا تھا صبح صادق نمودار ہو رہی تھی موسم..... گلابی سردی یعنی اکتوبر کے آخر کا تھا تو ہلکی ہلکی نمی والی ہوا طبیعت کو بشاشت عطا کر رہی تھی' سبط حمید اکبر نے کلمہ پڑھ کر دوبارہ زندگی بخشنے پر اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

''نیند سکرات ہے۔'' (اور ہم تم پر نیند کا غلبہ ڈال دیتے ہیں جو کہ سکرات ہے)

سبط حمید وضو کے بعد مسجد کی طرف چلا اور صابرہ بیگم نماز کے لیے جائے نماز پر آ بیٹھیں..... یہ اُن دونوں میاں بیوی کا برسوں پرانا معمول تھا نماز فجر کی ادائیگی کے بعد وہ دونوں چائے ساتھ پیتے اور طلوع ہونے والے دن کی مصروفیات کے بارے میں بات چیت کرتے۔

ڈیفنس کی اسٹریٹ 4 میں واقع یہ خوبصورت وسیع عریض بنگلوں میں سے ایک میں سید سبط حمید اکبر اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے سبط حمید چیمبر آف کامرس کے ایک اعلیٰ عہدیدار اور تاجر کمیونٹی کے صدر بھی تھے۔ جدی پشتی کامیاب تاجر..... جو اپنی نیک نامی ایمانداری' پُرخلوص عادت' ہمدردی کے جذبات رکھنے والے نیک صالح مرد تھے اُن کی تربیت خالص الخالص اُن کے دادا سبط امین نے خاص توجہ سے کی تھی۔ ہر چیز ہر معاملے میں توازن یعنی میانہ روی کے اعلیٰ پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے عین اسلامی خطوط پر اور اپنی یہی اسلامی تربیت سبط حمید نے اپنی اولاد کو دی تھی خدا نے شریک حیات بھی ایک ایسی نیک بی بی کی شکل میں عطا کی۔

ان دونوں نے حقوق العباد اور حقوق اللہ اور دیگر پہلو اسلامی سے اپنے بچوں کے لیے پورا پورا وقت لگا کر اُن کی اصلاح اُن کی تربیت کی تھی یہی وجہ تھی کہ اب دونوں میاں بیوی بچوں کی تمام تر ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر آرام سے زندگی بسر

Digitized by Google

کررہے تھے اُن کے تینوں بیٹے اپنا پاپا کے شانہ بشانہ کاروبار میں حصہ دار تھے اُن کے بچے دادا دادی کے گرویدہ..... دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ صابرہ خاتون اور سبط حمید اپنے بچوں کے بچوں کے ساتھ اُسی محبت سے اُن کی تربیت میں مصروف تھے۔

سبط حمید نے گھر کے ماحول کو ایک خاص دوستانہ ماحول میں ڈھالا ہوا تھا۔ تمام بچوں کو ہر معاملے میں اس طرح آزادی دی تھی کہ اُن کو ہر کام کے اچھے برے پہلو سے آگاہی کے بعد راستوں کا انتخاب کرنے کا حق حاصل تھا۔ انہوں نے بے جا پابندی سرزنش اور روک ٹوک کے بجائے بچوں کو اتنا اعتماد دیا ہوا تھا کہ وہ بے جھجک اپنے تمام مسائل اُن سے ڈسکس کرتے..... معاملے کی بابت اچھے برے پر..... بحث و مباحثہ' پھر اُس کا تدارک بھی خود تلاشتے..... اچھی تعلیم اعلیٰ تربیت پھر..... محبت و خلوص کی اس خوبصورت سی زنجیر سبط حمید کے کنبوں کو محبت کی لڑی میں پرو رکھا تھا اس طرح کہ اس محبت کے پودے کی خوشبو سے اُن کا گھر مہک رہا تھا۔

اپنی نسل اور پھر نسل نوع کو اسلامی خطوط پر چلانے کے لیے دونوں نے عرق ریزی کی تھی جان توڑ محنت و مشقت' خود عمل کر کے بچوں کو اچھے عمل پر عمل پیرا کر دیا تھا۔ اور اب سکون اطمینان کی صورت اپنا انعام پا رہے تھے۔ اُن کا گھرانہ ایک مثالی گھرانہ تھا۔

دین اسلام کی اساس پر چلنے والا..... ہر ہر معاملے میں میانہ روی اختیار کرنے والا کہ انتہا پسندی آخر ہلاکت خیز ہے اُن کے گھر میں نماز روزہ زکوٰۃ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ساتھ ساتھ دنیاوی مشغلوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بچے مخلوط کالج یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے تھے..... دوستوں میں آزادی تھی۔ ان کے گھر میں ناشتہ میں کوئی پابندی نہ تھی اسی طرح دوپہر کے کھانے پر بھی کوئی ہوتا نہ ہوتا مگر رات کے کھانے پر تمام افرادِ خانہ کی حاضری لازمی تھی۔

ہنستے مسکراتے خوش گپیوں کے دوران کھانا کھایا جاتا جس کے بعد بڑے سے لاؤنج میں سبط حمید 'صابرہ خاتون اُن کے تینوں بیٹے' بہوویں' پوتا' پوتی شامل ہوتے اس دوران اگر بیٹیاں بھی آئی ہوتیں تو اس محفل کو چار چاند لگ جاتے۔ اس محفل میں سب اپنے چھوٹے بڑے مسائل لے کر دادا کے پاس پہنچتے جسے وہ اپنی روشن فراست سے حل کرتے اور اس طرح کہ کبھی کسی کو اس کی مرضی کے خلاف پابند نہیں کرتے تھے وہ کہتے تھے۔

''بیٹا ہر تصویر کے دو رخ ہیں ہمیں منفی و مثبت دونوں پہلوؤں کو دیکھنا چاہیے پھر اگر ہم اعتدال میں رہتے ہوئے ہر مسئلے کو حل کریں تو یہ ایک بہترین صورت حال ہوتی ہے۔ اُن کا سب سے بڑا پوتا ایم بی اے کر رہا تھا۔ دوسری پوتی لاء کالج میں تھی۔

باقی تمام پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں اچھے تعلیمی اداروں میں تھے۔ اُن کے حکم پر ان کے بچوں نے بھی اپنے بچوں کو ایک بڑی حد تک آزادی دی ہوئی تھی سب سے چھوٹے بیٹے کے اکلوتے بیٹے کو موسیقی سے لگاؤ تھا سو اُس نے اپنا ایک بینڈ گروپ بنا رکھا تھا گھر کے ایک کمرے میں اُسے چھوٹا سا اسٹوڈیو بھی بنا رکھا تھا وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ موسیقی پر بھی محنت کرتا اور جب اذان کی آواز سنائی دیتی تو اُس گھر کے ہر فرد کے قدم مسجد کی طرف اٹھ جاتے۔ آج وہ سرِشام گھر آ گئے تھے۔ ابھی وہ آرام ہی کر رہے تھے کہ ارسل انہیں بلانے آ گیا تھا۔

''دادا ابو آیئے چلیں میرے اسٹوڈیو میرے غیر ملکی دوستوں سے آپ کو ملانا ہے.....'' ارسل نے

Digitized by Google

انہیں بستر سے اٹھایا۔

''اچھا بیٹا چلو.....'' وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ ارسل کے ساتھ کمرے میں پہنچے تو اُس کے تمام دوستوں نے خوشی سے اُن کا خیر مقدم کیا۔ تنویر، رودیل، رضا عمیل کو تو وہ جانتے تھے مگر دو غیر ملکی نوجوان ان کے لیے اجنبی تھے۔

''یہ میرے دادا ابو ہیں فرینڈز.....'' ارسل نے شستہ انگلش میں انہیں بتایا۔

''اور دادا ابو یہ..... جارج..... اور ڈینیل.....

ابھی صبح ہی امریکہ سے کراچی پہنچے ہیں ہم نے ایک لائیو کنسرٹ رکھا ہے..... اس سلسلے میں.....''

''خوش رہو..... جیتے رہو۔'' سبط حمید نے اُن کو گلے لگا کر ویلکم کیا۔ انہیں محبت سے بٹھایا اور خالص برطانوی انگلش میں اُن سے اُن کے مزاج کے مطابق باتیں کیں۔ ماڈرن ملک سے آنے والے نووارد ایک 80 سالہ پاکستانی سے اتنی خوبصورت اور شستہ تلفظ میں اپنی زبان میں گفتگو کرتے دیکھ کر کافی حیران تھے۔

دن اسی طرح رات میں مدغم ہو رہے تھے..... راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا کہ اچانک سبط حمید کے گھر میں ایک نئے مسئلے نے سر اٹھایا تھا جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کی سب سے چھوٹی پوتی..... اپنے پروفیشن کو لے کر ماں باپ سے ضد کر رہی ہے اور بیٹے بہو نے اپنے تئیں کی حد تک سمجھانے کے بعد اُس مسئلے کو اُن کے آگے پیش کیا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ اچانک ہی اُن کی پوتی زرین نے پائلٹ بننے کا پلان کر لیا تھا وہ کافی..... اچھی اسٹوڈنٹ رہی تھی۔

''ابا جی آپ خود سوچیں زرین کی منگنی ہو چکی ہے، مگر وہ اب تعلیم کے لیے وہ باہر جانا چاہتی ہے..... پتہ نہیں سسرال والے اجازت دیں نہ دیں اور لوگ..... میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے سمجھائیں وہ یہ ضد چھوڑ دے، ہم اُسے اکیلا نہیں بھیج سکتے۔'' بہو نے اُن کو اپنے خدشات پیش کیے تھے ایک ماں کی حیثیت سے وہ صحیح سوچ رہی تھیں۔ سبط حمید نے اپنی بہو کی تمام تر باتیں اُن کے خدشات تحمل سے سنے پھر گویا ہوئے۔

''دلہن تم کب سے یہ فرسودہ باتیں دماغ میں رکھنے لگیں کہ جوان جہان بچی کو باہر اکیلا بھیجنے پر لوگ کیا کیا باتیں کریں گے ہر طبقہ میں افواہیں پھیلانا باتیں بنانا، بات کو غلط رنگ دے کر خاندان میں اچھالنا..... ہر خاندان میں ہوتا ہے کسی بھی اچھی بات کو برائی میں لپیٹ کر پھیلانا اور لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں، تمہیں معلوم ہے؟''

''ابو جی..... مگر آپ یہ بھی دیکھیں کہ ہم اُس کی منگنی کر چکے ہیں اُس کے سسرال والوں نے دو ڈھائی سال کا وقت دیا تھا..... سال تو ہو رہا ہے پھر ان کی اجازت کے بغیر زرین کو کیسے.....''

''تم یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہو مگر ہم آپ اپنی بچی کی ڈھال بنیں اُس کو سپورٹ کریں کہ کیونکہ یہ ایک اچھا قدم ہے نہ کہ کوئی ایسا..... فعل جس پر ہم خاندان سے، اُس کے سسرال سے شرمندہ ہوں۔''

''ہم سب پہلے اپنی بچی کو سنیں گے سمجھائیں گے..... اُس کا اعلیٰ مقصد ہے تو اُس کی مدد کریں گے۔''

پھر انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کی اجازت دے دی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت بہترین خطوط پر کی ہے اور وہ اعتدال کے راستے پر چلتے ہوئے کبھی اپنے بڑوں کو شرمندہ نہیں کریں گے۔

☆☆.....☆☆

Digitized by

بھکر سے ارسال کردہ بالکل سچی تحریر

موت کے سوداگر

ناصر کی صورت میں ایک کیس میرے سامنے تھا اس سے معلومات لے سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ میں اس پر بھرپور توجہ دے رہا تھا اس میں میرا ذاتی مفاد یا مصلحت نہ تھا۔ میری نیک نیتی شامل تھی۔ اس کا مقدمہ اللہ پاک کی عدالت میں' دنیا کی عدالت میں پیش تھا وہ صحیح فیصلہ کر سکتے تھے میری کیا اوقات تھی میں تو صرف.....

ملازم حسین شیرازی

ناصر 17 سالہ خوبصورت گورا چٹا نوجوان تھا۔ پچھلے تین سال سے جیل میں زیر دفعات 5/ Explosion (دھماکہ) اور 7/ATA (انسداد دہشت گردی) کے تحت ATC (انسداد دہشت گردی) بیرک میں اپنے خلاف مقدمات مذکورہ بالا کا سامنا کر رہا تھا اس کا مقدمہ سیشن جج انسداد دہشت گردی عدالت میں زیر سماعت تھا ان تین سالوں کے دوران جیل میں کوئی اس کی ملاقات پر نہ آیا تھا اور جوڈیشل لاک اپ کچہری میں بوقت پیشی' اپنی چال ڈھال رکھ رکھاؤ سے کسی اچھے پڑھے لکھے خاندان کا لگتا تھا۔

چودہ سال کی عمر میں قصہ خوانی بازار پشاور میں تین سنیماؤں جو برابر بر بنائی گئی تھیں ان کے آگے مختلف دکانیں تھیں ان پر یکے بعد دیگرے بھاگتے ہوئے ہینڈ گرینڈ پھینکے تھے۔ دکانیں پان سگریٹ' کیسٹ' فوٹو گرافرز' فوٹو اسٹیٹ کی تھیں انہیں نشانہ بنایا' پچیس بے گناہ موقع پر جاں بحق ہو گئے تھے۔ درجنوں زخمی ہوئے۔ کروڑوں کی املاک کو نقصان پہنچا۔ اس کے گلے میں بارود سے بھرا جھولا تھا وہ اس طرح بھاگتے ہوئے کمانڈو ٹائپ کارروائی کر رہا تھا جیسے ہالی وڈ کی ایکشن سے بھرپور فلم کا ہیرو اپنے دشمنوں پر حملہ آور ہوتا ہے۔

اس کی عمر محض چودہ سال تھی وہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ آخری ہینڈ گرینڈ پھینکتے ہوئے اس سے گر گیا۔ گرینڈ کی پن کھل گئی تھی جو اس کے پیٹ پر آن لگا۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا۔ زخمی حالت میں گر گیا۔

آرمی' پولیس موقع پر حرکت میں آئی جو مقتولین و زخمیوں کو طبی امداد فراہم کر رہے تھے۔ انہوں نے ناصر کو شدید زخمی حالت میں گرفتار کیا۔ لیڈی ریڈنگ اسپتال لے گئے۔ پورا ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دیا گیا جو اس کے علاج معالجہ پر لگا تھا اس کا زندہ بچنا ضروری تھا کہ اتنی بڑی کارروائی کے محرکات کیا ہیں؟ کن لوگوں کی آشیر باد اُسے حاصل تھی۔

Digitized by Google

کون لوگ تھے جنہوں نے اُسے اتنی بڑی واردات کے لیے آمادہ کیا۔ اور باقی شریک کار اور سہولت کار کہاں ہیں؟

وہ ایک ماہ ہسپتال میں رہا خصوصی علاج ہوتا رہا اس کے بعد اسے عدالت پیش کیا گیا۔ دفعہ 164 کے تحت اس کے بیان قلمبند ہوئے جس میں اس نے جرم کا اعتراف کیا قانون کے مطابق اسے جوڈیشل لاک اپ جیل جانا تھا لیکن چونکہ مذکورہ بالا امور زیر تحقیقات تھے، تفتیش نامکمل تھی پولیس نے ایک ماہ کا جسمانی ریمانڈ لیا اب وہ تھانے میں بند تھا۔

تفتیش ہوتی رہی اعترافِ جرم کے علاوہ اس کی زبان سے پولیس کچھ نہ اگلوا سکی۔ پولیس نے ہر حربہ استعمال کیا۔

تھرڈ ڈگری تک گئے۔ روزانہ زدوکوب کیا جاتا رہا اسے باور کرایا جارہا تھا اور یقین دہانی کرائی جارہی تھی کہ اگر وہ دیگر ملوث عناصر کی نشان دہی کرے تو قانون نہ صرف رعایت کرے گا بلکہ تحفظ بھی دے گا۔ لیکن نہ جانے وہ کس مٹی کا بنا تھا کہ زبان نہ کھل سکی۔ وہ ایک ہی بات پر مصر رہا کہ یہ کارروائی اس کی ذاتی ہے اس کے پیچھے کوئی پارٹی، تنظیم، شخ یا ادارہ نہیں کوئی دیگر اس واردات میں ملوث نہیں۔ آخر ایک ماہ جب ریمانڈ ختم ہوا تو اسے عدالت نے جیل بھیج دیا۔

Digitized by Google

جہاں اس کا کیس چل رہا تھا۔

میں اس وقت جیل میں تھا قیدیوں جن میں بچے' بڑے' بوڑھے' پڑھے لکھے' اَن پڑھ تھے اُن کو قرآن پاک پڑھانا' تفسیر و ترجمہ بتانا دیگر تعلیم سے آراستہ کرنا میری ذمہ داری تھی اس وجہ سے سارے قیدی میرا بہت لحاظ کرتے تھے' مان سمان دیتے تھے۔

ناصر ان میں سے ایک تھا۔ وہ بہت کم گو' خاموش' خاموش رہتا تھا۔ لیکن سبق میں بہت دلچسپی لیتا تھا خصوصاً قرآن پاک کی تفسیر پر بہت دھیان دیتا تھا۔ وہ میری بڑی عزت کرتا تھا میں بھی اس پر خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس نے انسانیت سوز ظلم و ستم کیا تھا۔ بربریت کا ثبوت دیتا تھا لیکن میری از حد کوشش تھی کہ میں اسے راہِ راست پر لاؤں' میرے مطابق گناہ سے نفرت کرو گناہ گار سے نہیں۔

اس کے جرم کی سزا تو ازروئے قانونی دفعات سزائے موت تھی۔ چونکہ وہ ابھی نابالغ تھا اور بوقت وقوعہ محض چودہ سال کا تھا۔ اب زیادہ سے زیادہ 25 سال سزا ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے خلاف چشم دید گواہان تھے۔

دن کا وقوعہ تھا آلات ضرر (ہینڈ گرینڈ برآمد ہوئے تھے) سب موقع پر پکڑے تھے اور سب سے بڑھ کر اس کا اعتراف جرم' لہٰذا اس کی سزا یقینی تھی' لیکن اسے پروانہ تھی وہ اس بارے میں فکر مند نہ تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اتنی بڑی کارروائی کے ماخذ معلوم کروں۔ اس کے پس پشت عوامل سے آگاہی ہو کہ اس نے اتنی کم عمری میں اتنا بڑا جرم کیوں کیا اس کے ماسٹر مائنڈ کون تھے؟

میں نے اس پر توجہ دی۔ زندگی کے نشیب و فراز' اونچ نیچ سے آگاہ کرتا رہا۔ دین و دنیا کے معاملات سے روشناس کرتا رہا گناہ ثواب' حق باطل' ظلم مظلومی' بربریت' معصومیت پر علیحدگی میں لیکچر دیتا رہا وہ خود بھی اس طرف مائل تھا۔

کارروائی تو اس نے کی تھی لیکن اب شاید اس کی سوچیں بدل رہی تھیں۔ چیختے چلاتے آہ و بکا کرتے مقتولین' مجروحین کی درد ناک آوازیں اس کے خیالات میں مدوجزر پیدا کر رہے تھے۔

دہشت گردی کے بارے میں مختلف آراء تاویلیں تو سن رکھی تھیں اب موقع ملا کہ عملی طور پر جان سکوں اور اپنے قارئین کے گوش گزار کر سکوں کہ دہشت گردی کے محرکات' مقاصد' عوامل حقیقتاً کیا ہیں کہ کیسے یہ ظالم معصوم بچوں سے رابطہ کرتے ہیں' کیسے موت کے منہ میں جانے پر آمادہ کرتے ہیں ان بچوں کے والدین کیوں ان ظالمانہ اور کافرانہ اقدامات پر راضی ہوتے ہیں۔

ناصر کی صورت میں ایک کیس میرے سامنے تھا اس سے معلومات لے سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ میں اس پر بھرپور توجہ دے رہا تھا اس میں میرا ذاتی مفاد یا مصلحت نہ تھا۔ میری نیک نیتی شامل تھی۔ اس کا مقدمہ اللہ پاک کی عدالت میں..... دنیا کی عدالت میں پیش تھا وہ صحیح فیصلہ کر سکتے تھے میری کیا اوقات تھی میں تو صرف معلومات لینا اور آگے لوگوں تک پہنچانا چاہتا تھا یہی میرا مقصود تھا۔

ناصر کئی دفعہ کہہ چکا تھا۔

"صاحب..... مجھے اب زندگی موت سے کوئی غرض نہیں ہے مجھے سزائے موت ہوتی ہے تو انجام بخیر..... لمبی قید ہوتی ہے تو جیل کی اندھیری اور تاریک کوٹھڑیوں میں روزانہ ہلاک ہونا (دہشت گردی میں دی گئی سزا میں کوئی رعایت

Digitized by

نہیں) بری ہو جاتا ہوں تو یہ عذاب کہ انٹیلی جنس میرے پیچھے لگی رہے گی کہ میں کسی اور کارروائی میں ملوث نہ ہو جاؤں یا کسی اور کا آلہ کار نہ بن جاؤں۔

دوسرا سابق سہولت کار سایہ بن کر پیچھے رہیں گے کہ میں دوبارہ ایسی کارروائی کا مرتکب بنوں' ہر دو صورتوں میں اذیت ہی اذیت..... اب زندگی کی کوئی تمنا نہیں ایک تو گھر والوں کی بے رخی دوسرا مرنے والوں کی آہ و بکا آج بھی دل میں کرب کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتا ہوں کہ میں نے بے گناہ اور معصوم لوگوں کو کیوں موت کے حوالے کیا۔ کیوں بے خطاؤں کے گھر اجاڑے' آج مجھے اپنے پریوار کی پروا نہیں مجھے ماں باپ کی فکر نہیں وہ میرا باپ ہی تھا جس نے چند روپوں کی خاطر معصوم بیٹے کو خونی دہشت گردوں کے حوالے کیا تھا۔ ان تین سالوں میں کسی نے پلٹ کر نہ دیکھا میرا حال نہ پوچھا' میری زندگی کے ارمان اپنوں کی بے رخی بے حسی میں لٹ گئے۔'' میں دبے الفاظ میں اُسے کریدتا رہا۔ میری کوشش تھی کہ علم کی روشنی میں اسے احساس دلاؤں کہ جو کچھ اس نے کیا وہ ظلم تھا غلط تھا۔ گناہِ عظیم تھا اس۔ شیطانی بہکاوے تھے وہ اب تعلیم و رضا کی منزلوں میں تھا۔ بقول اس کے سبق میں اُسے بہت سکون اور چین ملتا تھا وہ دلجمعی سے باتوجہ ہو کر پڑھتا رہا۔

ایک دفعہ سیشن جج جیل کے دورے پر آئے اس وقت میں ناصر کو تفسیر قرآن بیان کر رہا تھا جج صاحب ہمارے کھڈی کی طرف چل کر آئے ناصر سے کہنے لگے۔

''بیٹا کیا حال ہے' کیا پڑھ رہے ہیں؟''

''سر میں ٹھیک ہوں' قرآن پاک با ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ قرآنِ پاک کے مضامین کیا ہیں؟'' (یہ مشکل سوال تھا)

''قرآن پاک کے تین مضامین ہیں۔'

''پہلا توحید..... اللہ پاک کی واحدانیت یعنی وہ ایک ہے ساری کائنات کا خلق کرنے والا ہے' سب کو پالنے والا ہے۔''

''دوسرا احکام خداوندی..... یعنی نماز' روزہ' حسنِ سلوک' خدمتِ خلق وغیرہ۔''

''تیسرا قصص الانبیاء..... یعنی نبیوں' رسولوں کے قصے اُن کی زندگیوں کے حالات معاملات وغیرہ.....''

''بہت خوب بیٹا..... بہت صحیح جواب دیا۔''

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

''بیٹے تم حوالاتی ہو اگر قیدی ہوتے تو میں تمہاری آدھی قید معاف کر دیتا۔'' پھر انہوں نے کوٹ کی جیب سے پین نکالا انعام میں اسے تحفے میں دیا۔ تب اس نے کہا۔

''جرم نے میرے ہاتھوں میں ہتھیار تھمائے جنہوں نے میری زندگی اجاڑ دی۔ میں انسانیت کا قاتل بن گیا قانون نے مجھے قلم دیا جس نے میرے شعور میں آگاہی حق کی اور انقلاب برپا کر دیا۔''

اس کی بیرک میری بیرک الگ تھی وہ صرف ایک گھنٹہ دیگر قیدیوں کے ہمراہ پڑھنے آتا تھا مجھے تھوڑی بہت اجازت تھی کہ میں دیگر احاطوں میں یا ATC (منڈا خانے) بسلسلہ تعلیم و تبلیغ کچھ وقت کے لیے آنا جانا کروں اس مناسبت سے میری ناصر سے علیحدگی میں ملاقات ہوتی تھی۔ پھر ایک دن میری کاوشیں رنگ لائیں۔ ناصر اپنے بارے میں سب کچھ بتانے پر تیار ہو گیا۔

Digitized by Google

''میرا تعلق صوبہ کے پی کے علاقہ غیر سے ہے۔ ہم دو بھائی' دو بہنیں ہیں۔ بھائی مجھ سے چھوٹا اور دونوں بہنیں مجھ سے بڑی ہیں۔ والد کا باڑہ پشاور میں ٹائروں کا کاروبار ہے جو اچھا چل رہا تھا۔ خوب کمائی تھی۔ میرے والد نے کاروبار کو پھیلانے کی غرض سے سود پر قرض لینا شروع کیا شروع میں تو بہت فائدہ ہو رہا تھا لیکن پھر بعد میں لاکھوں کے نقصانات ہونا شروع ہوئے وہ بہت پریشان تھا۔ آئے روز قرض خواہ تنگ کرنے لگے اسی اثنا میں کچھ ناپسندیدہ لوگ ہمارے گھر آنے لگے وہ مجھے عجیب تولتی نظروں سے گھورتے تھے آخر ایک دن میرے والد نے مجھے یہ کہہ کر ان کے حوالے کر دیا کہ وہ مجھے تعلیم سے آراستہ کریں گے۔ زندگی کو کامیاب طریقے سے بسر کرنے میں میری رہنمائی کریں گے۔ میں ناسمجھ ان کے جھانسے میں آ گیا۔ میری ان کے سامنے اوقات ہی کیا تھی کہ میں اپنے خیالات سے انہیں آگاہ کرتا۔''

''انہوں نے میرے والد کو کیا لالچ دیا قرض اتارنے میں مدد کی دینی دنیاوی فوائد کے بارے میں تعاون کا یقین دلایا بہرحال اب میں ان کے رحم و کرم پر تھا۔ دوسرے دن ہمارے علاقے سے بہت دور (تحصیل باڑہ سے کرم ایجنسی وہاں سے شمالی وزیرستان' پھر وہاں سے جنوبی وزیرستان لے گئے۔ سر بفلک پہاڑوں کے دامن میں انہوں نے اپنے کیمپ بنائے تھے فوجی چوکیاں دور بنی تھیں۔ انہوں نے وہاں ایک مدرسہ بنا رکھا تھا جس میں 20/25 دیگر طلباء زیر تعلیم تھے۔''

''ہمارے استاد/ امیر صاحب ایک باشرع' اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے وہ اردو' انگریزی' پشتو' عربی روانی سے بولتے تھے ان کے لب و لہجے میں مٹھاس اور خوش اخلاقی تھی۔ میں دیگر طلبا جو ملک کے مختلف علاقوں (خصوصاً جنوبی پنجاب) سے متعلق تھے پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ ان کا مقصد بچوں کو جہاد (دہشت گردی) پر آمادہ اور راغب کرنا تھا۔ جنگی' حربی' دنیاوی' دینی تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ یہ سارا کام وہ مرحلہ وار انجام دیتے تھے۔''

سب سے پہلا مرحلہ برین واشنگ' تبلیغ کا تھا وہ بتاتے تھے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے ایک دن سب چھوڑ چھاڑ کے آخرت کے سفر پر روانہ ہونا ہے۔ جو اس دنیا کی لہو و لعب میں دلدادہ ہوا وہ ذلیل و خوار ہو گیا۔ 60/70 سال کی عمر میں بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بجائے اللہ کی راہ میں صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے جوانی کی موت کو گلے لگانا ہی فلاح و کامیابی ہے (پہاڑوں کے پتھروں پر لکھا تھا' پہاڑوں میں دفن ہوں گے برف ہوگا کفن اپنا) ہم لوگ باشرع دیندار ہیں نماز' روزہ' دیگر اعمال پابندی سے ادا کرتے ہیں احکامِ خداوندی پر عمل پیرا ہیں دوسرے لوگ (شہروں کے رہنے والے) شیطانی راہوں پر چل رہے ہیں گناہوں کی دلدل میں سر سے پاؤں تک دھنسے ہیں۔ ان کی بود باش رہن سہن' پہناوا طرزِ زندگی غیر مسلموں اور کافروں کی تقلید ہے۔ اُن کی عورتیں بے پردہ ہوتی ہیں' بے حیائی کی چادر میں لپٹی غیروں کو دعوتِ گناہ اُن کا وطیرہ ہوتا ہے۔ ٹی وی ڈراموں' ننگی فلموں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اُن کی سرکوبی کرنا' انہیں سزا دینا' صفحہ ہستی سے مٹانا عین عبادت اور جہاد ہے اللہ کی راہ میں مرنے والا شہید اور جنت کا حقدار ہوتا ہے اس کی سفارش پر رب العزت ان کے ماں باپ کو بخش دے گا۔''

''چھوٹے بڑے ان کے پند و نصاح میں

Digitized by Google

آمنا وصدقنا سر جھکائے رکھتے ہیں۔ جلد اُن کی باتوں میں آجاتے ہیں بہت متاثر ہوتے ہیں وہ سب صحیح ہے جو استاد کہتا ہے ان کا ہر حکم ماننے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں ہر مشن کے لیے کمربستہ رہتے ہیں اب حربی ٹریننگ شروع ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہتھیاروں کی شناخت کرائی جاتی ہے۔ روسی کلاشنکوف' چائنا کلاشنکوف' درہ سے بنی کلاشنکوف' انہیں لوڈ کیسے کیا جاتا ہے چلایا کیسے جاتا ہے۔''

''مختلف ممالک کے خطرناک پستول' بریٹا (برطانیہ) لوگر (جرمنی) لامہ (اٹلی) یونیک (فرانس) 9.M (چائنا) کے بارے میں آگاہی دی جاتی ہے۔ مختلف کیلبر کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ 25 بور' 30 بور' 32 بور' 38 بور' ان سے نشانہ بازی کرائی جاتی ہے۔ 15/20 فٹ دور خالی بوتلوں پر نشانہ ہوتا ہے بعد ازاں گاڑیوں میں بیٹھ کر..... گھوڑوں پر سوار ہوکر ان بوتلوں کو نشانہ پکا کرنے کے لیے شوٹ کیا جاتا ہے۔''

''لڑائی بھڑائی' جوڈو کراٹے' مختلف داؤ پیچ سمجھائے جاتے ہیں۔ 30/35 فٹ اونچی چٹانوں' ٹیلوں سے کودنا بتایا جاتا ہے پیراکی' ان ڈور/ آؤٹ ڈور کھیل کرائے جاتے ہیں ان کی ٹریننگ بہت سخت ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں کمانڈوز بنائے جاتے ہیں۔ ٹریننگ دینے والے اکثر سینٹرل ایشیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخر میں 50/60 فٹ کے فاصلے پر سورج کے مخالف اونچے ٹیلے پر 2/3 کا شیشہ رکھا جاتا ہے جو سورج کی روشنی سے چمک رہا ہوتا ہے۔ اسے مختلف ہتھیاروں (303) سے نشانہ بنایا جاتا ہے۔''

'یہ کچھ کرنے کے بعد زندہ مرغی دی جاتی ہے ایک ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن مروڑنے کا ظالمانہ عمل ہوتا ہے اس سے بے رحمی اور دلوں کو مضبوط کرنا مقصود ہوتا ہے۔

آخر میں بارود بھری جیکٹس/ ہینڈ گرینڈ کے استعمال سے آگاہی دی جاتی ہے۔ جیکٹ کی اندرونی بیرونی جیبوں میں بارود' گرینڈ' چھرے بھرے ہوتے ہیں انہیں ایک دوسرے سے مضبوط تاروں سے منسلک کیا جاتا ہے۔ یہ تار دونوں بغلوں میں ایک اسپرنگ سے بندھی ہوتی ہے دونوں بازوؤں کو بلند کرنے سے اسپرنگ میں کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے یوں پھر دھماکہ..... اگر دھماکہ کرنے والا ڈر جائے ارادہ بدل جائے یا کوئی وجہ ہے تو 15/20 فٹ کے فاصلے پر اسے کور کرنے والا موجود ہوتا ہے جو ریموٹ کنٹرول سے بٹن دبا کر اس کارروائی کو مکمل کرتا ہے۔''

''مشن کی تکمیل کے لیے ان کا چناؤ کیا جاتا ہے امیدوار بخوشی اپنے آپ کو خونی واردات کے لیے پیش کرتے ہیں انہیں کسی قسم کا ڈر خوف نہیں ہوتا۔ دھماکے میں اپنے آپ کو پیش کرنے والے اپنی اولادوں کو تیار کرنے والے پانچ قسم کے ہوتے ہیں۔''

1) پیسوں کے لالچ میں' بے روزگار' مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے' قرض میں پھنسے ہوئے کوئی ذریعہ آمدن نہ رکھنے والے۔

2) خطرناک دھمکیوں کے پیش نظر' یعنی اگر اپنے بھائی' بیٹے یا کسی اور فرد کو نہ دیا تو گھر اور کینوں کو تباہ کیا جائے گا۔

3) اگر کسی کا باپ' بیٹا' بھائی کسی قانونی گرفت میں آکر مارا گیا تو اس کا بدلہ لینے کو تیار۔

4) برین واشنگ' ہپناٹائزنگ' مسمریزم دیگر عوامل.....

5) جنت کی چاہت' شہادت کی موت اور

Digitized by Google

طلب میں ہمہ وقت جہاد کے لیے تیار۔

''اب مجھے واردات کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ مجھے گاڑی میں بٹھا کر بذریعہ تورخم' جمرود' حیات آباد' یونیورسٹی روڈ' شعبہ بازار قصہ خوانی لایا گیا۔

وہاں ایک ہوٹل میں کسی نامعلوم شخص کے نام سے کمرہ بک تھا۔ مجھے ایک جھولا (بچوں کے اسکول کا بستہ نظر آنے والا) دیا جس میں پندرہ عدد ہینڈ گرینڈ تھے۔ بھاگتے ہوئے ہاتھ میں لے کر ان کے پن نکالنا تھا دور پھینکنے سے زور دار دھماکا ہوتا اور پھر تباہی و بربادی شروع ہوتی۔''

''جیکٹ کے مقابلے میں یہ بہت خطرناک عمل تھا (جیکٹس وہاں کی مقامی عورتیں اُجرت پر تیار کرتی ہیں) جیکٹ میں صرف بازوؤں کو بلند کرنا ہوتا ہے یا ریموٹ کنٹرول کے ذریعے بٹن دبانا ہوتا ہے۔ جس سے صرف ایک منٹ میں دھماکا ہوتا ہے۔''

''قصہ خوانی بازار موقع واردات پر پہنچایا گیا گاڑی اُتار کر روانہ ہوئی۔ میں نے کارروائی کا آغاز کیا تین سینما برابر میں بنے تھے ان کے آگے مختلف دکانیں تھیں جن کو میں نے نشانہ بنانا تھا۔ پہلا گرینڈ پن نکال کر پھینکا زوردار دھماکا ہوا چیخ و پکار ہونے لگی اور زخمی حالت میں گرنے لگے۔ سینماؤں کے شوز ٹوٹ گئے میری کارروائیاں شروع تھیں۔''

''لوگ تتر بتر ہونے لگے میں بھاگتا جارہا تھا۔ ہینڈ گرینڈ اچھالتا جارہا تھا۔ لاشیں گرتی جارہی تھیں۔ آخری گرینڈ میرے ہاتھ سے گر گیا پن نکل چکا تھا۔ وہیں پھٹ گیا جس سے میرا آدھا پیٹ پھٹ گیا تھا۔

زخمی حالت میں گر گیا آرمی' پولیس آچکی تھی زخمیوں کو طبی امداد کے لیے ہسپتال روانہ کررہے تھے فوراً مجھے زخمی حالت میں گرفتار کیا اس جان گسل المیہ میں پچیس بے گناہ جاں بحق ہوئے درجنوں زخمی ہوئے۔ آگے کا حال آپ جان چکے ہیں۔'' ناصر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے رونے کی کیفیت میں کہنے لگا۔

''صاحب..... آپ نے میرا بہت خیال رکھا' مجھ جیسے ظالم' شقی القلب دہشت گرد کو مان سمان دیا میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔''

''نہیں ناصر میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں جان چکا تھا کہ تمہارا ضمیر جاگ چکا ہے۔ پچھتاوا عیاں تھا' آگے کیا ہوتا ہے یہ میرے مالک کی مرضی۔''

آخری تاریخ کو جاتے وقت وہ مجھ سے ملا تھا اس کے لبوں پر ایک مصرعہ تھا۔

''اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے۔''

فیصلے کے دن عدالت میں لوگوں کو جم غفیر تھا۔ ناصر کو ہتھکڑیوں سمیت پیش کیا گیا وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا اپنی تقدیر کے فیصلے کا منتظر تھا۔

جج صاحب نے فیصلہ شروع ہی کیا تھا کہ دھپ کی آواز آئی کٹہرے میں کھڑا ناصر زمین پر گر گیا منہ سے خون کی الٹیاں شروع ہوئیں اس کا پیٹ دولخت ہوگیا تھا اور چند ہی لمحوں میں سانس کی ڈوری نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا وہیں عدالت میں موت کی آخری ہچکی لی وہ مر گیا۔

جج صاحب نے اس کی فائل پر لکھا۔

''Case Is Suspeded File Closed'' ناصر دنیا کی عدالت میں تو بچ گیا لیکن قدرت کے قانون کی گرفت سے نہ بچ سکا۔

نہ جا اس کے تحمل پہ کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ سخت ہے انتقام اس کا

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

قبولہ شریف سے بھیجی گئی سچی کہانی

جیسی کرنی ویسی بھرنی

پتہ نہیں انسان یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے اور یہاں کیے گئے ہر عمل کا حساب یہاں بھی دینا ہے اور وہاں بھی..... شیراز کو بھی یہ بات سمجھ آ گئی تھی مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی.....

فیصل مشتاق

یوں تو سبھی رشتے بہت انمول اور ایک دوسرے کے لیے اہمیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی خونی اور ماں جائے رشتوں کے علاوہ بھی ایسے رشتوں سے واسطہ پڑتا ہے جو اپنوں سے بھی بہتر اور منفرد کام سرانجام دیتے ہیں اور وہ بھی خونی رشتوں میں اپنا نمایاں مقام بنا لیتے ہیں اور انسان انہیں بیکراں عزت و مقام دیے بغیر نہیں رہ رکھا۔

دوستی جیسا عظیم اور منفرد رشتہ بھی پاکیزہ اور انمول ہوا کرتا ہے اور دوست بھی اس رشتے کو نبھاتے ہوئے اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ وہ اپنی دوستی پر جان تک داؤ پر لگا دیتے ہیں اور پھر دوستی سدا مثال بن کر زندہ رہتی ہے اور اگر.....! رشتوں میں لالچ، حرص، طمع سما جائے تو یہی مقدس اور انمول رشتے اہمیت گنوا دیتے ہیں۔ پھر خونی رشتوں اور دوستی کے رشتوں میں اتنے بڑے خلا حائل ہو جایا کرتے ہیں جو عمر بھر کی معافیوں، ریاضتوں اور سرنگوں کرنے سے بھی پر نہیں ہو سکتا۔

''عادل..... اوئے عادل.....!'' شیراز نے دونوں ہاتھوں کو منہ سے جوڑ کر بلند آواز لگائی۔

عادل جو کہ نہر میں پتھر پھینک رہا تھا ایک ٹک شیراز کی طرف دیکھتا رہا پھر بددل ہو کر دوبارہ پتھر پھینکنے لگا۔ شیراز کوئی جواب نہ پا کر دوڑ لگاتا ہوا عادل کے پاس پہنچا۔ سورج کی تپش اپنے عروج پر تھی۔ پرندے گرمی کی حدت سے کوسوں دور گھونسلوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ایسے میں گرمی کی شدت سے تنگ آتا عادل نہر کنارے آ کر بیٹھ گیا۔ جب کبھی وہ اُداس ہوتا نہر کنارے آ کر بیٹھ جاتا اور کنکر اور پتھر ایک ایک کر کے نہر میں پھینکنے لگتا۔ جانے کیوں ایسا کرنا اسے اچھا لگتا تھا۔

''کیا یار..... کب سے آواز دے رہا ہوں وہاں درخت کی چھاؤں میں بیٹھے تم یہاں پتھروں سے کھیل رہے ہو۔'' شیراز نے منہ بسورتے ہوئے پوچھا۔ عادل تھوڑی دیر تو خاموش رہا پھر

Digitized by Google

اچانک خاموشی کا تالا توڑا۔

''یار شیراز تمہیں معلوم ہے میرا پڑھنے کو جی نہیں چاہتا ابا جی کے جانے کے بعد گھر والوں کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بس یار..... اب میں کوئی کام کرنا چاہتا ہوں..... میں اپنی ماں اور بہن کو یوں لوگوں کے گھروں میں کام کرتا نہیں دیکھ سکتا۔'' عادل نے سرد آہ بھری۔

''عادل تم میرے بچپن کے دوست ہو تمہارے حالات سے بخوبی واقف ہوں میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا پڑھائی چھوڑو اور کام ڈھونڈو اب تم فکر مت کرو میں کوئی کام ڈھونڈ لوں گا۔ پھر ہم دونوں مل کر کام کریں گے۔'' شیراز نے مسکراتے ہوئے عادل کے کندھے پر تھپکی دی۔

عادل اور شیراز بچپن کے دوست تھے اسکول میں پہلی ملاقات میں ہی دوستی ہوگئی ایک ہی گاؤں کے باسی تھے تو اکٹھے پلے بڑھے نویں جماعت میں شیراز نے بددل ہوکر اسکول چھوڑ دیا۔ پڑھائی کو جی نہ کرتا اس لیے اس نے اسکول کو خدا حافظ کہہ دیا۔ عادل کے ابا کو فالج کا عارضہ تھا۔ زندگی نے طویل ساتھ نہ دیا تو سب کو روتا چھوڑ کر چل بسے۔ اب ساری ذمہ داری عادل پر تھی۔ گھر میں ماں بہن اور عادل رہ گئے۔ ماں اور بہن لوگوں کے گھروں میں کام کرتیں ماں کو دن رات یہی امید رہتی عادل پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے گا تو وہ سکھ کا سانس لے گی۔

شیراز کا ایک واقف شہر میں رہتا تھا۔ اس نے کئی بار شیراز کو شہر آنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا وہ شیراز کو اچھا روزگار اور مناسب تنخواہ بھی دے گا۔ اس مرتبہ پھر اس کی طرف سے کال آئی تو شیراز مطمئن ہوگیا۔ شیراز نے فیصلہ کیا وہ عادل کو بھی شہر لے جائے گا پھر وہ دونوں بے

URDU TUBE

Digitized by Google

روزگاری سے نجات پاکر اچھا روزگار حاصل کرلیں گے۔ اچھے روزگار سے گھر کے حالات بھی قدرے بہتر ہوجائیں گے۔

''نوکری' تنخواہ' رہائش سب اس کی ذمہ داری ہے وہ ہمیں سب فراہم کرے گا مگر ہمیں پوری توجہ اور ایمانداری سے کام کرنا ہوگا۔'' شیراز نے عادل کو آگاہ کیا۔

شیراز بچپن سے والدین کے سائے سے محروم رہا چچی اور چچا کے مظالم سہتا رہا جب کبھی کھانا نہ ملتا تو وہ عادل کے گھر آجاتا عادل کی ماں اسے بیٹے جیسا پیار کرتی۔

''عادل یار مان جاؤ ہماری قسمت چمک رہی ہے پھر اب مسئلہ کیا ہے۔'' جلد ہی شیراز نے باتوں باتوں میں عادل کو قائل کرلیا اب بس اماں سے اجازت لینا باقی تھا۔

''یہ لو عادل بیٹا.....!'' اماں نے سوٹ عادل کی جانب بڑھایا تو اس نے غصے سے سوٹ کو زمین پر پھینک دیا۔

''اماں کتنی بار کہا ہے لوگوں کے گھروں سے کپڑے مت لایا کرو مجھے کسی کی اترن نہیں پہننی میں تنگ آگیا ہوں۔'' وہ چڑ کر بولا۔

اماں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ہم غریبوں کے حصے میں جو بھی آتا ہے اسے غنیمت جانو۔''

''بس اماں میں شہر جاکر کوئی کام ڈھونڈ لوں گا اب تم فکر مت کرو۔'' عادل نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

''عادل تم اپنی تعلیم پر توجہ دو تمہیں نہیں معلوم تمہارے لیے کتنے خواب دیکھے ہیں پڑھ لکھ کر بڑے افسر بنو گے تو سکھ کا سانس آئے گا یہ کیسی باتیں کرنے لگے ہو۔''

''اماں یہ عجیب باتیں نہیں ہیں شہر جاکر کام ڈھونڈوں گا تب ہی پیسہ آئے گا روز کی روکھی سوکھی نہیں کھائی جاتی میں اپنی محنت سے کما کر کھانا چاہتا ہوں اور اس میں حرج ہی کیا ہے۔'' عادل باتیں سناتا کمرے سے باہر نکل گیا اور ماں حیرت سے دیکھتی رہی۔

''شاباش عادل تم نے ثابت کردیا تم میرے اچھے اور مخلص دوست ہو تمہارے شہر جانے کا فیصلہ مجھے بہت پسند آیا آخر کار تم نے میرے مشورے پر عمل کیا اب تیاری کرلو ہم جلد ہی شہر کو نکلیں گے۔'' شیراز نے عادل کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور مسکرانے لگا۔

عادل کھانا کھا رہا تھا۔ ماں عادل کو دیکھتے ہوئے رونے لگی۔ عادل نے ماں کے نزدیک آکر رونے کی وجہ پوچھی۔

''اماں کیوں روئی ہو؟''

''میرے بچے میں تمہیں شہر جانے کی اجازت تو دیتی ہوں مگر وہاں تم اپنا خیال کیسے رکھو گے بڑے شہروں کے بڑے لوگ..... جانے تم وقت پر کھاؤ گے یا نہیں بس یہی فکر لاحق ہے۔'' اماں نے عادل کے ماتھے پر بوسہ دیا ماں کی گود میں بیٹھا پیار سے مسکرایا۔

''اماں تمہیں معلوم ہے میں اکیلا نہیں شیراز بھی میرے ساتھ ہے وہ میرا بھائی زیادہ دوست کم ہے وہ میرا خیال رکھے گا شہر جاکر کسی قسم کی پریشانی نہیں ہونے دے گا تم بس یقین رکھو۔''

''میں جانتی ہوں بیٹا مگر ماں کا دل ہے اولاد کا چہرہ نہ دیکھے تو کہاں سکون آتا ہے میں اور چھوٹی حرا تمہیں یاد کریں گے۔'' وہ ماں کے گلے لگ گیا اور اس کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

صبح کا آفتاب عادل اور شیراز کے لیے نئی

Digitized by

امید لے کر چکا تھا۔ آج وہ شہر کی رونقیں دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ اپنا سامان بیگ میں رکھ رہا تھا اچانک شیراز کی آواز بلند ہوئی۔

''اوئے شیر جلدی کر۔'' وہ سیدھا کمرے میں گھس گیا۔

''السلام علیکم خالہ جان.....!'' اس نے سلام کیا اور پھر عادل کی طرف بڑھ گیا۔

''وعلیکم السلام.....!'' اماں نے دست شفقت سے اس کے سر پر پھیرا۔

''شیراز بیٹا تمہیں معلوم ہے تم اور عادل میرے لیے ایک جیسے ہو میں نے کبھی کوئی فرق نہیں رکھا پھر میں نے کبھی تمہیں ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میں تمہیں بھی اتنا ہی یاد کروں گی۔ جتنا عادل کو بس ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑنا کوئی بھی مصیبت آئے ہمیشہ ساتھ رہنا۔''

''جی خالہ جان.....! میں آپ کی باتوں پر ضرور عمل کروں گا۔''

''کیا باتیں چل رہی ہیں؟'' عادل بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے آیا۔

''کچھ نہیں شہزادے تو کتنا تیار ہوگا..... ماڈلنگ نہیں کام پر جا رہے ہیں۔''

''ارے واہ اب میں تیار بھی نہیں ہو سکتا شہر کے لوگ بھی تو مجھے دیکھیں گے۔'' شیراز اور اماں نے قہقہہ بلند کیا۔ پھر اماں شیراز اور عادل کے لیے ناشتہ لے کر آئیں دونوں نے جی بھر کر ناشتہ کیا۔ روانگی کا وقت آ گیا اماں نے دونوں بیٹوں کو پیار کیا اور ڈھیروں دعائیں دے کر رخصت کیا۔ چھوٹی حرا بھی عادل کو دیکھ رہی تھی۔ عادل نے بہن کو گلے سے لگا لیا آنسوؤں کی لڑی رخساروں پر بہہ گئی۔ پھر اللہ کا نام لیتے وہ دونوں ٹرین پر شہر کے لیے روانہ ہو گئے۔ ٹرین کا سفر بہت مزے کا رہا۔ کچھ گھنٹوں کی مسافت کے بعد وہ شہر پہنچے ان کے استقبال کے لیے خان پہلوان کھڑا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں نیلی آنکھیں اور بالکل بدمعاشوں جیسا حلیہ تھا۔ پہلوان انہیں فلیٹ پر لے گیا۔

شیراز اور عادل نے شاید بچپن میں کبھی شہر دیکھا ہو۔ دونوں شہر کی رونقیں اور چہل پہل دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شہر کی رونقیں دیکھ دیکھ کر ان کی آنکھیں تھک گئیں۔

''تم دونوں فی الحال آرام کرو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور بتانا۔'' خان پہلوان نے مخصوص انداز میں کہا اور چل دیا۔

''عادل یار..... یہاں کتنا مزہ ہے کتنی چہل پہل ہے۔'' شیراز نے کہا تو عادل بھی شیخی سے بولا۔

''ارے پاگل..... اب ہم بھی اس چہل پہل کا حصہ ہیں ہم بھی تو شہری بابو ہیں۔'' پھر دونوں زور سے ہنسے اور ستانے لیٹ گئے۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد خان پہلوان حاضر ہوا۔

''شیراز تم نے اچھا کیا شہر آ گئے یہاں تمہیں بہترین روزگار اور تنخواہ دی جائے گی۔''

''ہاں مگر خان بھائی ہمیں کام تو بتایئے؟''

''ضرور.....'' خان پہلوان نے مخصوص انداز میں سر ہلایا۔

''تم دونوں کو مخصوص سامان دیا جائے گا جو ڈبوں میں پیک شدہ ہوگا اسے مختلف جگہ پہنچانا تمہاری ذمہ داری ہے مگر ہاں..... تمہیں اپنی پہچان چھپا کر رکھنی ہوگی چہرے کے گرد ہمیشہ رومال ہونا چاہیے۔ تنخواہ پانچ ہزار دی جائے گی..... کام آسان ہے اور تنخواہ بھی زیادہ جلد فیصلہ کر کے بتا دو مجھے انتظار رہے گا۔'' دونوں نے

Digitized by Google

ایک دوسرے کو پُرتجسس نگاہوں سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے خان بھائی ہم آپ کو کچھ دیر میں فیصلہ کر کے بتا دیں گے۔'' عادل پریشان ہو گیا۔

''یار شیراز ..... مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا کہیں یہ کوئی غلط سامان پہنچانے کا کاروبار تو نہیں؟'' شیراز نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ارے بے وقوف یہاں شہر میں جانے کتنی فیکٹریاں اور کمپنیاں ہیں ہمیں تو معلوم بھی نہیں' معقول سے زیادہ تنخواہ ہے خواہ مخواہ شک مت کرو یہ انہی کمپنیوں کا سامان ہے جو شاید دوسروں تک پہنچانا ہوگا۔'' شیراز نے عادل کو بھی قائل کرلیا۔ پھر دونوں نے خان کو ہاں کر دی اور باقاعدہ طور پر کام شروع کر دیا۔

خان کے فلیٹ میں اور بھی لوگ رہتے تھے جو مختلف شہروں سے تعلق رکھتے تھے اور خان کے ہاں ہی ملازمت کرتے تھے۔ شیراز اور عادل صبح جاتے اور رات کو تھکے ہارے واپس آتے۔ وقت گزرتا گیا۔ شہر آئے انہیں ایک مہینہ ہو گیا۔ آج انہیں پہلی تنخواہ ملی تو دونوں خوشی کے مارے جھومنے لگے۔ پھر انہوں نے مشہور ہوٹل سے کھانا کھایا اور خوب مزے کیے۔

''ہم کل ہی گاؤں جائیں گے۔'' عادل نے کہا۔

''ڈیوٹی سخت ہے کوئی چھٹی نہیں مل سکتی کام کرنا ہے تو باقاعدگی سے کرو ورنہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو۔'' خان پہلوان نے دونوں کو غصے سے گھورا۔

''عادل تم گھر پیسے بھجوا دو۔'' شیراز نے اسے کہا تو اسے تسلی ہوئی۔

''ہیلو..... السلام علیکم.....! اماں کیسی ہو..... حرا کیسی ہے؟'' عادل نے ماں کو فون کیا تھا۔

''ہم دونوں تو ٹھیک ہیں بیٹا مگر تم کیسے ہو..... کھانا وقت پر کھاتے ہو؟ زیادہ کام تو نہیں کرتے؟ آرام بھی کرتے ہو یا نہیں۔'' دوسری طرف اماں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ عادل کو بولنے کا موقع نہ ملا۔ عادل مسکرایا اور بولا۔

''سب ٹھیک ہے۔''

''اماں میں پیسے بھجوا رہا ہوں مل جائیں تو اطلاع ضرور کرنا۔''

''ٹھیک ہے مگر.....''

''مگر کیا.....؟''

''تم کب آؤ گے میرے بیٹے؟'' اماں کے لہجے میں اُداسی اور نمی تھی۔ آواز بھی مدھم ہو گئی۔

عادل کچھ دیر کو ساکت کھڑا رہا۔ دل تو اس کا بھی اُداس تھا ماں اور بہن کی یاد اسے تڑپا رہی تھی۔ کبھی راتوں کو رو تو خود ہی چپ ہو جاتا مگر ماں کی بھیگی آواز سن کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اس کی آواز مدھم ہو گئی۔ وہ تڑپتے ہوئے بولا۔

''جلدی آؤں گا اماں.....!'' کہتے ہوئے وہ رو پڑا اور فون بند کر دیا۔ پلکوں کے بند توڑ کر آنکھوں سے آنسو رواں دواں تھے۔

گھر والوں کی یاد بھی کیسا عذاب ہوتی ہے نا..... یہ تڑپ تو صرف پردیسی ہی محسوس کر سکتے ہیں پرندے جتنی دور بھی مسکن بنالیں مگر وہ شام کو گھروں کو لوٹ جاتے ہیں مگر پردیسی کا گھر جانا خواب بن جاتا ہے پل پل اسے گھر کی یاد ستاتی ہے دل تڑپنے لگتا ہے اپنوں کی یاد میں دل روتا ہے پھر کتنی مجبوریاں آڑے آجاتی ہیں دل جدائی میں رونے لگتا ہے اور آنسو پانیوں کی صورت بہنے لگتے ہیں۔

عادل روتا ہوا آنسو پونچھ رہا تھا شیراز نے

Digitized by Google

اسے گلے لگالیا اور پھر اس کے پیٹ میں گدگدی کر کے خوب ہنسایا۔ کافی دیر تک وہ خوب مستی کرتے رہے۔ عادل اور شیراز خوب محنت سے کام کرتے' آج گرمی کی شدت زیادہ تھی۔ ڈیوری کے زیادہ چکر لگانے کے باعث شیراز تھک چکا تھا۔ اس نے سوچا کچھ دیر فلیٹ جا کر آرام کرلے وہ فلیٹ پہنچا اور آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹ گیا۔ شیراز ابھی پکی نیند میں ہی تھا کہ کسی کے لڑنے کی آوازیں آنے سے اس کی نیند بگڑ گئی۔ ان میں سے ایک جانی پہچانی آواز جو کہ خان پہلوان کی تھی۔ شیراز کا دل چاہا کہ انہیں خوب سنائے مگر وہ لیٹا رہا۔ آوازیں اور بلند ہوئیں تو وہ اٹھ گیا اور خان پہلوان کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ اندر داخل ہونے ہی لگا تھا اس سے پہلے جو کچھ اس نے سنا تھا سن کر اس کا دل دہل گیا۔

'' بکواس بند کرو اس کاروبار میں 60 فیصد میرا ہے باقی 40 فیصد تیرا ہے اور اس کے علاوہ یہ بزنس میرے باس کی سرپرستی میں ہے تمہیں تمہارا معاوضہ بالکل ٹھیک دیا جارہا ہے فضول کی بحث مت کرو ورنہ تمہیں معلوم ہے میرے لیے انسانوں کی جانوں کی کوئی قیمت نہیں ابھی تجھے گولی سے اڑادوں گا۔ فضول کی بحث سے میرا اور اپنا وقت برباد کرنے کی بجائے سوچو وہ دو بیوقوف شیراز اور عادل صحیح کام کررہے ہیں یا نہیں انہیں ہمارے کام کی بھنک بھی لگ گئی تو بہت برا ہوگا انہیں کبھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نشہ آور ادویات اور انسان فروشی کا کاروبار کرتے ہیں۔''

شیراز کے پاؤں تلے زمین نکل گئی اسے لگا شاید وہ کسی گڑھے میں گرتا چلا جارہا ہو خان پہلوان کی اصل حقیقت آشکار ہوچکی تھی۔

'' خان صاحب جب مجھے 50 فیصد دیا جائے گا تب ہی نیا بندہ لاؤں گا جو اپنی مرضی سے ہمارے کام میں ملوث ہو۔'' دوسرے آدمی نے خان کو کہا۔

'' ذلیل انسان جلد از جلد نئے آدمی کو لاؤ کیوں کاروبار کو ٹھپ کرنے پر تلے ہو۔''

'' اچھا..... میں جلد نیا آدمی لے کر حاضر ہوں گا۔''

'' تمہیں معلوم ہے اس سودے والے کام میں ہمیں کتنا نفع ہے ہم کروڑوں کے بادشاہ بن سکتے ہیں میرے یار انسانوں کے سودے کی قیمت میں الگ ہی مزہ ہے۔''

خان پہلوان کے لہجے سے لالچ جھلک رہا تھا۔ شیراز کا پورا سر گھوم گیا اس نے خان پہلوان کو کتنا اچھا انسان سمجھا تھا خان پہلوان مختلف گاؤں سے لڑکے بلوا کر انہیں کام پر رکھواتا تھا مگر اس کی حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک بہت بڑا منشیات فروش ہونے کے ساتھ ساتھ انسانوں کی خرید و فروخت بھی کرتا تھا۔

شیراز کا غصہ آسمان کی حدوں کو چھو رہا تھا وہ بے قابو ہو کر کمرے میں داخل ہوا اور خان کی گردن دبوچ لی۔ خان پہلوان ہکا بکا رہ گیا پھولتے سانس کے ساتھ خان نے شیراز کو پیچھے دھکیلنے کی ناکام کوشش کی۔ سامنے کھڑے دوسرے انسان فروش درندے نے شیراز کو پکڑ لیا اور زور سے زمین پر دھکا دیا۔ دونوں نے شیراز کو تھام لیا۔

خان پہلوان شیطان ہنسی ہنسا۔ اُس کی آنکھوں سے شیطانیت ٹپک رہی تھی۔

'' اچھا تو لڑکے نے ہماری باتیں سن لیں۔'' وہ زور سے ہنسا۔

Digitized by Google

''خان میں تو کہتا ہوں اس کو یہیں ختم کردو۔'' دوسرے آدمی نے شیراز کو زور سے پکڑ رکھا تھا۔ خان پہلوان نے آگے بڑھ کر شیراز کے گال پر زوردار تھپڑ مارا۔

''تجھے ہمارے اس کھیل کا پتہ چل گیا۔ چل تیرے مرنے سے پہلے اقرار کرتا چلوں۔'' اس نے الماری سے پستول نکالا اور اس میں گولیاں بھرنے لگا شیراز کی آنکھوں میں موت اور خوف کے سائے منڈلانے لگے۔

اسے یہ زندگی کی آخری گھڑی لگ رہی تھی اس نے امیر بننے کے کتنے خواب دیکھے تھے یوں پل بھر میں سب ختم ہوجائے گا اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

''ہم لوگ منشیات مختلف جگہوں پر پہنچاتے تھے۔ وہاں ہمارے آدمی آگے سامان کو ٹرانسفر کردیتے تھے جہاں منشیات کی بہت بڑی فیکٹری ہے بیرون ملک سے مال برآمد ہوتا ہے اور پاکستان کے مختلف شہروں میں فراہم کیا جاتا ہے۔ مختلف نوجوان لڑکوں کو خرید و فروخت کیا جاتا ہے اور انہیں بیرون ممالک بھیج کر کام کروایا جاتا ہے۔ برسوں سے ہمارا یہی دھندا چلا آرہا ہے اور اب تُو گاؤں کا چھوٹا موٹا لڑکا ہمارا دھندا بند کروائے گا؟ اس سے پہلے میں تیری آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کردوں گا۔''

''بدذات انسان اللہ کے قہر سے ڈر و کس گناہ کے کام میں لگے ہو چھوڑو مجھے جانے دو۔'' وہ خود کو چھڑانے لگا۔

خان پہلوان نے پھر شیطانی ہنسی سجائی اور اُسے ٹھوڑی سے پکڑتے ہوئے بولا۔

''لڑکے تمہاری موت کے علاوہ کوئی حل نہیں اب تُو ہمارے کسی کام کا نہیں اور جو لوگ میرے دھندے میں ٹانگ اڑاتے ہیں ان کا حل موت ہی ہوتا ہے۔'' اس نے بندوق تیار کی اور شیراز کے ماتھے پر رکھ دی۔ بندوق کا اچھا خاصا وزن شیراز کو محسوس ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی جیسے فوراً باہر آجائے جسم پسینے سے شرابور تھا۔ خوف کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھوں کے آگے کئی خواب منڈلانے لگے۔ اسے کسی بھی قیمت پر امیر بننا تھا پھر وہ یوں موت کو کیسے قبول کرسکتا تھا۔

''مجھے مت مارو..... میں جینا چاہتا ہوں۔'' حلق سے کمزوری سی آواز برآمد ہوئی خان پہلوان نے قہقہہ بلند کیا۔

''کیوں چھوڑ دیا جائے؟ تاکہ تم ہماری خبر پولیس کو دے کر ہمیں ہمیشہ کے لیے جیل بھجوادو..... ویسے بھی تم ہمارے لیے کیا کرسکتے ہو؟ ہمارے دھندے میں شامل ہونے اور موت کے سوا تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں بچتا؟'' خان پہلوان نے غصے سے کہا۔

''تم میری جان بخش دو..... میں کچھ بھی کروں گا۔'' شیراز کی آنکھوں میں موت کا خوف صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''سوچ لو لڑکے.....'' دوسرے آدمی نے زور سے شیراز کا بازو موڑا تو وہ درد کے مارے چیخنے لگا۔

''چھوڑ دو اس کا بازو.....'' خان پہلوان نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

''تمہیں معلوم ہے ہمارے ساتھ رہنا مطلب منشیات کے کاروبار میں شامل ہونا اس میں عیاشی بھی ہے اور پیسہ تو بے پناہ ہے بس ذرا احتیاط اور عیاری سے چلا جائے اور پھر اگر ہمارے مطالبات پورے کرے گا تو جلد امیر بن

Digitized by Google

جائے گا۔'' خان پہلوان نے اسے کہا۔

اس کا امیر بننے کا خواب یوں سچ ہوسکتا تھا اس کے پاس موقع بھی تھا اور وقت بھی.....

شیراز نے پل بھر کو سوچا پھر لالچ کو اس کے من میں اترنے میں دیر نہ لگی۔ انسان کو جب لالچ کی بھوک لگ جائے تو کچھ اچھا نہیں لگتا یہ بھوک بڑھتی ہی چلی جاتی ہے لالچ کی یہ بھوک کبھی نہ کبھی پوری تو ہو جاتی ہے مگر ہمیشہ کی طرح اس کا انجام بھیانک ہی ہوتا ہے۔ پھر شیراز کے پاس کوئی دوسرا راستہ تھا بھی نہیں لہٰذا اُس نے فوراً فیصلہ کرلیا۔

''خان صاحب میں آپ کا تابع ہوں..... بولیے کیا کرنا ہوگا۔'' پل بھر میں بدلتے شیراز کو دیکھ کر خود خان پہلوان بھی حیران رہ گیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا جب پیسے کے خواب آنے لگیں تو انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ خان شیراز کے فیصلے پر خوش تھا۔ اب شیراز بھی اس دھندے میں ملوث ہو چکا تھا۔ لالچ نے اسے گوشت کے پیچھے بھاگنے والے کتے کی طرح بنا دیا تھا۔

''ہمارے ساتھ وفاداری کا ثبوت بھی دینا ہوگا فی الحال ہمیں 18 یا 20 سالہ نوجوان لڑکے کی تلاش ہے جسے اغوا کر کے جلد از جلد باہر بھجوانا ہے آج تمہارا امتحان ہے اور ہاں تمہاری مدد کے لیے میرا خاص بندہ راجہ بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔ اور ہاں اگر بھاگے یا کوئی ہوشیاری کی تو تیری لاش کے ٹکڑے کردوں گا۔'' خان نے اسے آگاہ کر دیا تھا۔ پھر تینوں نے مکاروں جیسا منہ بناتے ہاتھوں میں ہاتھ ملائے۔

شیراز رات بھر پیسوں کے بارے میں سوچتا رہا' اس کے رگ و پے پر پیسے کا خمار چھا چکا تھا۔ اب نیند بھی نہیں آتی تھی۔ وہ من ہی من میں خوش ہونے لگا۔ عادل نے شیراز کا مسکراتا چہرہ دیکھا تو وجہ پوچھی' شیراز نے بتایا وہ یوں ہی مسکرا رہا تھا وہ عادل کو کبھی یہ بات نہیں بتانا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عادل فطرتاً نیک اور سادہ ہے وہ کبھی بھی اس کام میں اس کا ساتھ نہیں دے گا۔

اگلی صبح شیراز نے بتایا کہ خان نے اس کا کام تبدیل کر دیا ہے اب وہ خان کی وین چلایا کرے گا۔ عادل کو جان کر بہت خوشی ہوئی اس نے شیراز کو مبارکباد دی اور دعا کی جلد خان اسے بھی مزید اچھی نوکری دے۔

آج شیراز اپنی وفاداری کا ثبوت دینے نکلا تھا۔ اس کے ساتھ خان کا خاص بدمعاش راجہ بھی ساتھ تھا۔

''چلیں بہادر سپوت؟'' اس نے شیراز سے پوچھا تو وہ اقرار میں سر ہلاتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راجہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا جبکہ شیراز ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ صبح سے شام ہوگئی مگر کوئی ہاتھ نہ آیا شیراز کو اپنے نکمے پن پر بہت غصہ آیا۔

''ارے واہ بہادر سپوت غصہ کرنے کی بجائے دماغ میں ترکیب لڑاؤ رات تک کسی کو اغوا نہ کیا تو خان پہلوان تیرا کیا حشر کرے گا؟'' شیراز کو یکدم خیال آیا اور وہ راجہ کو لے کر فٹ پاتھ کی جانب چل دیا۔

گاڑیاں تیزی سے ایک دوسرے سے آگے گزر رہی تھیں۔ شیراز نے اکیلے طالب علم کو گاڑی کے انتظار میں دیکھا تو موقع پا کر اس کے قریب پہنچا۔

''السلام علیکم.....!''

''وعلیکم السلام.....!''

''شہری بابو آپ سے ایک مدد چاہیے؟''

''کیسی مدد بھائی کہیے؟''

Digitized by Google

''دراصل میری ماں کی طبیعت بہت خراب ہے انہیں کینسر کی بیماری ہے میں روز کچھ رقم اکٹھی کرنے نکلتا ہوں آپ سے جتنا ممکن ہو میری مدد کردیں ساری زندگی احسان مند رہوں گا۔''

شیراز نے اسے باتوں میں الجھایا جیسے ہی شیراز نے آس پاس کسی کو نہ پایا زور سے اس کی ناک پر رومال رکھا اتنے میں تیزی سے گاڑی لے کر قریب آ گیا۔ دونوں نے لڑکے کو گاڑی میں ڈالا اور تیزی سے گاڑی دوڑا دی۔

شیراز کی مہارت اور وفاداری کا ثبوت پا کر خان پہلوان بے حد خوش ہوا۔ پھر تمام لوگوں نے شراب پی کر کامیابی کا جشن منایا۔

شیراز بھی نشے کا عادی ہو چکا تھا۔ اب وہ عادل کے سامنے بھی نشہ کرنے لگا تھا۔ عادل منع کرتا تو وہ عادل سے جھگڑنے لگتا دھیرے دھیرے اسے عادل سے نفرت ہونے لگی۔ شیراز کے لالچ نے اسے اندھا کر دیا اس کے لیے کسی رشتہ کے کوئی معنی نہیں رہے۔ وہ بدلحاظ اور بدزبان ہو چکا تھا عادل اچانک کمرے میں داخل ہوا تو شیراز کے ہاتھوں میں بھاری رقم دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

''عادل اتنی ساری رقم..... یہ تمہاری ہے؟''

''ارے نہیں یار یہ کسی کی امانت ہے۔'' عادل نے جواب دیا۔

''اس پرائے شہر میں تمہیں کون امانت دے گا جھوٹ مت بولو کیا ماجرہ ہے سچ بتاؤ تم نے کچھ دن پہلے مہنگا موبائل خریدا ہے تمہارے طور طریقے بھی بدلنے لگے ہیں آج کل مجھے تمہارے حالات کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' شیراز بدتمیزی کی حدود کو چھو گیا۔

''تم میری کامیابی سے جل رہے ہو تم میرے دشمن بن گئے ہو کیونکہ تمہیں حسد ہے خان نے مجھے اچھی نوکری دی اور اب معاوضہ بھی زیادہ دینے لگا ہے اور ہاں..... یہ رقم میں اپنی محنت سے کماتا ہوں ان پر گندی نگاہ نہ ڈالنا تجھے ایک روپیہ نہیں دوں گا۔''

اس وقت بھی شیراز شراب کے نشے میں چور تھا۔ شیراز اور عادل کی خوب لڑائی ہوئی۔ عادل اس کے برے رویے کی وجہ سے بے حد پریشان تھا۔ یہ وہی دوست تھا جس کے ساتھ وہ بچپن سے کھیلتا آ رہا تھا ہر خوشی غمی میں دونوں ساتھ تھے پھر شہر آنے سے پہلے دونوں نے ساتھ رہنے اور مصیبت میں ساتھ نبھانے کے وعدے کیے تھے۔

کتنے ماہ بیت چکے تھے ماں کی آنکھیں عادل کی یاد میں سرخ رہتیں۔ کبھی کبھار فون پر بات تو ہو جاتی مگر فون پر ملاقات تو نہیں ہوتی' اماں خوش تھیں کہ عادل کو اچھا روزگار ملا ہے تنخواہ بھی اچھی ہے اب اسے گھر بسا لینا چاہیے چنانچہ اس نے خوبصورت لڑکی عادل کے لیے ڈھونڈ لی تھی وہ عادل کی شادی کے خواب من میں سجائے بیٹھی تھی۔ سجاتی بھی کیوں نہ..... اکلوتے بیٹے کی شادی اس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

شیراز غصے سے پاگل ہوتا خان کے کمرے میں جا پہنچا اب وہ خان کا خاص الخاص آدمی بن چکا تھا۔ اس ماہ میں اس نے کئی اغوا کاریاں کر کے خان کا دل جیت لیا تھا۔ خان نے بے تحاشہ غصے کی وجہ پوچھی تو شیراز نے بتایا کہ عادل اس سے جلنے لگا ہے اب وہ اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا ہر بات میں ٹانگ اڑانا اس کا معمول بن چکا ہے جلد اسے ہمارے راز کے بارے میں علم ہو گیا تو بہت برا ہوگا مجھے عادل سے چھٹکارا چاہیے۔ تمہارے لیے بہتر ہے تم عادل کو نوکری سے نکال کر واپس گاؤں دفع کر دو۔'' شیراز

Digitized by Google

نے خان کو بتایا تو وہ سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور شیراز کے مدمقابل آ کر بیٹھ گیا۔

''ویسے میرے پاس ایک حل ہے۔'' خان نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

''کیا حل.....؟''

''سودا.....!''

''کس سودے کی بات کر رہے ہو خان؟'' شیراز نے سوچنے کے انداز میں کہا۔

''بہت بھولا ہے تو.....'' خان ہنسا اور پھر بتانے لگا۔

''دیکھ شیراز.....اس نوجوان عادل کا سودا بہت مہنگا ہوگا ایسے ہی نوجوانوں کی ہمارے باس کو ضرورت ہے اس کو اغوا کروا کے 20 لاکھ میں فروخت کر کے باہر کے ملک بھیجا جائے گا سوچ لے.....''

''20 لاکھ اور چھٹکارا.....دونوں میں تیرا مفاد ہے۔'' شیراز حیرت کے مارے خاموش ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

''عادل کا سودا..... عادل میرا بچپن کا دوست ہے..... عادل سے میرا رشتہ صرف دوستی کا ہی نہیں ہے وہ تو میرا بھائی ہے میں اپنوں کے رشتے کا سودا کر دوں؟ مگر عادل اسے کون سا کوئی فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی اب اس کا رویہ بدل گیا ہے وہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ اگر اتنا ہی مخلص یار ہے تو وہ بھی اس دھندے میں شامل ہو جاتا۔ نہیں..... میں اس سے چھٹکارا حاصل کروں گا بدلے میں مجھے 20 لاکھ ملیں گے.....پورے 20 لاکھ.....''

''خالہ کو تھوڑے بہت پیسے بھیج دوں گا اور کہوں گا عادل کہیں دور چلا گیا ویسے بھی ایسے رشتوں کا سودا کرنا ہی بہتر ہے جن سے کوئی فائدہ نہ ہو سب سوالوں کو جھٹکتے ہوئے اس نے لالچ کو ترجیح دی۔ اب وہ پوری طرح عادل کا سودا کرنے پر تیار ہو چکا تھا۔ اس نے خان کو ہاں کر دی پھر دونوں نے خوب شراب پی۔

''عادل.....! معاف کرنا یار تجھ سے جھگڑا کر لیا خیر یاروں میں بحث ہوتی رہتی ہے امید ہے تم غصہ نہیں کرو گے۔'' شیراز نے عادل سے معافی مانگی۔

''کوئی بات نہیں شیراز.....مگر تم شراب چھوڑ دو یہ سب ٹھیک نہیں اماں نے ہمیں ہر برے کام سے منع کیا ہے میری بات مانو یہ غلط کام چھوڑ دو۔'' شیراز کو یہ نصیحت بالکل فضول لگی پھر اس نے بھولے پن کا ڈرامہ شروع کر دیا۔

''یار میں نے خان سے بات کی ہے وہ ہمیں کل چھٹی دے گا میں بہت بور ہو چکا ہوں کل کسی پارک میں جا کر فریش ہوتے ہیں کیا ارادہ ہے؟'' عادل ہنسا اور پھر اقرار میں سر ہلا دیا۔

شیراز کا منصوبہ رنگ لانے والا تھا' اغوا کاری کی ذمہ داری راجہ اور کچھ نئے آدمیوں کے ذمے تھی۔

پارک میں لوگوں کی چہل قدمی جاری تھی۔ وہ دونوں پارک میں پہنچ چکے تھے۔

''تمہیں معلوم ہے شیراز کل جب میں نے امی سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ میرے لیے لڑکی دیکھی ہے بہت سلیقہ شعار اور بھولی ہے جانے وہ کیسی ہوگی؟'' اس نے سوچنے کے انداز میں کہا۔

''ہم نے وعدہ کیا تھا میری شادی پر خوب ہلہ گلہ کریں گے بس یار اب سوچتا ہوں کچھ رقم لے کر گاؤں چلا جاؤں وہاں اپنی چھوٹی سی دکان کھول لوں گا وہیں اپنا کاروبار کروں گا اب گاؤں جانے کو بہت جی چاہ رہا تھا اماں کو دیکھے بھی کتنے دن بیت گئے۔ وہ غمگین سا ہو گیا تو شیراز نے اُسے تسلی دی۔

''ارے فکر مت کرو.....تمہارے سارے

Digitized by Google

خواب پورے ہوں گے بس تھوڑا صبر رکھو تم ایسی جگہ پر جاؤ گے جہاں سکون ہی سکون ہوگا۔'' اس نے عیاری سے کہا پھر قہقہہ لگایا۔ عادل نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

'' میں مذاق کر رہا ہوں..... کتنے ڈرپوک ہو..... میں گاؤں کے سکون کی بات کر رہا ہوں۔''

پھر دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ مگر شیراز کے قہقہے کے پیچھے چھپی ہنسی خالص شیطانی تھی۔

''عادل شام ہوگئی چلو.....''

''کہاں.....؟''

''ارے بار اب کھانا کھانے چلتے ہیں..... مجھے ایک اچھے ریسٹورنٹ کا پتا ہے۔'' وہ دونوں چلتے چلتے پارک سے باہر آ گئے سڑک کے دوسری جانب آدمیوں نے شیراز کو اشارہ کیا۔

''اوفوہ..... عادل میں اپنا بٹوا تو پارک کے اندر ہی بھول آیا تم یہیں رکو..... میں ابھی بٹوا لے کر آتا ہوں۔''

عادل نے اقرار میں سر ہلایا اور کھڑا رہا۔ کچھ لمحے ہی بیتے تھے کہ اچانک عادل کے پاس ایک آدمی آیا کچھ پوچھ گچھ کے بعد اس نے عادل کی ناک پر رومال رکھا اور زبردستی گاڑی میں دھکیل دیا اتنے میں شیراز وہاں پہنچ چکا تھا اس نے سگریٹ سلگایا اور کش کے مزے لینے لگا۔

گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی گاڑی کے پیچھے شیشے سے وہ ہاتھ پاؤں مارتا مدد کے لیے پکارتا نظر آ رہا تھا اسے شیراز کے گھٹیا پن کا یقین تب آیا جب اس نے دور سے اسے بائے بائے کہا اور خاموشی سے مڑ گیا۔ وہ کتنی دیر مدد کے لیے پکارتا رہا بالآخر بے ہوش ہوگیا۔

'' شاباش.....'' خان نے اسے خوشی سے گلے لگا لیا۔ شیراز نے عادل کا سودا کر دیا اور خان پہلوان کے مطابق اُسے پورے 20 لاکھ مل چکے تھے وہ خوشی سے جھومنے لگا۔ اس کا امیر بننے کا خواب یوں سچ ہوگا اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔

عادل اپنی قسمت پر روتا رہا' کتنے دن' مہینے بیت گئے وہ جان چکا تھا کہ اسے اغوا کر کے باہر لایا گیا ہے اس کی زندگی ایک قید کے علاوہ کچھ نہ تھی اس نے شیراز کا مکروہ چہرہ دیکھ لیا تھا۔ غم اور بے بسی کے عالم میں وہ روتا پیٹتا مگر سب بے سود تھا..... بالآخر اس نے اسے قسمت کا لکھا اور دوست کی بے وفائی سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ شیراز گاؤں میں داخل ہوا تو فوراً عادل کے گھر گیا۔ عادل کی اماں نے دریافت کیا تو رونے لگا۔

''خالہ کیا بتاؤں..... عادل منشیات کا کاروبار کرنے لگ گیا تھا۔ اس نے مجھے بھی نہ بتایا پولیس کا چھاپہ پڑا تو وہ عادل اور اس کے گینگ کو گرفتار کر لے گئے۔'' شیراز نے رونے کا ڈرامہ کیا۔

اتنا سننا تھا کہ ماں کے سب خواب چکنا چور ہوگئے بے چاری بوڑھی ماں فوراً ہارٹ اٹیک سے اللہ کو پیاری ہوگئی۔ چھوٹی حراحویلی میں ہمیشہ کے لیے ملازمہ بن گئی۔ شیراز نے جانے کتنے رشتوں کا گلا گھونٹا تھا وہ سوداگر تھا..... قاتل تھا..... اس کے آگے رشتوں' احساس' جانوں کی کوئی قیمت نہ رہی' وہ امیر بننے کے لالچ میں بے حس اور اندھا ہو چکا تھا۔

شیراز اب گاؤں کا امیر ترین آدمی تھا۔ چچا چچی جو کبھی اس پر ظلم ڈھاتے تھے اب اس کے تابع ہو چکے تھے۔ اس کی امیری سے متاثر ہو کر خوبصورت لڑکی اس کے چنگل میں پھنس گئی اور یوں اس نے شادی رچا لی۔

کچھ سالوں بعد اس کے گھر میں ننھا پھول کھلا تو وہ بے حد خوش ہوا اسے اپنے بیٹے سے بہت پیار تھا۔ شیراز کے پاس بہت پیسہ تھا اس لیے اس

Digitized by

نے کوئی کاروبار نہ کیا اور یوں ہی کھاتا رہا۔

اکلوتا بیٹا اس کا لاڈلا تھا وہ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا وقت کسی کا محتاج نہیں دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا اور بیٹا جوان ہوگیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شیراز کی دولت بھی کم پڑگئی بیوی کو اس کے حالات کا علم ہوا تو اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ بیٹا بہت لاڈلا اور معصوم تھا۔ ایک دن زاہد نے فرمائش کی کہ وہ باہر شہر میں پڑھنا چاہتا ہے اسے گاؤں کے ماحول سے نفرت ہوچکی ہے وہ تھوڑی دیر کو سوچتا رہا اور بالآخر ہاں کردی۔ وہ بیٹے کو کسی بھی طرح ناراض نہیں دیکھ سکتا تھا۔ شیراز نے اسے شہر میں بہترین فلیٹ کرائے پر لے دیا۔ شہر جاکر زاہد بمشکل ہی پڑھ سکا نئے دوست بنے تو وہ بھی اُن کی طرح آوارہ ہوگیا۔ اسے پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔

شیراز کمزور ہوچکا تھا۔ اس کی ہڈیوں میں پہلے والی جان نہ رہی بیوی نے اسے لڑائی جھگڑے اور لعنتیں ملامتیں کرتے چھوڑ دیا تھا وہ کبھی کبھی عادل کے بارے میں سوچتا پھر خیال جھٹک دیتا ابھی وہ سوچتے سوچتے سگریٹ کے دھوئیں چھوڑ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور پھر اس خبر نے اسے دہشت زدہ کردیا۔

''انکل میں زاہد کا دوست ہوں ہم اکیڈمی سے واپس آرہے تھے اچانک کسی نے زاہد کو رومال سونگھایا اور زبردستی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔''

شیراز کا وجود ساکت ہوگیا۔ اس کے سامنے ماضی کا منظر گردش کرنے لگا جب اس نے عادل کو اغوا کروا کر سودا کروایا تھا اس کا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔ وہ کافی دیر اپنے ماضی کے گناہ کو سوچتا رہا کہ دوبارہ پھر کال آئی۔

کال اٹھائی تو اغواء کاروں کی آواز نے اس کی سماعتوں پر بم پھوڑ دیے۔

''50 لاکھ..... دے جا اور لڑکے کو لے جا ایڈریس تجھے بھیج دیا جائے گا..... اگر وقت پر رقم نہ ملی تو تیرے بیٹے کا سودا کرواتے ہمیں دیر نہیں لگے گی۔'' شیراز کا سر گھوم گیا اور وہ زمین پر گر گیا۔

شیراز کے پاس رقم نہ تھی۔ اس کے برے اور ظالمانہ رویے کی وجہ سے کوئی اسے ایک روپیہ دینے پر راضی نہ تھا۔ وہ بری طرح بے بس ہوچکا تھا۔ گھر بھی اجڑ گیا تھا اس کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ بیٹے کو چھڑوا سکتا وہ بے بسی کی تصویر بنا روتا رہا۔ ایک بار پھر کال موصول ہوئی۔

''ذلیل بے حس آدمی..... کیسا باپ ہے تو؟ تجھے بیٹے کی کوئی پرواہ نہیں..... مقررہ وقت ختم ہوا اور اب تیرے بیٹے کا سودا ہوچکا ہے۔'' شیراز یہ سنتے ہی زمین پر گر گیا۔ آنکھوں کے سامنے عادل دکھائی دینے لگا۔ آنکھوں کے آگے وہ منظر صاف گردش کرنے لگا جب عادل اس کی مدد کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور وہ خوشی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چیخنے لگا اور خود کو پیٹتے ہوتے رونا شروع کردیا۔

لالچ نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا اس نے دوست جیسے پاکیزہ رشتے کو لالچ کی خاطر تباہ کردیا۔ ماں کو جھوٹی خبر دے کر موت کے گھاٹ اُتار دیا اور آج قسمت اسے خطرناک موڑ پر لے آئی۔ اس کا اپنا بیٹا دور جاچکا تھا۔

اس کا دل چاہا کہ عادل مل جائے اور وہ اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لے مگر شاید اب بہت دیر ہوچکی تھی اس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑا اور آسمان کی طرف بلند کرکے معافی مانگتے ہوئے رونے لگا۔ لیکن وقت نکل چکا تھا اور اب بہت دیر ہوچکی تھی۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

کبیر والا کی زرخیز زمین کا ایک ہیرا

سخن شاعری میں جدت کی ملکہ

کومل جوئیہ

شگفتہ شفیق

کومل جوئیہ جن کا اصل نام شازیہ علی عمران ہے نومبر ۱۹۸۳ کو کبیر والا میں پیدا ہوئیں۔ شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۹۸ سے کیا، پہلی کتاب ۲۰۱۳ میں منصۂ شہود پر۔۔ایسا لگتا ہے تجھ کو کھو دونگی۔ کے نام سے آئی اور لوگوں سے داد

Digitized by Google

وتحسین وصول کر گئی۔ کومل اُس کے بعد بھی مستقل مزاجی سے لکھتی رہیں بے حد زود گو شاعرہ ہیں خود فرماتی ہیں

سو سوالوں کا سامنا ہے مجھے
جرم ہے میری زود گوئی بھی

اب اُن کا دوسرا مجموعہ..... ملکہ..... کے نام سے زیرِ طبع ہے اور آج کل تو لگتا ہے کہ شاعری کی دیوی کومل جوئیہ پر بے حد مہربان ہے کہ نت نئی غزلیات پڑھنے کو مل رہی ہیں بہت ہی زیادہ اور شاندار لکھ رہی ہیں کومل کی شاعری میں دن بدن نکھار آتا جا رہا ہے اُن کا تازہ کلام پڑھنے کے بعد دل دوسرے کی شاعری پڑھنے کے لئے مشکل سے ہی راضی ہوتا ہے کامل کے اشعار اپنے اندر اس بری طرح انوالو کر لیتے ہی کہ قاری دیر تک اُن کا لطف محسوس کرتا ہے۔ کومل جوئیہ کی شاعری کی بنیاد محبت ہے وہ محبت جو زندگی کا سب سے بڑا سچ ہے اور جس کے گرد یہ کائنات رقص کر رہی ہے۔

دل بچپن کے سنگ کے پیچھے پاگل ہے
کاغذ ڈور پتنگ کے پیچھے پاگل ہے

اور ایک اور شعر دیکھیں

روز ملنے کو کون کہتا ہے
بارشیں روز تھوڑی ہوتیں ہیں

وارفتگی، بے ساختگی، سادگی اور شگفتگی کومل جوئیہ کی غزلوں کا خاصا ہیں اور اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیت بھی۔ وہ اپنی زندگی کی طرح شاعری میں بھی کو ئی لگی لپٹی رکھنے کی قائل نہیں ہیں اُن کی شاعری پڑھ کر قاری کیف وانبساط کی وادی میں اُتر جاتا ہے کومل جوئیہ کی شاعری دل کو اپنی جانب ملتفت کرتی ہے کومل کی شاعری میں خوبصورت تنوع پایا جاتا ہے وہ ہر موضوع کو چھڑتی ہیں اور سہولت و کامیابی سے اپنا مطمع نظر سمجھا جاتی ہیں جو کے اُن کی ہم عصر شاعرات میں بہت کم پایا جاتا ہے اُن کی قوت متخیلہ زبردست ہے اپنی جنم بھومی۔۔کبیر والا۔۔سے عشق بارہا عیاں ہوتا ہے۔دل کی باتیں زبان پر لے آنے والی کومل اپنی صاف گوئی کی وجہ سے بھی مشہور ہیں حالانکہ یہ خوبی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے کہ اندر باہر کوئی منافقت نہ ہو۔ بالکل سچی اور کھری خالص سونے کی مانند چمکدار۔کومل جوئیہ نے اپنی شاعری میں معاشی مسائل کا حل بھی خوبصورتی سے پیش کیا ہے

اپنی مرضی کی مالک کومل جوئیہ انتہائی پیاری خاتون ہیں جو کے گھر اور گھر والوں کے عشق کو سرفہرست رکھتی ہیں اس کے لیئے وہ شاعری اور شہرت سب کو ایک دم چھوڑنے پر آمادہ رہتی ہیں اردو کے علاوہ پنجابی جو کے اُن کی مادری زبان ہے میں بھی خوبصورت کلام کہتی ہیں.....غرض کہ کومل جوئیہ اعلیٰ درجے کی شاعرہ ہے جس کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے اور یہ بات وہ خود بھی ببانگ دہل کہتی ہیں میں چاہتی ہوں اس شاعرہ کا زیادہ سے زیادہ کلام آپ سے شیئر کروں کہ آپ قارعین اس کو پڑھ کے ان کی شاعرانہ عظمت کو جان سکیں تو کیجیے اب آپ کومل جوئیہ کے کلام کو انجوائے کریں۔

راج لفظوں پہ تو ہر دل میں بسیرے ہوں گے
آنے والے جو زمانے ہیں وہ میرے ہوں گے

..........*

میں ہوں قائل سخن میں جدت کی
میں پرانے رواج کی نہیں ہوں

Digitized by Google

..........*

عورت کو اپنی جان سے بڑھ کر ہیں زیورات
میں کارو بار کے لیے گہنے نہ دوں تو پھر

..........*

تم آتش ، میں جھرنے جیسی دھیمی ہوں
ہم دونوں کا عشق برابر تھوڑی ہے

..........*

اب کیسے اُسے عشق میں اے شخص گنوا دیں
محنت سے جو ہم نام کمانے میں لگے ہیں

..........*

تو کون سا ہمارے بڑوں کو پسند ہے
اے عشق ہم بھی تیری وراثت میں کیوں رہیں؟

..........*

میں تھوک سکتی ہوں شہرت کہ میری عزت پر
جو حرف آیا تو میں شاعری نہیں کروں گی

..........*

مجھے قبول نہیں آگ و تیل کا رشتہ
معاف کیجیے میں دوستی نہیں کرونگی

..........*

ہر خوشی پھیکی ہے کچھ رنج و الم درکار ہے
خشک صحرا آنکھ کو ہلکا سا نم درکار ہے
چار دیواری محبت سے نہیں بنتی جناب
گھر کی بنیادیں اٹھانے کو رقم درکار ہے

..........*

بے بسی آنسو اذیت بے وفائی اور خلش
چند لفظوں میں محبت کا خلاصہ کردیا

..........*

مجھے معلوم ہیں سب سازشیں درباریوں کی
مرے کتبے پہ لکھا جائے گا مقتول ملکہ

..........*

کہنے کو میں شہر میں بڑی ہر دلعزیز تھی
لیکن میں ایک شاہ کی ادنی کنیز تھی

..........*

جس نے جیسا بھی کہا میں نے فقط چپ سادھی
اس سے اچھا مجھے برتاؤ نہیں آتا ہے

..........*

بند آنکھوں سے ہزاروں میں تجھے پہچانوں
دوستا !!!!! لہجہ کبھی اتنا حسیں بھولتا ہے

..........*

میں جس ارادے سے جا رہی ہوں اسی ارادے سے لڑ پڑوں گی
مرے سپاہی کو کچھ ہوا تو شاہزادے سے لڑ پڑوں گی

..........*

دنیا میں ہیں لوگ ، دو ہی خوبرو
ایک تو ظاہر ہے میں اور ایک تو

..........*

اٹھ اٹھ کے دشمنوں نے سراہا کمال است
تو کب کہے گا کور نگا ہا کما ل است

..........*

گو کہ حالاتِ محبت میں ہے مندہ اب بھی
یاد آتا ہے وہ..... اللہ کا بندہ اب بھی

..........*

بو ل ، مرضی بتا دے بھائی کو
چپ ، غلط فیصلے کرا دے گی

..........*

خود کو لوگوں کے ترازو میں کہاں تولتی میں
میری مرضی نہیں ہوتی تو نہیں بولتی میں

..........*

بے نیازی کی میں اپنا لوں کبھی خو بالفرض
لوٹ کر آئے مرے پاس اگر تو بالفرض
کیا مرا درد نظر آئے گا پھر بھی سب کو
پونچھ لوں چپکے سے بہتے ہوئے آنسو بالفرض

..........*

راز تھا کو مل جو سر بستہ کھلنے والا ہے
اب میری پہچان کا رستہ کھلنے والا ہے

Digitized by Google

..........*

کومل سارے گھر والوں کے چہرے پر بیزاری ہے
صرف دعاؤں کا تحفہ تھا گھر آئے مہمان کے پاس

..........*

برادری کے رواجوں کا پاس تھا کومل
مجھے بھی گانے پڑے گیت اُس کی شادی میں

..........*

بہت برا کیا ہے مدعائے دل کہہ کر
کبھی کبھی کی دعا اور سلام سے بھی گئے

..........*

آئی جو شبِ وصل تو پھر ٹوٹ کے سوئے
ہم ہجر کے موسم میں بہت دیر کے جاگے

..........*

تمہارے ہاتھ کا لمس کافی ہے لوٹ آؤ
میں ٹھیک ہو جاؤں گی دوائی پڑی رہے گی

..........*

عین ممکن ہے کوئی شخص ذرا سا تڑپے
میں ہوں بیمار، یہ افواہ اڑا دے کوئی

..........*

اب دیکھنے آئے ہو دھواں خوب بہت خوب
جب راکھ ہوا شہرِ گماں خوب بہت خوب
ثابت کیا ہر جرم مرے نام ..... بالآخر
کیا بات مرے شعلہ بیاں خوب بہت خوب
ہر خواب مرا پاؤں تلے روند دیا اب
ہونے لگا احساسِ زیاں خوب بہت خوب

..........*

غزل

زرد چہرہ ہے مرا زرد بھی ایسا ویسا
ہجر کا درد ہے اور درد بھی ایسا ویسا
ایسی ٹھنڈک کہ جمی برف ہر اک خواہش پر
سرد لہجہ تھا کوئی سرد بھی ایسا ویسا

اب اسے فرصتِ احوال میسر ہی نہیں
وہ جو ہمدرد تھا ہمدرد بھی ایسا ویسا

یعنی اس دھول کے چھٹنے پہ بھی الزامِ جنوں
یعنی طوفان ہے پسِ گرد بھی ایسا ویسا

پوری بستی میں بس اک شخص سے نسبت مجھ کو
مجھ سے منکر ہے وہ اک فرد بھی ایسا ویسا

عشق نے ریل کی پٹڑی پہ لٹایا جس کو
تھا جوا نمرد جوانمرد بھی ایسا ویسا

کیا تجھے ہجر کے آزار بتائے کومل
تو تو بے درد ہے بے درد بھی ایسا ویسا

☆☆.....☆☆

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

Digitized by Google

پنڈی سے ارسال کردہ تحریر

گاہک

علم دین کے سر پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا تھا وہ دیوانہ وار اپنی بیٹی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن باوجود انتہائی کوشش کے وہ اس کی تلاش میں ناکام رہا۔ اس کی بیوی رو رو کر نڈھال تھی، گھر کا آنگن سونا تھا، کھیلتی کودتی، زندہ بچی آنکھوں سے کیسے اوجھل ہوگئی؟ اس معصوم کے ساتھ وہ لوگ کیا.....

میمونہ صدف

برسوں پہلے کی بات ہے جب اس نے کنول کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دیکھتے ہی وہ اس کے حسن میں کھو گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، گھنی پلکیں، ان آنکھوں میں بلا کی چمک اور آنسوؤں کا بیک وقت موجود ہونا کسی کو بھی مسحور کر لینے کو کافی تھا۔ اس کے نرم اور گداز ہاتھ، پاؤں، کھلتا رنگ اور سب سے بڑھ کر متناسب سراپا۔ وہ ایک مکمل حسن تھی، ایک نم دیدہ حسن۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب صدیق نے جوانی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تھا، منٹو کو پہلی بار پڑھا۔ ہیرا منڈی کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کا تجسس اسے یہاں کھینچ لایا۔ اس کی پہلی ملاقات جس سے ہوئی وہ کنول ہی تھی۔

آپ حسن کا شاہکار ہیں۔ روایتی جملہ صدیق نے بھی بے اختیار اس کے کانوں میں انڈیلا۔ لیکن کنول ان روایتی الفاظ سے بننے جملوں کی آہنگ سے پھولنے والی لڑکی نہیں تھی۔

نوازش ہے آپ کی ورنہ بندی کس بے نشاں ذرے کا نام ہے، جانتی ہے۔ کنول نے خالصتاً بازاری انداز میں جواباً کہا!

آپ نے کبھی نہیں سوچا کہ آپ کو یہاں نہیں ہونا چاہیے؟ حسن کے پروانے نے اپنا اگلا سوال داغا۔ یہ کیسا گاہک ہے؟ نہ غزل سننا چاہتا ہے اور نہ ہی کوئی ہنسی ٹھٹھول۔ کنول اس کی باتوں میں منہمک ہوگئی۔

چاہنے سے بھی کبھی کچھ ہوا ہے، چاہتا تو انسان بہت کچھ ہے، کنول کی آنکھوں کے ساتھ لہجہ بھیگ چکا تھا!

آپ مجھے کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ ایک طوائف کو آج اپنے غم لفظوں سمیت آنسوؤں میں بہانے کا موقع مل رہا تھا۔

فرمائش کرنے والا، خوبرو بھی تھا، چہرے مہرے سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ روپے بھی ہیں اس کے پاس۔ وہ اس علاقے میں آنے والوں کی تماش کا لگتا بھی نہ تھا۔

وہ کیوں آیا تھا؟ کون تھا؟ کہیں مفتا ہی نہ ہو۔ نائیکہ کو صبح پیسے نہ دیے تو وہ بہت سنائے گی؟ اس

Digitized by

کے چہرے سے ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

فکر نہ کرو۔ میں تمھاری رات کی پوری قیمت ادا کروں گا۔ صدیق نے اس کا چہرہ پڑھتے ہوئے کہا

اس کی بات سن کر کنول چونک گئی اور حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے صدیق کو ایک جانب بٹھایا اور اس کے سامنے بیٹھ کے اپنی کتھا سنانے لگی۔ بہت سے دکھوں کا بوجھ تھا جو آج اسے ہلکا کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی صدیق کے کان جو سن رہے تھے، اس کی آنکھیں ان سے زیادہ کنول کے چہرے، سراپا، چہرے پر ٹکی تھی۔ لیکن یہ نظر کسی گاہک کی نہ تھی بلکہ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سراپا کو اس جگہ نہیں ہونا چاہئے۔ کاش میرے پاس بڑی گاڑی ہو میں اس عورت کو دن کی روشنی میں آئس کریم کھلانے لے جاؤں۔ چند لمحے کے لیے ہی سہی اس کی اداس آنکھوں میں خوشیاں بھر دوں گا۔ صدیق نے بے اختیار سوچا۔

کیا سوچ رہے ہیں؟ یہی نا کہ میرے والدین نے مجھے تلاشا کیوں نہیں؟ کنول اس کی محویت کے مرکز کو نہ سمجھ پائی۔

تو صاحب بالفرض اگر وہ مجھے ڈھونڈ بھی لیتے تو لوگ انھیں جینے بھی دیتے؟ ان کی عزت کتنی دفعہ اس کوٹھے پر روندی گئی انہیں تو اندازہ بھی نہ ہوگا، میں انھیں غلط نہیں سمجھتی، اس نے اپنے والدین کی طرفداری کرتے ہوئے کہا! درحقیقت وہ تھے بھی بے قصور!!

URDU TUBE
A WORLD OF ENTERTAINMENT

Digitized by Google

ہاں اپنی اپنی جگہ تو ہر ایک درست ہے لیکن پھر بھی۔ صدیق نے لقمہ دیا۔

صاحب جی۔ یہ معاشرہ مرد کا گناہ تو معاف کر دیا کرتا ہے لیکن عورت کی بے گناہی پر بھی اسے سزا دینا جانتا ہے۔ کنول نے کہا اور سر جھکا لیا! دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گالوں کو تر کرتے ہوئے اس کی گردن پر جا کر جذب ہو گئے۔ اس کا ضبط ٹوٹ گیا، صدیق بھی اس میں مخل نہیں ہوا اور اسے رونے دیا۔ یہ دکھ نہ جانے کتنے برسوں سے اس کے دل میں جمع تھے جو اب پانی بن کر آنکھوں سے اور کٹے لہجے کے لفظوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ روتی رہی یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ صدیق اٹھا اور ایک جانب پڑے ہوئے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اسے پیش کیا۔ کنول نے خاموشی سے گلاس تھاما اور پانی پینے لگی۔ یہ واحد گاہک تھا جس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی تھی جو گاہکوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے، کیسا عجیب گاہک تھا؟ وہ رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی۔

آج رات اس کے لیے کٹھن برس کی رات تھی۔

☆.....☆.....☆

کراچی جسے روشنیوں کا شہر کہتے ہیں اور پاکستان میں سب سے زیادہ آبادی والا شہر بھی ہے۔ یہاں ہر طرح کے لوگ بستے ہیں لیکن اکثریت ہجرت کر کے یہاں بسنے والے لوگوں کی ہے۔ آزادی پاکستان کے وقت یہ ایک بنجر اور غیر گنجان آباد علاقہ تھا کیونکہ یہ سمندر کے قریب تھا اس لیے لوگ ڈر کی وجہ سے بھی یہاں رہائش رکھنے سے گریز کرتے تھے کہ کہیں سمندر بپھر گیا تو کچھ نہیں بچے گا جب پاک و ہند کی حدود کی تقسیم کی جا رہی تھی تو کراچی کو پاکستان کے حصے میں ڈالنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ بیاں باں بنجر علاقہ ہے اور مسلمانوں کے کسی کام نا آئے گا، لیکن افسوس کہ نہ تو سمندر بپھرا اور نہ ہی اس سرزمین نے کبھی انسانوں کو دھوکہ دیا، انسان آپ ہی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے، یہ وہ زمانہ ہے جب بدامنی کے گہرے بادلوں نے لیاری کے علاقے کو عرصہ دراز سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ آئے روز، یہاں فائرنگ اور چوری ڈاکے کے واقعات ہونا عام تھے۔ اسی علاقے کے ایک چھوٹے سے مکان میں علم دین اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔ کنول اب سات برس کی ہو چکی تھی اور چوتھی جماعت میں تھی۔ سبھی بچے کھیل کود میں مصروف تھے جب دو مسلح گروپوں میں فائرنگ کا تبادلہ جاری تھا۔ بچوں اور پیدل چلنے والوں میں بھگ ڈر مچ گئی۔ اسی اثناء میں کنول کے ناک سے کوئی چیز آ ٹکرائی۔ وہ چند سیکنڈ میں اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔ بے ہوش کرنے والا آدمی اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر چل دیا۔ ہر ایک کو اپنی جان بچانے سے غرض تھی کسی نے اس کی جانب دھیان نہ دیا۔ جب کنول کی آنکھ کھلی تو وہ ایک کمرے میں مخملی بستر پر سو رہی تھی۔

میں کہاں ہوں؟ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا!

تم اپنی آنٹی کے پاس ہو! وہ جو زرق برق لباس میں ملبوس اور میک اپ سے لدی ہوئی تھی اس کے پاس آ بیٹھی۔

نو خیز کلی ہے نازکیہ پیار سے چلنا۔ پاس ہی کھڑا شخص خباثت سے مسکرایا اور اپنے دانت کچکچاتے ہوئے بولا!

ہم جانتے ہیں کلیوں کو پھول کیسے بنایا جاتا ہے اور پھولوں سے پھل کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ جا تو

Digitized by Google

جوس لا میری یاسمین کی کلی کے لیے، نائیکہ نے کہا!

لیکن میرا نام یاسمین تو نہیں؟ میرا نام تو کنول ہے، کنول نے معصومیت سے کہا!

کنول! یہ تو اور بھی خوبصورت نام ہے۔ نائیکہ نے پیار سے پچکارا۔

مجھے مرے اماں، ابا کے پاس جانا ہے، کنول مچلی!

پہلے جوس، نائیکہ نے جوس کا گلاس اس کی جانب بڑھایا

نہیں جوس نہیں، مجھے میرے ابا کے پاس چھوڑ آؤ! کنول مچل رہی تھی، بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی، نائیکہ نے اسے اپنے بازوں میں بھینچ لیا، بنا کچھ کہے اسے پکڑا اور جوس اس کے منہ میں انڈیل دیا۔ جوس کی صورت نشے کے شربت کا ایک گھونٹ ہی اس کے گلے سے اترپایا تھا کہ وہ اماں، اماں، ابا، ابا، اماں، ابا کہتے کہتے نائیکہ کے بازوؤں میں ہی جھول گئی۔

☆.....☆.....☆

علم دین کے سر پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا تھا وہ دیوانہ وار اپنی بیٹی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن باوجود انتہائی کوشش کے وہ اس کی تلاش میں ناکام رہا۔ اس کی بیوی رو رو کر نڈھال تھی، گھر کا آنگن سونا تھا، کھیلتی کودتی، زندہ بچی آنکھوں سے کیسے اوجھل ہو گئی؟ اس معصوم کے ساتھ وہ لوگ کیا سلوک کریں گے؟ کہیں اگر اسے مار دیا تو؟ پتہ نہیں کتنی ہی دلیلیں دماغ میں گردش کر رہی تھیں جن کا اثر ہر گزرتی گھڑی گہرا ہوتا جا رہا تھا، صدمہ برداشت ہونے والا تھا ہی نہیں، علم دین کے گھر پہنچنے تک بیوی کی حالت بری طرح بگڑ چکی تھی۔

صبر کرو فاطمہ! میں نے تھانے میں رپورٹ درج کروادی ہے ہماری بیٹی مل جائے گی۔ اس نے بیوی کو طفل تسلی دی لیکن وہ معمر شخص خود بھی بری طرح ٹوٹ چکا تھا کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی اس کا دل کہتا تھا کہ اس کی بیٹی اب ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی۔ اب وہ چاہے بھی تو اسے نہیں ڈھونڈ پائے گا۔ اور یہ بات اسے بھی ہلکان کیے جا رہی تھی دونوں میاں بیوی بھوک پیاس اور دنیا داری سے ماوراء بس ایک ہی دعا کر رہے تھے کاش ان کے گھر کی رحمت، ان کے جگر کا گوشہ کسی صورت لوٹ آئے لیکن شاید قدرت مہربان نہیں تھی، کنول کا پھول مسل دیا جا چکا تھا۔

دن راتوں میں، راتیں دنوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ سب کو اپنی اپنی جگہ صبر آ گیا تھا۔ بس ایک فاطمہ تھی جو آس کی نادیدہ ڈور سے بندھی بس دروازے کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھتی رہتی۔ کنول نے نائیکہ پر ہر حربہ آزما کر دیکھ لیا تھا اور ناکام رہی تھی۔ رو کر، بھوک ہڑتال کر کے، ہر طرح لیکن خرید کا مال صرف فروخت کے لیے ہوا کرتا ہے اس پر کوئی ترس نہیں کھاتا۔ پھر نائیکہ تو اس کاروبار کا پرانا کھلاڑی تھی وہ جانتی تھی کہ آندھی میں اڑنے والی دھول کی مانند وہ جلد ہی اس ماحول کی عادی ہو جائے گی اور ہوا بھی یہی۔ کنول ہر گزرتے دن کے ساتھ اس ماحول میں خود کو جذب کرتی چلی جا رہی تھی۔ بس ایک امید کا دیا تھا جو کبھی ٹمٹماتا تو کبھی آپوں آپ بجھ جاتا۔ پھر اس کا جسم نہ جانے کتنی بار بکا، اس کی عزت نہ جانے کتنی بار داغدار ہوئی۔

وقت کہاں رکتا ہے، اچھا ہو یا برا، یہ تو گزر ہی جاتا ہے، گزرنا اس کا شیوہ جو ٹھہرا، کنول کی عمر بھی جوانی کی طرف بڑھ چکی تھی۔ گویا وہ جوانی میں قدم نہیں رکھ رہی تھی بلکہ کوئی کلی کھل کر پھول بن رہی ہے جس کی مہک ہر سو پھیل رہی ہو دیکھنے والے تکتے رہ جاتے کہ حسن ایسا بھی ہو سکتا ہے! اس کے منہ

Digitized by Google

بولے دام سے بھی زیادہ ملنے پر نائیکہ اس سے بہت خوش تھی اور اس کی خدمت اور خاطر میں کوئی کمی نہیں آنے دیتی تھی۔ اس نے بھی ہیرا منڈی کے آداب سیکھ لیے تھے۔

زندگی کا پہیہ رواں دواں تھا جب ایک قبول صورت گاہک نے اس کے دل میں موجود اس امید کا پتہ لگایا۔ وہ اسے خواب دیکھانے لگا رنگ برنگے خواب، عزت دار زندگی کے خواب، جن میں کبھی کبھار وہ اسے اپنے بچوں کی ماں تک بنا لینے کے خواب دکھانے لگتا، یوں لگتا تھا جیسے کوئی خواب کا سوداگر ہو اور بس انہیں خواب، خواب کی باتوں میں دل موہ لیتا تھا۔ اس وقت دل میں جلتے دیے کی لو بلند ہونے لگی۔ کنول رات بھر ان خوابوں میں بہتی رہی اور اگلے ہی صبح وہ خوابوں کے سمندر کے ساحل پر تھی، وہ دن کی روشنی میں اس کے ساتھ بھاگ کر آئی تھی کیونکہ جہاں وہ رہتی تھی وہاں دن سویا کرتے تھے راتیں جاگا کرتی تھیں۔

سنو! کنول شمیم اپنا نام بدلنا ہوگا شریفانہ زندگی گزارنے کے لیے سب بھلانا ہوگا، وہ گاہک جواب اس کا شوہر تھا نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

مجھے عزت دار زندگی گزارنے کے لیے اپنی کھال بھی بدلنا پڑے میں بدلوں گی، بس تم میرا ساتھ دینا، کنول نے پرعزم لہجے میں کہا!

کیوں نہیں۔ کیوں نہیں؟ نو بیاہتہ دولہے نے یقین دہانی کروائی۔ دونوں کا نکاح ہو چکا تھا اور اب اس کے دولہے نے ایک کمرہ بھی الگ سے شریفانہ ماحول میں کرایے پر لے لیا تھا۔

وہ اس کے حسن کا پجاری تھا۔ آج یہ حسن اس کی دسترس میں تھا اور تمام عمر از خود اس کا مطیع رہنے کو تیار تھا۔ اس سے بڑھ کر اس کی انا کی کیا تسکین ہو سکتی تھی۔ لیکن حسن کے پجاری بھی کئی بھنور اصفت ہوتے ہیں، جہاں شمع جلتی دیکھی وہیں پھڑ پھڑانے لگے۔ کنول اس کے دل پر زیادہ راج نہ کر پائی، خوابوں کا پیار بھرا سمندر سوکھ چکا تھا، اب وہ راتوں کو کبھی گھر آتا کبھی نہیں۔ کنول کا ضبط جواب دینے لگا، وہ بھی چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی اس سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا تھا، ایک دن وہ اس کے مدمقابل کھڑی ہو گئی۔

شمیم کیا ہوتا جا رہا ہے؟ میں کیوں تمہارے دل سے اتر گئی ہوں۔ کنول نے غصے سے کہا۔

بد دماغ عورت کیا چک چک لگا رکھی ہے؟ جا دفع ہو جا، طوائف کہیں کی۔ اس کے شوہر کے یہ الفاظ اس کے زخمی دل پر کسی آری کی طرح چلے اس کے دماغ میں یوں لگا جیسے کوئی آہنی چیز آن پڑی ہو اور اس کے کان انہیں الفاظ سے گونجنے لگے تھے! کنول اس زندگی کو جب چھوڑ چکی تھی اور نہایت دیانت داری سے صرف اس کی ہو کر زندگی گزار رہی ایسے میں طوائف کا لفظ اس کیلیے روح تک کو پار کر دینے والی گولی سے کم نا تھا!

کنول کھسیا گئی، کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟ دیکھ میری طرف! کنول نے دکھ سے کہا وہ جانتی تھی کہ اس کا حسن کیا ہے۔ شوہر اس کے مقابلے میں قبول صورت بھی نہ تھا۔

حسن۔ ہن حسن۔ تیرا حسن۔ وہ غصے سے تلملا اٹھا۔ سیدھا غسل خانے کی جانب بڑھا جہاں صفائی کے لیے تیزاب، برش اور جھاڑو ایک کونہ میں رکھے تھے۔ اس نے تیزاب کی بوتل اٹھالی اور تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ کنول کنگ کھڑی تھی۔ اس نے غسل خانے سے باہر نکلتے ہی کنول کے چہرے پر پھینک دیا۔ درد کی وجہ سے کنول کی چیخ نکل گئی وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتی چلی گئی۔

Digitized by Google

اب سنبھال یہ حسن، شوہر چلایا اور کمرے سے نکل گیا۔ کنول بین کرنے لگی۔ لیکن یہاں سنتا بھی تو کون۔ محلے والوں سے تو کبھی وہ ملی تک نہیں تھی مبادا کوئی پرانا گاہک نہ آنکلے۔ اس کے بین کی آواز سن کر کچھ لوگ ادھر آنکلے۔ ایک عورت نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹائے جو بری طرح جھلس چکا تھا۔

اسے ہسپتال لے چلتے ہیں۔ اس کا میاں تو بھاگ گیا، وہ کوئی مرد تھا! اسے کس نے ہسپتال پہنچایا، وہ نہیں جانتی تھی، ہسپتال سرکاری تھا، اسے ایک جانب لٹا دیا گیا، سب چند لمحوں بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ ایک نرس نے اس پر ترس کھا کر اسے بستر پر لٹا دیا۔ چند دنوں میں اس کی جلد بحال ہو چکی تھی لیکن اس کا حسن ختم ہو چکا تھا۔

وہ کسی نہ کسی طرح ہیرا منڈی پہنچی تو نائیکہ وہاں سے جا چکی تھی۔ تلاش و بسیار کے بعد وہ ایک پوش علاقہ میں نائیکہ تک جا پہنچی۔

ارے وہ عزت دار تھا، پر تھا تو گاہک ہی۔ نائیکہ نے اس کی روئیداد سنی تو اس پر چلائی لیکن نائیکہ آج بھی اس کے ساتھ ویسے ہی شفیق تھی، اور پھر کنول کیلئے بھی اس کے علاوہ کیا راستہ تھا؟ نائیکہ نے اسے آج اسی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹا جیسے وہ پہلی بار بک کر آئی تھی تو اس کی بانہوں میں تھی۔

☆.....☆.....☆

زندگی کے اٹھائیس برس گزر چکے تھے۔ صدیق کی زندگی میں بدلاؤ آ چکا تھا۔ اچھی نوکری، بڑی گاڑی، بیوی بچے اس کے پاس سب تھا۔ وہ لاہور آیا تو اسے جس کا پہلا خیال آیا وہ کنول تھی۔ وہ بیوی بچوں کو ساتھ ہیرا منڈی کی جانب چلا آیا۔

میں یہاں کنول کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ میں نے ایک عرصہ پہلے خود سے عہد کیا تھا کہ اگر میرے پاس ایک اچھی گاڑی ہوئی تو میں اسے آئس کریم کھلانے لے جاؤں گا۔ صدیق نے کہا

کیا مطلب آپ ایک طوائف کو ڈھونڈ رہے ہیں؟۔ اس کی بیوی کھسیائی۔

آج کے دن سہہ لو۔ تم جانتی ہو میں نے تمہاری امانت میں کبھی خیانت نہیں کی اور نہ کبھی کروں گا۔

بس آج مجھے وہ عہد پورا کرنے دو۔ صدیق نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ تلملا کر رہ گئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ صدیق گاڑی چلاتے ان بسرے لمحوں کو بھی یاد کر رہا تھا جب اس نے انارکلی جانے کی ٹھانی اور وہاں کنول کی ملاقات ہوئی، اس نے اس کے حسن کو کس قدر سراہا تھا اور وہ آج بھی اس کی یادوں میں اسی طرح جوان تھا جس طرح وہ پہلی ملاقات میں تھا، وہ رات کسی خواب سے کم نہیں تھی، ایک حسین خواب جو زندگی کی ساری رنگینیاں سمیٹے ہوئے تھا۔

دو گھنٹے کی تلاش و بسیار کے بعد ایک پوش علاقہ میں وہ کنول کے ٹھکانے تک پہنچ ہی گئے۔ وہ گاڑی سے اترا۔ گھر کی بیل بجائی۔

یہاں کنول رہتی ہیں۔ ایک جلے ہوئے چہرے والی عورت نے دروازہ کھولا تھا، جس سے اس نے پوچھا۔

جی میرا نام ہی کنول ہے۔ اس نے کہا

"لیکن میں جس کنول کو جانتا ہوں وہ تو....."

صدیق کو سمجھ نہ آئی کہ بولے تو کیا بولے۔

"میں وہی کنول ہوں۔ جس کے حسن کا چرچا تھا۔ بس ایک گاہک نے جسم کے ساتھ روح بھی جلا ڈالی۔" اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ صدیق اس کی جانب دیکھتا ہی رہ گیا۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

عامل کامل

کالی دنیا، جادو، جنات، ٹونے ٹوٹکوں، سیاہ دل لوگوں کی کالی دنیا، جہاں دوشیزاؤں کو جادو کی بھینٹ چڑھانا، شیطان کو خوش کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا' اس دنیا میں ایک دین اور ایمان والے نے کس طرح ٹکر لی، اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں پیش آنیوالے دلچسپ، عبرت ناک، سبق آموز واقعات.....

دین وایمان کی کشمکش کی داستان

ساتویں قسط

پیر شاہ محمد قادری

میری اس چھوٹی سی تقریر کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا' چنانچہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فہد بولا:

''اچھا اب آپ بتائیں کہ کیا کرنا ہے.....؟ آپ کی بات میری سمجھ میں اچھی طرح آ چکی ہے.....''

''مجھے چند ایسے مددگاروں کی ضرورت ہے۔ جو میرے ساتھ چل کر ان پرندوں کا خاتمہ کر سکیں.....ان کے پاس پورا انتظام ہونا چاہئے.....''

''کیا یہ قدم خطرناک اور جان لیوا نہیں ہوگا.....؟''

''لاکھوں لوگوں کی خاطر چند لوگوں کو تو خطرہ مول لینا ہی پڑے گا..... ورنہ مسئلہ کیسے حل ہوگا.....!''

''آپ کی ہر بات میں وزن ہے.....'' وہ سر ہلا کر بولا: ''ٹھیک ہے..... میں اوپر والوں سے بات کرتا ہوں.....!''

''رات میں وہاں جانا تو مناسب نہیں ہوگا' اس لئے دن کے وقت ہی وہاں اپنا کام شروع کرنا پڑے گا.....!''

جواباً اس نے سر ہلایا اور چلا گیا' میں نے اسے یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ ابھی اس خبر کو خفیہ ہی رکھا جائے۔ تاکہ کسی قسم کا ہنگامہ نہ کھڑا ہو' وہاں پر جو بھی صورتحال ہوئی' اس سے بروقت ہی مقابلہ کیا جاتا۔

فہد کے جانے کے بعد صومانہ نمودار ہوگئی اور

Digitized by Google

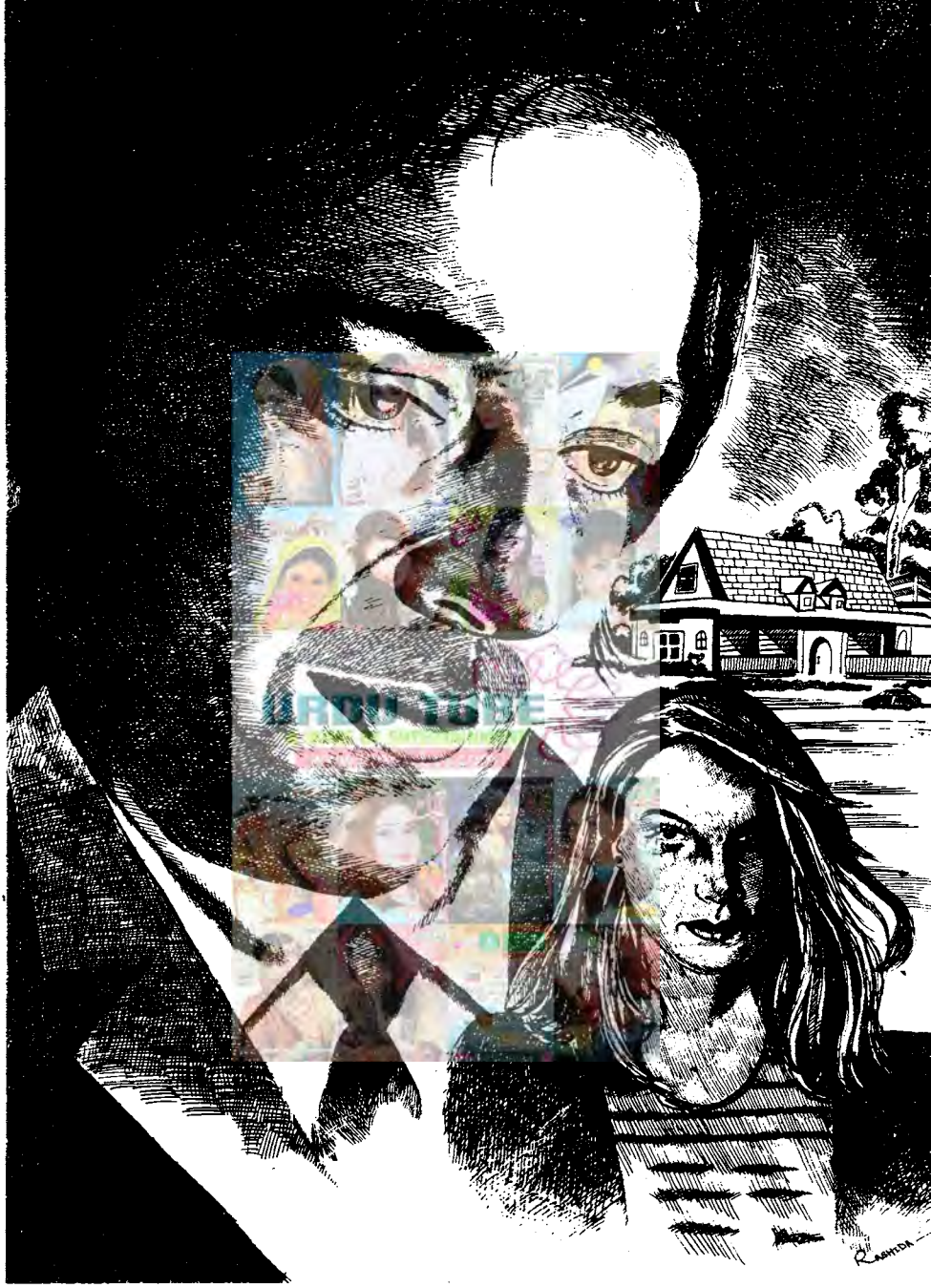

Digitized by Google

کسی قدر شوخی سے بولی:

''آپ کو عالم کے بجائے کوئی جاسوس ہونا چاہئے.....!''

''اس میں میرا کیا قصور ہے.....'' میں نے جواب دیا: ''تم خود ہی مجھے یہاں لے کر آئی ہو.....''

''مذاق کر رہی ہوں آقا.....! اتنا حق تو ہے مجھے.....!''

''ہاں..... تمہیں اجازت ہے.....!''

''آپ بہت ہی اچھے ہیں.....'' اس نے خوش ہو کر کہا: ''ویسے میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟''

''تمہارے بارے میں کیا کہوں.....؟ کیونکہ تم نے خود ہی کہا تھا کہ یہ تمہارا اصل روپ نہیں ہے.....''

''لیکن آقا.....! میری زندگی تو اب اسی روپ میں گزرے گی..... اس لئے میں بھول چکی ہوں کہ یہ میرا وجود نہیں ہے۔''

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے.....'' میں مسکرایا: ''کیونکہ تمہارا یہ وجود بے حد حسین ہے.....!''

میری بات سن کر وہ شرما سی گئی' پھر وہ چونک کر بولی:

''اب جلد سے جلد یہاں سے فارغ ہو جائیں تو ہمیں گلنار کے پاس بھی پہنچنا ہے.....''

''یہ تمہیں گلنار کیوں اتنی یاد آتی ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا: ''تمہیں تو اس کا نام بھی ازبر ہو چکا ہے.....''

''میں چاہوں تو اسے دیکھ بھی لوں.....'' اس نے کہا: ''لیکن میں آپ کے ساتھ ہی وہاں جانا چاہتی ہوں.....''

''اس بے تابی کی وجہ.....!''

''بڑا ذاتی سا سوال کر رہے ہیں آپ.....!''

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا: ''میں تو ان میں سے ہوں کہ جب آپ کپڑے بدل رہے ہوتے ہیں تو میری آنکھیں بند ہوتی ہیں۔''

''اوہ..... تم گلنار پر چوٹ کر رہی ہو.....'' میں نے سر ہلایا: ''میں بتاؤں گا اسے جا کر.....!''

''یہ فرق اپنی اپنی دیوانگی کے زاویے کا ہے.....'' اس نے جواب دیا: ''اس کی دیوانگی کچھ اور ہوگی' میری کچھ اور ہے۔''

یہ سن کر میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا' وہ نظریں چرانے لگی اور پھر میری آنکھوں سے اوجھل ہی ہو گئی۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا..... مجھے خدشہ تھا کہ جلد یا بدیر میں کسی قضیے میں پھنسنے والا ہوں' خیر..... مجھے اس کیلئے بھی تیار ہی رہنا تھا.....!! ایک طرف گلنار اور دوسری طرف صومانہ.....! اور مجھے ان دونوں کو ہی لے کر چلنا تھا..... اب میں خود بھی ان دونوں کے بغیر ادھورا سا تھا.....!!

سات بجے کے قریب فہد میرے کمرے میں داخل ہوا تو دو افراد اور بھی اس کے ہمراہ تھے' وہ بے حد باوقار شخصیت کے مالک تھے..... انہوں نے اپنا تعارف کروایا تو معلوم ہوا کہ وہ پولیس محکمے کے اعلیٰ عہدیدار ہیں..... اب میرے لئے ضروری تھا کہ میں بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے بارے میں بتاؤں:

''میرا نام سلمان احمد ہے' میں ماہر عملیات ہوں' مجھے اپنے باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پرانی حویلی ان پرندوں کا مسکن ہے..... اب ان پر قابو پانے کیلئے آپ کو موثر اقدامات کرنے ہوں گے.....''

''کیا ہم آپ کی نشان دہی پر مکمل اعتبار

URDU TUBE www.urdutube.com

Digitized by

کرلیں.....؟'' ایک افسر نے اپنے مخصوص قسم کے انداز میں پوچھا۔

''میرے پاس ایسا علم ہے' جس کی شروعات وہاں سے ہوئی ہیں کہ جہاں سے عام قسم کی عملیات کا اختتام ہوتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں آپ کو یہ بھروسہ ضرور کرنا چاہئے.....'' میرا لہجہ ٹھوس تھا۔

یہ میرے الفاظ اور انداز کا ہی جادو تھا کہ وہ لوگ ایسے دوسرے کی شکل دیکھنے لگے' میں نے مزید کہا:

''میں تو یہاں اجنبی ہوں' لیکن کیا آپ لوگ پروفیسر زیڈ سے واقف ہیں.....؟''

''ہم بھی اس سے ناواقف تھے۔'' افسر نے بتایا: ''لیکن ہمارے ذرائع نے خبر دی ہے کہ پروفیسر زیڈ کسی زمانے میں ایک کالج میں لیکچرار تھا..... وہ سائنس کا پروفیسر تھا..... لیکن پھر وہ پراسرار طور پر لاپتہ ہوگیا تھا اور اب کافی عرصہ گزر جانے کے بعد وہ منظر عام پر آیا ہے.....''

''مجھے اس کے عزائم کچھ اچھے نہیں لگ رہے۔''

''کیا مطلب.....؟''

''فی الوقت وہ جو کچھ کر رہا ہے' اس میں سب کی بھلائی نظر آرہی ہے۔'' میں نے بتایا: ''لیکن بعد میں جو کچھ ہوگا اور اس کا جو بھی نتیجہ نکلے گا' تو اس وقت آپ لوگ شاید بے بس ہوں گے..... میرے خیال میں وہ اس بات پر قادر ہو جائے گا کہ آپ کی مشینری کو جام کر سکے.....''

''آپ کی بات دل کو لگ رہی ہے.....'' دوسرے افسر نے سر ہلا کر معنی خیز انداز میں کہا۔

اتنی دیر میں ہوٹل کا ویٹر چائے اور دوسرے لوازمات لے کر اندر داخل ہوا:

''یہ زحمت کیوں کی فہد میاں.....!'' ایک افسر کے منہ سے نکلا۔ جواباً وہ مسکرا کر رہ گیا۔

''پھر چائے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں اور پرانی حویلی کیلئے دوسرے دن کا پروگرام مرتب کیا گیا' وہ لوگ مجھے بھی ساتھ لے کر جانے کا ارادہ رکھتے تھے' چنانچہ میں نے حامی بھر لی۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ رخصت ہو گئے..... اب مجھے خیال آیا کہ اندھیرے کا وقت قریب آچکا ہے' چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہی میں کھانے کی غرض سے ہال میں پہنچ گیا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن تقریباً بارہ بجے کے وقت میرا بلاوا آگیا' سادہ لباس میں پولیس کے اہلکار مجھے اور فہد کو اپنے ساتھ ایک نیلے رنگ کی کار میں لے گئے تھے۔ آج کے بارے میں بھی پروفیسر زیڈ کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ صبح سے ہی سرکس گراؤنڈ میں براجمان ہو چکا تھا تاکہ شام تک زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی بنائی ہوئی ٹکیہ سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ جو شاید وہ ہزاروں کی تعداد میں بنا چکا تھا۔ اس ٹکیہ میں کیا تھا.....؟ یہ بات ابھی تک صیغہ راز میں تھی.....!

نیلے رنگ کی کار میں ہمارا سفر شروع ہوا اور کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے وہ کار ایک مخصوص جگہ رک گئی۔ جہاں پہلے سے ہی کچھ گاڑیاں موجود تھیں۔ ہم نے فوراً ہی پہچان لیا' ان میں وہ سرکاری افسر بھی موجود تھے جو کل ہم سے ملاقات کرنے آئے تھے..... آپس میں سلام دعا ہوئی' ان کے ساتھ خفیہ فورس کے کارندے بھی تھے جو کہ اس وقت مخصوص قسم کے حفاظتی لباس میں تھے۔ یہ لوگ مکمل طور پر ہر قسم کی تیاری سے روانہ ہو رہے تھے۔

جلد ہی یہ قافلہ دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ آدھے گھنٹے تک مسلسل سفر کرنے کے بعد شہری

Digitized by Google

حدود سے باہر نکلنے لگے۔ یہاں چھوٹی پہاڑیوں اور گھنے درختوں کی قطاریں دکھائی دے رہی تھیں..... ان ہی درختوں کے درمیان میں ایک سالخوردہ عمارت دکھائی دی' یہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے اس قدر بوسیدہ تھی کہ اس پر نظر ڈالتے ہی جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑنے لگتی تھی' بلاشبہ یہ عمارت بے حد خوفناک تھی اور اسے دیکھ کر ذہن میں بھوت بنگلے کا ہی تصور ابھرتا تھا۔

ہماری گاڑیاں اس عمارت کے قریب ہی درختوں کی چھاؤں میں آرکیں' پھر سب ہی اتر پڑے تھے' پہلے اس عمارت کا جائزہ لیا گیا اور اس کے بعد دونوں سرکاری افسروں نے اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیں' ماتحتوں نے فوراً ہی گاڑیوں کے پچھلے حصے کھولے اور ان میں موجود سامان نکال لیا' ان میں جدید قسم کے جال تھے' ماسک تھے' سلیڈز رکھے اور چند اسی قسم کی چیزیں تھیں' پھر ہم لوگ وہیں کھڑے رہے تھے اور سارے ماتحت عمارت میں داخل ہونے کیلئے پوری طرح تیار ہو کر آگے بڑھ گئے۔ وہ لوگ شاید ان ہی کاموں کے ماہر تھے۔ اس لئے جلد ہی وہ تیز رفتاری کا مظاہر کرتے ہوئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب یہاں موجود لوگوں کو بے چینی سے نتیجے کا انتظار تھا' چنانچہ ٹہلتے ہوئے اور مختلف موضوعات پر باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ اپنا وقت گزارنے لگے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ سرکاری افسران کی توجہ خصوصی طور پر میری طرف تھی اور وہ میرے بارے میں جاننے کیلئے بے چین تھے۔ میں گول مول انداز میں ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

عین اسی وقت عمارت کی طرف سے ماتحت واپس آتے ہوئے دکھائی دیئے' ہم لوگ چوکنے ہو گئے' قریب آ کر انہوں نے سرکاری افسران سے کچھ کہا۔ فوراً ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور وہ میری اور فہد کی طرف متوجہ ہو گئے' پھر ان میں ایک نے نرم گرم لہجے میں کہا تھا:

''عمارت خالی پڑی ہے.....! ہمارا وقت بہت قیمتی ہے' جسے آپ نے ضائع کیا ہے..... اب بتائیں کہ کیا کرنا ہے.....؟ کیونکہ اندر تو چوہے کا بچہ بھی موجود نہیں ہے.....!''

☆.....☆.....☆

یہ خبر میرے لئے بے حد حیرت انگیز تھی کیونکہ صومانہ کی بتائی ہوئی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی تھی اور یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ عمارت خالی پڑی ہے..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے.....؟ کیا صومانہ کو کسی قسم کی غلط فہمی ہوئی تھی.....! لیکن وہ تو ایک جن زادی تھی..... سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی دھوکے کا شکار ہو جائے یا پھر وہ میری غلط رہنمائی کرنے کی کوشش کرے..... تو پھر.....؟ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ عمارت ان پرندوں کا مستقل ٹھکانہ نہ ہو اور صومانہ نے انہیں یہاں داخل ہوتے دیکھ کر جلد بازی سے کام لیا ہو اور انہیں یہاں دیکھتے ہی فوراً نکل کھڑی ہوئی ہو۔ بہرحال اس وقت تو ان سب کی تیز نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں' خود فہد بھی حیران و پریشان دکھائی دے رہا تھا..... ابھی میں نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ عین اسی وقت صومانہ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:

''آقا.....! پریشان نہ ہوں' ان لوگوں سے بولیں کہ اس عمارت میں جو تہہ خانہ ہے' اس میں اس مسئلے کے تمام حل موجود ہیں.....''

یہ سن کر گویا میری جان میں جان آئی' صومانہ کے یہ الفاظ گویا میرے لئے آب حیات سے کم نہیں تھے۔ ورنہ مجھے خوف تھا کہ کہیں یہ لوگ ہماری بے عزتی کے درپے نہ ہو جائیں.....

Digitized by

''آپ خاموش کیوں ہیں سلمان صاحب.....!'' وہی افسر دوبارہ بولا: ''جواب دیں.....ان تمام انتظامات میں بھی ہمارا کافی وقت صرف ہوا ہے۔''

''آپ نے جو اپنا قیمتی وقت اس سلسلے میں مجھے دیا ہے۔ میں اسے ضائع نہیں ہونے دوں گا اور مجھے اس کیلئے کسی قسم کا پچھتاوا بھی نہیں ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں.....؟''

''آپ کے ماتحتوں نے پوری عمارت کو کھنگال ڈالا' لیکن وہاں پر موجود تہہ خانے کا سراغ نہیں لگایا.....!'' میں نے جواب دیا۔

''تہہ خانہ.....!!'' نئی آوازیں ابھریں۔

''جی ہاں..... اس عمارت میں ایک خفیہ تہہ خانہ بھی موجود ہے' جس میں آپ کو شہر میں پھیلے ہوئے خوف اور مصائب کا واضح سراغ مل جائے گا.....!''

''اوہ.....تو یہ بات بھی ہے.....!'' ان کے منہ سے نکلا۔

''جی ہاں.....!'' میں نے پراعتماد انداز میں کہا۔

اب ان افسران کے ماتحت دوبارہ سے عمارت کی طرف بڑھے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ان میں سے ایک فرد کی واپسی ہوئی' اس کے چہرے پر عجیب سا جوش دکھائی دے رہا تھا' اس نے آتے ہی کہا:

''جناب عالی.....! آپ لوگوں کی بھی وہاں شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ اسی لئے میں آپ لوگوں کو لینے آیا ہوں.....''

''کیا تہہ خانہ موجود ہے وہاں.....؟''

''جی ہاں.....اور اس میں جو کچھ موجود ہے' وہ انتہائی حیرت انگیز ہے.....!''

یہ سنتے ہی افسران نے سر ہلایا اور پھر ہم لوگ بھی عمارت کی طرف بڑھے اور اندر داخل ہو گئے' ہمیں اندرونی حصے کی طرف لے جایا گیا اور پھر ماتحتوں کی رہنمائی میں ہم پچھلے حصے میں داخل ہو گئے' اس عمارت میں جگہ جگہ مٹی' ڈھول اور لکڑی کے جالوں کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے' ایک اسٹور میں داخل ہونے کے بعد ہم نے دیکھا کہ یہاں ایک کونے میں سیڑھیاں نیچے جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم لوگ نیچے اتر آئے۔ یہ ایک بڑا سا ہال تھا' جو بے حد صاف ستھرا تھا اور اس میں موجود سامان دیکھ کر سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی۔

یہاں ایک قطار میں چھوٹے چھوٹے لوہے کے پنجرے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں کافی تعداد میں وہی خونی پرندے موجود تھے۔ جنہوں نے شہر بھر کو یرغمال بنایا ہوا تھا.....لیکن اس وقت وہ سب قطعی بے حس و حرکت تھے اور اپنے اپنے پنجروں میں ساکت پڑے ہوئے تھے.....ان ہی پنجروں کے سامنے چند میزیں رکھی ہوئی تھیں' جن پر عجیب و غریب قسم کی مشینیں رکھی ہوئی تھیں اور ان کے قریب اسکرینیں بھی لگی ہوئی تھیں.....

اس ہال میں اس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔ لیکن یہاں کی نوعیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ جگہ کسی کے مستقل استعمال میں ہے..... اعلیٰ افسران کے ماتحت چاروں طرف بکھر گئے تھے اور بڑی چابکدستی سے اس عجیب و غریب سامان کا جائزہ لے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم لوگوں کو اطلاع دی گئی.....:

''حیرت انگیز جناب.....! بے حد حیرت انگیز.....! یہ خونی پرندے مصنوعی ہیں اور ان میں مشینری فٹ ہے..... یہ پورا کنٹرول روم ہے' جہاں سے ان پرندوں کو استعمال کیا جاتا ہے..... ان اسکرینوں کے ذریعے پورے شہر کو دیکھا جاسکتا ہے

Digitized by Google

اور ان ہی کے ذریعے یہ پرندے مخصوص مقامات تک بھیجے جاتے ہیں اور پھر ان کے ذریعے حملہ کروایا جاتا ہے.....''

اس رپورٹ نے سب ہی کو مبہوت کر دیا' کسی کرشمہ ساز کے اس کارنامے کو دیکھ کر سب ہی پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے..... لیکن وہ کرشمہ ساز کون تھا.....! اب یہ سوال ذہنوں میں گونج رہا تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ اسے اس کارروائی کا علم ہو گیا اور وہ فرار ہو گیا ہو.....!'' کسی نے خیال ظاہر کیا۔

''یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ فرد واحد ہو' یہ کام کسی گروپ کا بھی ہوسکتا ہے.....''

''ہاں..... بہرحال یہ جس کا بھی کام ہے' وہ نہایت اعلیٰ دماغ کا مالک ہے..... بے حد ذہین ہے وہ..... لیکن اس کی اتنی بڑی منصوبہ بندی کا مقصد کیا ہوسکتا ہے.....! آخر وہ شخص کیا چاہتا ہے اور یہ سب اس نے کیوں کیا ہے.....؟''

''کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ اس ویران اور اجاڑ علاقے میں یہ خونی کھیل کھیلا جا رہا ہوگا۔'' فہد کے منہ سے نکلا۔

میں اب تک خاموش ہی تھا اور میرا ذہن اس مجرم کے بارے میں سوچ میں گم تھا کہ جس نے اتنا بڑا بکھیڑا پھیلایا ہوا تھا اسی وقت سرکاری افسران میری طرف متوجہ ہو گئے:

''یہ سارا کمال آپ کا ہے سلمان صاحب..... اگر آپ کی نشاندہی نہ ہوتی تو یہ سب کچھ شاید ہماری نظروں سے اوجھل ہی رہتا اور یہ شہر کبھی بھی اس پریشانی سے آزاد نہ ہو پاتا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں آہستہ سے بولا: ''ہر فرعون کیلئے قانون قدرت نے موسیٰ کا اہتمام کر رکھا ہے..... جہاں شر ہوتا ہے وہاں خیر بھی کارفرما رہتی ہے..... ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملے کیلئے مجھے آگے بڑھایا گیا اور میری وساطت سے یہ مسئلہ حل ہوا.....''

وہ لوگ قائل ہو کر سر ہلانے لگے' پھر ایک افسر نے کہا:

''جب تک مجرم کو گرفتار نہیں کیا جاتا' اس معاملے کو خفیہ ہی رکھنا پڑے گا اور اس کیلئے یہاں کی مستقل نگرانی.....''

''ایک منٹ سر.....!'' ایک آواز گونجی اور افسر نے بات ادھوری رہ گئی۔ بولنے والا ایک ماتحت تھا اور اس کے ہاتھ میں سنہری رنگت کی ایک ڈائری تھی.....

''سر..... یہ ایک دراز سے ملی ہے۔'' ماتحت نے سرسراتے ہوئے انداز میں کہا: ''اور یہ ڈائری پروفیسر زیڈ کی ہے..... جی ہاں.....!!''

☆.....☆.....☆

یہ اس کیس کا دوسرا اہم انکشاف تھا' جس نے ہم لوگوں کو اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا تھا:

''اوہ..... اس کا مطلب یہ ہے کہ..... یہ سارا منصوبہ خود پروفیسر زیڈ کا ہی ترتیب دیا ہوا ہے۔'' ایک افسر کے منہ سے نکلا۔

''ہاں..... اور اس کا ثبوت یہ ڈائری ہے..... اوہ..... تو جس شخص نے یہ خونی کھیل ایجاد کیا ہے' اس وقت پورا شہر اس کی مٹھی میں ہے..... وہ اس وقت بھی لوگوں میں ان پرندوں کی حفاظت کیلئے اپنا دفاعی حربہ تقسیم کر رہا ہے۔''

''اوہ..... کتنی گہری سوچ ہے..... کتنی گہری چال ہے.....!''

''افسوس..... وہ ایک قابل سائنس کا پروفیسر تھا' لیکن اس نے اپنے وسیع تجربوں کو غلط راہ پر ڈال دیا.....!''

URDU TUBE ENTERTAINMENT www.urdutube.com

Digitized by Google

''لیکن اب اس کی گرفتاری کس طرح عمل میں آئے گی.....!''

اس سوال نے سب ہی کو سوچنے پر مجبور کر دیا' آخر کار میں نے زبان کھولی:

''یہ حقیقت ہے کہ اس وقت پروفیسر زیڈ نے اس شہر میں اپنی جو حیثیت بنالی ہے۔ اس کی بناء پر اسے گرفتار کرنا اور بھڑ کے چھتے کو چھیڑنا برابر ہے.....البتہ یہ طریقہ کافی مناسب ہے کہ اسے اسی جگہ پر آنے کے بعد حراست میں لیا جائے اور اس کے ساتھ ہی فوراً ٹی وی کی نشریات کے ذریعے لوگوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کیا جائے.....''

پھر باہم مشورے کے بعد ہم لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے' اب ہمارا رخ پولیس کے ہیڈ کوارٹر کی طرف تھا جبکہ ان لوگوں کی ٹیم اب بھی پرانی حویلی میں ہی موجود تھی۔

پھر مجھے اور فہد کو نہایت عزت اور احترام سے ایک آراستہ کمرے میں بٹھا دیا گیا' جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہماری خوب خاطر مدارات بھی کی گئی:

''آپ کے تو بڑے مزے ہیں آقا.....!'' اسی وقت صومانہ کی سرگوشی سنائی دی اور میں چونک کر دھیرے سے بولا:

''تم بھی کر لو مزے.....! کیونکہ یہ کارنامہ بھی تمہارا ہے.....!''

''آپ کی خوشی میری ہی تو خوشی ہے۔'' جواب ملا: ''آپ کی عزت حقیقت میں میری ہی عزت ہے.....''

''کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا.....؟'' فہد نے چونک کر پوچھا تھا۔

''نن.....نہیں.....'' میں بے ساختہ بولا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا:

''مجھے صرف ایک احساس تھا' لیکن اب اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔'' فہد نے مجھ سے کہا: ''اگر اس وقت آپ شہر میں نہیں آتے تو ہم لوگ نہ جانے کب تک اس مصیبت میں مبتلا رہتے.....شکر ہے کہ آپ کے قدم یہاں پر آنکلے.....!''

''جب خداوند کریم کو اپنے بندے سے کوئی کام لینا ہوتا ہے' تو پھر ایسے ہی اتفاقات وجود میں آتے ہیں' میں خود اپنے آپ میں ایک عام سا انسان ہوں.....''

''آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔'' وہ مسکرایا: ''اور یہ بھی آپ کے اعلیٰ ظرف ہونے کی مثال ہے.....''

''ہو سکتا ہے کہ آج رات کو شہر روشنیوں سے جگمگا اٹھے.....!'' میں نے کہا،

''آمین.....! ثم آمین.....!'' وہ خلوص سے بولا۔

''گاہے بہ گاہے پولیس کے افسران ہم سے ملنے کیلئے آرہے تھے اور ہمیں صورت حال سے آگاہ کر رہے تھے' اس دوران کچھ اور نئے چہرے بھی دکھائی دیئے' جنہوں نے ہم سے علیک سلیک کی تھی' ان کا تعلق بھی پولیس کے ہی ہیڈ کوارٹر سے تھا۔

اور پھر اس وقت اس محکمے کی مشینری حرکت میں آگئی' جب پروفیسر زیڈ نے سرکس گراؤنڈ سے اپنا کیمپ سمیٹ لیا' لوگوں کا اس وقت بھی یہ عالم تھا کہ وہ اس سے ملاقات کرنے کیلئے پاگل ہو رہے تھے.....

لیکن پروفیسر نے کہا:

''اب باقی لوگوں کو کل میرے پاس آنا ہوگا.....کیونکہ میں نے جتنے بھی حفاظتی پیکٹ بنا لئے تھے' وہ ختم ہو چکے ہیں.....!''

Digitized by Google

ایک گھنٹے بعد ہم لوگوں کو یہ اطلاع ملی کہ پروفیسر زیڈ کو اسی پرانی حویلی میں داخل ہوتے ہوئے حراست میں لے لیا گیا اور اسے بند گاڑی میں ڈال کر پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کے اعلیٰ حکام نے شہر کے چند معززین کو بھی مدعو کیا تاکہ انہیں اس صورتحال سے آگاہ کیا جائے' ٹی وی کی نشریات کے حوالے سے اور پریس والوں سے بھی رابطہ کیا گیا تھا۔

جلد ہی پروفیسر زیڈ نے اگل دیا کہ یہ سارا منصوبہ اس کا ذاتی تھا اور وہ کئی سالوں سے اس پر کام کر رہا تھا..... پرانی حویلی کافی عرصے سے اس کی نظروں میں تھی اور پھر اس نے اس عمارت کو اپنا مرکز بنایا تھا' وہ تنہا تھا اور اس نے خود ہی تمام انتظامات کئے تھے..... لیکن یہ بات کسی کے حلق سے نہیں اتر رہی تھی..... بہرحال یہ تو بعد کی بات تھی' ابھی تو اس شہر کے باسیوں کو اس واقعے سے آگاہ کرنا ضروری تھا..... چنانچہ افسران سے ایک میٹنگ کے بعد ہی پریس والوں نے خصوصی ضمیمے نکالنے کا بندوبست کر لیا..... دوسری طرف ٹی وی والے بھی اس کارروائی کو براہ راست دکھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے.....

یہ سارے کام رات نو بجے سے پہلے ہی طے ہو چکے تھے' اس لئے جب لوگوں کو اس بارے میں تفصیلات معلوم ہوئیں تو شہر میں ایک بھونچال سا آ گیا..... ہر کوئی انگشت بدنداں تھا..... ہر چہرے پر سوالات تھے..... لیکن ان الجھنوں کے باوجود بھی ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا..... ہر طرف جشن کا سماں دکھائی دے رہا تھا۔

میں پولیس کے افسران کو پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا کہ وہ میرا نام صیغہ راز میں رکھیں اور چونکہ میں نے ان سے کافی تاکید کی تھی اس لئے انہوں نے مجبوراً میری طرف سے خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن بہرحال مجھے زبردست قسم کا پروٹوکول دیا گیا تھا اور ان کی طرف سے مجھے بے حد سراہا گیا تھا۔

وہ رات..... اس شہر کی ایک یادگار رات تھی۔ مجھے خود بھی بے حد خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف تین دن ہوئے تھے' اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس شہر کے لوگوں کا کیا عالم ہوگا۔ جو نہ جانے کتنے عرصے سے اس عذاب میں مبتلا تھے..... واقعی..... یہ ایک ایسا عقدہ لاینحل تھا' جسے قدرت نے اپنے کرم سے حل کر دیا تھا اور اس نے مجھے اس کام کیلئے ذریعہ بنایا تھا۔ میں اور فہد پھر اپنے ہوٹل واپس آ گئے تھے..... یہاں آنے کے بعد ہم کافی دیر تک ہال میں ہی بیٹھے رہے اور ٹی وی کی اسکرین پر حالات حاضرہ کا پروگرام دیکھتے رہے' اس وقت ہر طرف اسی واقعے کا شور تھا اور اسی حساب سے چینل والوں نے بھی خصوصی پروگرام ترتیب دیا تھا۔

رات کو میں نے اور فہد نے ساتھ ہی کھانا کھایا' اس کے بعد ہم شہر کی سیر کیلئے نکل کھڑے ہوئے' جہاں ہر طرف خوشیوں کی برسات ہو رہی تھی اور بے پناہ روشنیوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ نہ کسی کو کوئی خوف رہا تھا اور نہ خونی پرندوں کا اندیشہ تھا..... اتنی رات گزر جانے کے بعد بھی ہر طرف دن کا سماں تھا..... اور پھر وہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی..... وقت کا پتا ہی نہیں لگ رہا تھا' لوگوں کی خوشیوں میں ڈوب کر کب صبح نمودار ہو گئی' اس کا احساس ہی نہ ہو سکا..... ہم نے اب ہوٹل کا رخ کیا' طے یہ ہوا کہ اب آرام کیا جائے..... چنانچہ میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا' صومانہ کو حاضر کر کے میں نے اسے خوش شاباش دی اور پھر لباس تبدیل کر کے بستر

Digitized by Google

پر ڈھیر ہو گیا' دن بھر کے بعد پھر رات کی جگار نے بھی تھکا دیا تھا' چنانچہ بے حد مزے کی نیند آئی.....

چونکہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا تھا۔ اس لئے میں نے روانگی کے بارے میں سوچا' اس ضمن میں میں نے فہد سے اپنی رائے کا اظہار کیا' اس نے مجھ سے کہا:

''بھئی..... اب آپ کی حیثیت معمولی نہیں ہے' میں آپ کو اس بارے میں کوئی مشورہ دینے کا حق نہیں رکھتا' البتہ میں آپ کی یہ بات آگے بڑھا دیتا ہوں..... پھر جو بھی جواب آیا میں اس سے آپ کو آگاہ کر دوں گا۔''

چنانچہ شام کے وقت فہد نے مجھے اطلاع دی:

''آپ اس شہر کے بے حد اہم اور معزز مہمان ہیں' اس لئے آپ کو پیشکش ہے کہ آپ جب تک چاہیں' یہاں ٹھہریں، سرکاری طور پر آپ کو سہولتیں فراہم کی جائیں گی..... اگر آپ یہاں مستقل رہنا چاہیں تو یہ شہر آپ کو خوش آمدید کہتا ہے.....''

''تم سب لوگوں کی اس عزت افزائی اور محبت کا بے پناہ شکریہ.....!'' میں نے مسکرا کر جواب دیا:

''لیکن میرا جانا بے حد ضروری ہے..... کیونکہ ایک ہی جگہ پر ٹھہر جانے سے میرا مشن ادھورا رہ جائے گا..... میرا اپنی منزل پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

''کسی میں آپ کو روکنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔'' فہد بولا: ''لیکن دو دن بعد عدالت پروفیسر زیڈ کا فیصلہ سنائے گی۔ سب کی خواہش ہے کہ آپ کم از کم وہ کارروائی ضرور دیکھیں.....!''

ناچار میں نے حامی بھر لی' اب اتنا تو ان بے چاروں کا حق تھا' ویسے ان کے خلوص سے میں بہت متاثر ہوا تھا' بلاشبہ یہ محبتوں بھرا شہر تھا.....!

اور پھر تیسرے دن میں ان ہی لوگوں کے ساتھ عدالت میں داخل ہوا' چونکہ میں افسران کے ساتھ تھا' اس لئے مجھے اندرونی حصے میں پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا' وگرنا یہاں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی..... اور اس کی وجہ پروفیسر زیڈ کی شخصیت تھی..... عدالت کے اس ہال نما کمرے میں ہمیں ایک نمایاں حصے میں کرسیوں پر بٹھا دیا گیا' عدالتی کارروائی کا آغاز ہو چکا تھا.....

تھوڑی دیر بعد ہی پروفیسر زیڈ کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا گیا..... ان دو ہی دنوں میں اس کی حالت کافی بدل چکی تھی' دبلا پتلا تو وہ پہلے ہی تھا' لیکن اس وقت وہ بالکل ڈھانچہ دکھائی دے رہا تھا..... اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں انتہا کی ویرانی دکھائی دے رہی تھی اور چہرے ستا ہوا تھا..... اسے دیکھتے ہی جوشیلے نوجوانوں نے غصے کا اظہار کیا اور اس کے خلاف نعرے بھی لگائے۔ جج نے ہتھوڑا ٹھونک کر انہیں خاموش کروایا' پھر اس نے پروفیسر زیڈ سے مخاطب ہو کر کہا:

''یہ عدالت تمہیں پھانسی کی سزا دے رہی ہے' کیا تمہارا کوئی وکیل ہے.....؟''

''نہیں..... میں اپنا وکیل خود ہی ہوں.....'' اس نے نخوت بھرے انداز میں کہا۔

''تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو.....؟''

''ہاں.....'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا:

''یہی سب کچھ کہنے کیلئے میں اب تک زندہ ہوں..... اگر لوگ میری قدر کرتے اور میری صلاحیتوں کا لوہا مانتے' تو آج میں یہاں نہ کھڑا ہوتا..... جو میرے ہم عصر تھے' انہوں نے میرے بارے میں مشہور کر رکھا تھا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں' خبطی ہوں اور جھکی ہوں..... کیونکہ وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں میں ترقی کر کے وہ مقام حاصل نہ کر لوں کہ جس کے بارے میں وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے..... چنانچہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب

Digitized by Google

رہے اور مجھے ہر جگہ سے دھتکارا گیا..... ظاہر ہے کہ ایک پاگل کو کون عزت دے گا.....؟ اس کی باتوں پر غور کون کرے گا.....! میں نے بہت ضبط کیا' صبر سے کام لیا' لیکن پھر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں بغاوت پر اتر آیا..... وہ مشینی پرندے میری ہی تخلیق ہیں اور میں نے انہیں دن رات ایک کر کے ایجاد کیا تھا..... اور پھر میں نے ان کا توڑ بھی نکالا..... میں منظر عام پر اس لئے آیا تھا کہ اب میرے دن شروع ہونے والے تھے..... ہاں..... میری فتح کے دن.....! وہ دن.....! کہ جب ہر طرف میرا ہی چرچا ہوتا' جب ہر سمت میں لوگ میری ہی طرف متوجہ ہوتے..... میں جو بھی حکم دیتا' اسے فوراً ہی تعمیل کا رتبہ مل جاتا..... میں اس شہر کو اپنا غلام بنالیتا..... لیکن افسوس.....!''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا' اس کی آواز رندھ گئی تھی' پورے ہال پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا تھا' تھوڑی دیر بعد پروفیسر زیڈ مجمع سے مخاطب ہوا:

''اے بے حس لوگو.....! تمہاری انا آخر کب ختم ہو گی.....؟ اگر کوئی شخص اہل ہے اور خداداد صلاحیتوں کا مالک ہے تو تم لوگ اس سے جلتے کیوں ہو.....؟ اس کے حوصلوں کو روند کیوں ڈالتے ہو.....؟ اس کے جذبات کا مذاق کیوں اڑاتے ہو.....؟ کیا تم لوگ ترقی نہیں کرنا چاہتے.....؟ اگر تم آگے بڑھنا چاہتے ہو تو پھر باصلاحیت لوگوں کی قدر کرو..... ان کا لوہا مانو.....! اگر تم قدر نہیں کرو گے تو پھر ان کا بھی وہی حال ہو گا' جو میرا ہوا ہے..... مجھے مجرم بنانے میں تم لوگوں کا ہاتھ ہے..... اور اصل مجرم تم لوگ خود ہی ہو.....! ہاں..... تم لوگ خود ہی مجرم ہو.....!''

یہ کہہ کر پروفیسر زیڈ خاموش ہو گیا' تھوڑی دیر بعد جج نے سوال کیا:

''کیا تمہیں اپنے جرم کا اقرار ہے.....؟

''ہاں..... میں نے یہ جرم کیا ہے.....! کئی لوگ بھی میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں.....!''

''ٹھیک ہے..... عدالت اب تمہیں سزا سنانے جا رہی ہے.....!''

''یہ کام بھی میں خود ہی کروں گا.....!'' پروفیسر زیڈ نے عجیب سے انداز میں مسکرا کر کہا: ''میں نے خود ہی جرم کیا ہے اور اب خود کو سزا میں بھی خود ہی دوں گا..... ان لوگوں کو میں نے اپنے دل کا حال سنانے کیلئے خود کو اتنی مہلت دی تھی..... میرے منہ میں اس وقت انتہائی زہریلا کیپسول ہے..... وہ میں حلق سے اتار رہا ہوں..... لو..... میں نے اپنے جرم کی خود ہی سزا..... پالی..... ہاں.....!!

یہ کہہ کر اس نے منہ چلایا اور پھر جلدی سے کوئی چیز نگلنے لگا..... پھر چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ وہ گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا..... سب لوگ اس کی طرف لپکے' لیکن اس نے واقعی تیز ترین زہر استعمال کیا تھا..... وہ دم توڑ چکا تھا اور اس کی باچھوں سے نیلے رنگ کے جھاگ باہر نکل رہے تھے.....

ایک موت کا سا سناٹا تھا' جو ہال میں طاری تھا' خود جج صاحب بھی ساکت تھے اور اس صورتحال پر ان کے ذہن نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

میں نے بھی ایک طویل سانس لی' یہ تھا اس غیر معمولی انسان کا غیر معمولی انجام..... پروفیسر زیڈ کو بھی میں شاید کبھی بھلا نہ سکوں..... میرے دل نے بے ساختہ یہی کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

میرے لئے یہاں رکنا اب محال تھا' پروفیسر زیڈ کے انجام نے میرا ذہن پراگندہ کر دیا تھا' چنانچہ دوسرے دن صبح میں نے رختِ سفر باندھ لیا اور فہد کو

Digitized by Google

اپنی روانگی سے مطلع کر دیا۔

''کیا آپ ان لوگوں کو آگاہ نہیں کریں گے.....! میرا مطلب ہے.....''

''تم خود ہی انہیں بتا دینا..... دن پر دن گزرتے جا رہے ہیں اور میرے کاموں میں حرج ہو رہا ہے..... اب اگر ان سے بھی ملوں گا تو مزید وقت نکل جائے گا..... بس تم انہیں میرے بارے میں بتا دینا..... پھر کبھی اس شہر میں آنا ہوا' تو ضرور ملاقات کروں گا.....''

''میں اک خلش رہ جائے گی سلمان صاحب.....!'' فہد پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

''کیسی خلش.....؟''

''شہر والے اپنے محسن سے ناواقف ہی رہ گئے' یہ کہانی لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ محفوظ رہے گی' لیکن اس کہانی کے ہیرو سے ہر کوئی لاعلم ہوگا..... کتنی عجیب بات ہوگی.....''

میں مسکرا دیا اور پھر میں نکلنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ عین اسی وقت دونوں سرکاری افسر آدھمکے۔ ان میں سے ایک مسکرا کر بولا:

''ہمیں معلوم تھا کہ آپ جانے کیلئے پر تول رہے ہوں گے..... اسی لئے ہم چلے آئے..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ دن اور یہاں رک جائیں.....؟''

''نہیں جناب..... میں چند وجوہات کی بناء پر معذرت چاہتا ہوں۔''

''ہم پھر بھی آپ کو مجبور نہیں کریں گے.....'' یہ کہہ کر اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا: ''آپ ہماری طرف سے یہ تحفہ رکھ لیں..... اب اسے آپ واپس مت کیجئے گا' یہ آپ کو لینا ہی ہوگا اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو جب بھی فرصت ملے اور آپ کو فراغت حاصل ہو تو آپ یہاں ضرور تشریف لائے گا..... ہماری آنکھیں اور ہمارے دل ہمیشہ آپ کے منتظر رہیں گے.....!''

میں نے لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا' پھر وہ باقاعدہ مجھ سے گلے ملے اور ان کے اس انداز سے عقیدت جھلک رہی تھی.....

میں نے ان سے اجازت چاہی اور باہر نکل آیا۔ انہوں نے مجھے گاڑی کی پیشکش کی تھی۔ جسے میں نے رد کر دیا تھا..... اب میں پھر سے اپنے سفر پر رواں دواں تھا..... اور پھر شام کے وقت میں سردار سچل کے گاؤں میں داخل ہو گیا' اسی وقت صوبانہ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:

''میرے آقا.....! یہ دو دن کا سفر تھا' جو آپ نے شام میں ہی طے کر لیا ہے.....!''

''واقعی.....!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں..... اگر آپ اپنے طور پر یہ سفر کرتے تو دو دن ہی لگ جاتے اور آپ کو تھکن بھی بے حد ہو جاتی..... اسی لئے میں نے اپنی قوتوں کا مظاہرہ کیا تھا اور اب آپ سورج ڈھلنے سے قبل ہی یہاں موجود ہیں.....!''

''تم واقعی حیرت انگیز ہو اور میرے لئے کافی کارآمد ثابت ہو رہی ہو.....!''

''آپ کو جلد یہاں لے کر آنے میں اپنی مرضی بھی شامل تھی.....!''

''کیوں.....؟ اس کی وجہ.....؟''

''وہی گلنار.....!'' صوبانہ کی کھلکھلاتی ہوئی آواز آئی اور میں خود بھی بے ساختہ ہنس پڑا۔

اب میں خیموں کے نزدیک پہنچ چکا تھا' جلد ہی مجھے سردار سچل کے آدمی نظر آ گئے' انہوں نے مجھے دیکھا اور فوراً ہی میری طرف لپکے اور بڑے ادب سے انہوں نے میرے ہاتھوں کو بوسے دیئے' فوراً ہی میری آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی

Digitized by Google

اور پھر مجھے سردار کے ساتھ ہی ساتھ گلنار کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ بھی دکھائی دیا.....

''کتنی شدت سے مجھے انتظار تھا.....'' گلنار کی آواز گلوگیر تھی: ''مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری دنیا ہی کہیں کھو گئی ہو.....!''

''بادشاہ سائیں.....! ایک خبر بھی آپ کیلئے تیار ہے.....!''

''وہ کیا.....؟''

''اندر چلیں..... آرام سے بیٹھیں' پھر بات ہو گی.....!'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا' گلنار کی آنکھیں تو مجھ پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں' اس وقت مجھے صومانہ کا خیال آیا' لیکن ابھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔

پھر ہم لوگ خیمے میں آ بیٹھے تھے' اسی وقت گلنار نے کہا:

''میں یہاں پر رہ کر کھانے پکانے بھی سیکھ رہی ہوں..... ورنہ میں اس معاملے میں بالکل ہی زیرو تھی.....!''

''ارے واہ.....!'' میں مسکرایا: ''یہ تو بڑی زبردست بات ہوئی ہے.....''

''ہاں..... بس.....'' سردار سچل نے ٹھوڑی کھجائی: ''گلنار بہن کے ہاتھ کے پراٹھے کھانا ذرا دل گردے کا کام ہے بادشاہ سائیں.....!''

''اچھا..... کیوں.....؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا اور گلنار جلدی سے بولی:

''ابھی زیادہ پریکٹس نہیں ہے نا..... اس لئے وہ ربڑ جیسے ہو جاتے ہیں.....!''

میرے حلق سے ایک دم ہی ایک قہقہہ بلند ہوا اور گلنار کھسیا کر رہ گئی' اسی وقت سردار سچل نے کہا:

''میری بہن روٹی بڑی شاندار بناتی ہے..... اور کھانے کا تو جواب ہی نہیں ہوتا..... پراٹھے کا ہی مسئلہ ہے بس' تھوڑے دنوں میں وہ بھی اچھا بننے لگے گا.....'' یہ سن کر گلنار شرما گئی' اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لگی۔

''اس لئے میں جا رہی ہوں' آج رات کا کھانا میں ہی بناؤں گی.....!'' گلنار یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پیار بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی' سردار نے اس کے جاتے ہی مجھ سے کہا:

''بادشاہ سائیں.....! یہ آپ کی نیکیوں کا تحفہ ملا ہے آپ کو..... یہ آپ کو اتنا چاہتی ہے کہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے..... دن رات آپ ہی کے نام کی مالا جپتی رہتی ہے.....!''

''مجھے اندازہ ہے.....'' میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا: ''اب مجھے بتاؤ کہ کون سی خبر ہے تمہارے پاس.....!''

''بادشاہ سائیں.....! خبر یہ ہے کہ وہ سالا شیطان کی اولاد بھاگ نکلا ہے.....''

''کون بھاگ نکلا ہے بھئی.....؟''

''وہ کون تھا..... ہاں..... اسٹول صاحب.....''

''ارے کرسی صاحب.....!'' میں نے چونک کر تصحیح کی۔

''ہاں..... ہاں..... وہی..... پولیس والے اسے جیل خانے لے جا رہے تھے وہ راستے میں ہی انہیں چکما دے کر فرار ہو گیا.....!'' سردار سچل نے انکشاف کیا۔

''اوہ..... یہ تو تم بہت بری خبر سنا رہے ہو.....'' میں نے کہا: ''کیا وہ اب بھی پولیس کے ہاتھ نہیں لگا.....!''

''نہیں سائیں.....! وہ تو تھا بھی بہت خطرناک آدمی..... یہ تو بس آپ کی کرامت تھی کہ وہ اس وقت آسانی سے میرے قابو میں آ گیا تھا.....

Digitized by

ورنہ اس کا تو چہرہ ہی بتا رہا تھا کہ وہ بہت عیار اور تیز طرار شخص ہے.....''

''خیر.....!'' میں نے طویل سانس لی: ''ہم نے تو اپنا کام خوش اسلوبی سے نبھایا' اب وہ جانے اور پولیس والے جانیں.....''

''یہ بات تو ٹھیک ہے بادشاہ سائیں.....!'' سردار نے سر ہلایا: ''اب ایک خوش خبری سن لو سائیں.....!''

''وہ بھی سنا دو.....!''

''شیطان کے پجاریوں کو گرفتار کروانے میں پولیس کی مدد کرنے پر یہ پورا علاقہ ہمیں الاٹ کر دیا گیا ہے.....اور ہمیں حکومت کی طرف سے قرضہ بھی ملنے والا ہے کہ جس کی بدولت ہم لوگ یہاں اپنے پکے مکانات بنوا سکیں گے.....!!''

''او.....زبردست.....!'' میری آنکھیں چمکنے لگیں: ''یہ تو واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے.....!''

''بس بادشاہ سائیں..... یہ سب آپ ہی کرم نوازی ہے.....'' وہ خاکسارانہ انداز میں بولا۔

اس وقت گلنار اور نصیباں نمودار ہوئیں' گلنار نے آواز لگائی:

''کھانا تیار ہے' آپ لوگ تشریف لے آئیں۔''

''چلیں بادشاہ سائیں.....!!'' سردار پچل مسکرایا: ''انگلیاں چاٹنے کا موقع آ گیا' اب دیکھو ان دونوں کا کمال.....!''

کھانا ساتھ والے خیمے میں لگایا گیا تھا' دستر خوان کئی طرح کے خوانوں سے سجا ہوا تھا' کھانا شروع ہوا اور تعریفوں کے پل باندھے گئے' کیونکہ کھانا واقعی بے حد لذیذ تھا۔

کھانے کے بعد ایک بار پھر محفل جم گئی' سردار پچل تو جان بوجھ کر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا تھا' میرے خیال میں وہ گلنار کی بے تابی کو محسوس کر رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

اب میں اور گلنار خیمے میں تنہا تھے' لیکن اس بات میں مجھے شک تھا' کیونکہ صومانہ کو نظر انداز کر دینا میرے لئے ممکن نہیں تھا' وہ ایک جن زادی تھی اور وہ جب چاہتی میری نظروں سے اوجھل ہو سکتی تھی.....اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہاں موجود ہے یا نہیں۔ سردار کے جانے کے بعد گلنار اٹھ کر میرے قریب آ بیٹھی اور بڑی محبت سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے انجان بن کر اس سے پوچھا:

''کیا دیکھ رہی ہو گلنار.....!''

اپنے آپ کو تلاش کر رہی ہوں' میں اندازہ لگا رہی ہوں کہ آپ کو بھی میری ضرورت ہے یا نہیں.....!''

''تو پھر کیا محسوس کیا.....؟''

''میں اس رتبے پر نہیں ہوں کہ آپ کے متعلق قیاس آرائی کروں.....میں تو کچھ بھی نہیں ہوں..... ایک گندی اور بری زندگی کو چھوڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا.....!''

''اچھا ہونے کیلئے ایک لمحہ ہی بہت ہوتا ہے۔ بشرطیکہ دل اور نیت صاف ہو..... بہرحال تمہاری بہت اہمیت ہے اور اسی لئے میں دوبارہ یہاں آیا ہوں تاکہ تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکوں.....البتہ اب ہمارا ایک اور بھی ہم سفر ہوگا.....''

''کون.....!'' وہ چونکی: ''سردار پچل.....؟''

''نہیں.....'' میں مسکرایا: ''اس کا نام صومانہ ہے.....!!''

''کون ہے وہ.....!'' گلنار کا چہرہ اتر گیا: ''کہاں ہے.....!''

''وہ تمہیں دکھائی نہیں دے گی' کیونکہ وہ ایک

Digitized by Google

جن زادی ہے..... اور وہ اس لئے ہمارے ساتھ ہے کہ عورتوں کی مدد کرنے کے صلے میں اسے اپنی قوم والوں کی طرف سے سزا ملی تھی' میں نے اسے رہائی دلائی ہے اور اب وہ تمہاری طرح میرے ساتھ ہوگی..... تم اور صومانہ..... دونوں مل کر مظلوم عورتوں کی مدد کروگی اور جہاں میری ضرورت پڑے گی' میں تمہاری مدد کروں گا.....''

''اوہ..... وہ جن زادی ہے.....!'' گلنار نے اطمینان کی سانس لی: ''اگر وہ کوئی عورت ہوتی تو اس وقت تو میرا دم ہی نکل جاتا.....!''

اس کا جملہ سن کر بے ساختہ میری ہنسی نکل گئی۔ عورت اس کیلئے تشویش کا باعث بن جاتی اور اس کے مقابلے میں ایک غیر مرئی مخلوق کیلئے وہ اطمینان کا اظہار کر رہی تھی..... پھر وہ مجھ سے میرے سفر کا احوال معلوم کرنے لگی' میں نے اسے مختصراً اندھیروں کے شہر کی کہانی سنائی' وہ حیران رہ گئی..... اور بولی:

''کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے.....؟ یہ واقعہ تو بے حد حیرت انگیز اور ناقابل یقین ہے.....؟''

''اس دنیا میں سبھی کچھ ممکن ہے..... یہاں کے اسرار و رموز کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں ہے..... یہ دنیا ایک ایسا سمندر ہے کہ جس کی گہرائی کا اندازہ کرنا ناممکن نہیں..... یہاں بہت کچھ دکھائی دیتا ہے اور بہت کچھ نظروں سے اوجھل ہے..... اور جو کچھ اوجھل ہے وہ ہماری کم علمی ہے.....!!''

''اب آپ کہاں چلیں گے.....؟'' تھوڑی دیر بعد گلنار نے پوچھا۔

''اس سلسلے میں میں صبح غور و خوض کروں گا' بہتر تو یہ ہے کہ ہم کسی جگہ کو اپنا مستقل مرکز بنالیں اور پھر وہیں سے اپنے کام کا آغاز کریں.....!''

''یہ واقعی بہت مناسب رہے گا..... میں اس بات کی تائید کرتی ہوں.....!''

''سردار سچل نے بتایا ہے کہ کرسی صاحب فرار ہو چکا ہے.....''

''جی ہاں.....! میں نے بھی یہی سنا ہے.....''

''کیا تمہیں اس خبر پر حیرت نہیں ہوئی تھی.....؟''

''میں ان سب کو بھلا دینا چاہتی ہوں.....'' گلنار نے کہا: ''کیونکہ میری گزشتہ زندگی کی کتاب بند ہو چکی ہے اور اب میں نے ایک نیا باب کھول دیا ہے..... میں تمام پرانی باتوں کو بھول جانا چاہتی ہوں۔

یہ سن کر میں نے سر ہلا دیا۔ پھر گلنار اٹھ کر چلی گئی اور میں بستر پر لیٹ گیا' عین اسی وقت مجھے صومانہ کا خیال آیا' میں نے اسے آواز دی:

''آقا.....! میں حاضر ہوں..... آپ نے مجھے یاد کیا ہے؟''

''ہاں..... کہاں ہو تم.....؟''

''میں دخل در معقولات نہیں ہونا چاہتی تھی' اس لئے آپ لوگوں سے دور تھی۔''

''اوہ..... اچھا یہ بتاؤ کہ گلنار کیسی لگی تمہیں.....!''

''بہت اچھی..... وہ آپ کو بے انتہا چاہتی ہے..... اور آپ کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی.....!'' اس نے پراعتماد انداز میں کہا۔

''شکریہ صومانہ.....!'' میں دھیرے سے مسکرایا۔ پھر میں نے سنجیدگی سے کہا: ''میں سوچ رہا ہوں کہ اب ہمارا کوئی مستقل ٹھکانہ ہونا چاہئے' تاکہ ہمارے کام کا آغاز ہو سکے..... کیا خیال ہے.....؟''

''جیسے آپ کا حکم ہو آقا.....! میں کوئی مناسب جگہ دیکھ کر آپ کو آگاہ کرتی ہوں..... پھر آپ اور گلنار میرے ہمراہ وہاں چلئے گا.....!''

Digitized by

''میں نے ابھی تک وہ لفافہ بھی نہیں کھولا ہے.....اس میں یقیناً کوئی رقم موجود ہوگی.....!''

''اس قسم کی کوئی ضرورت پڑی تو میں آپ کو مطلع کردوں گی.....!'' صومانہ نے کہا: ''لیکن مجھے معلوم ہے کہ میں ایک جن زادی ہوں' اس لئے ان معاملات سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہوتا.....!!''

یہ کہہ کر صومانہ نے سر کو خم کیا اور غائب ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن صبح کے وقت صومانہ نمودار ہوئی' اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولا:

''کیا ہوا صومانہ.....خیریت تو ہے.....؟''

''کیا بتاؤں آقا.....!'' اس نے ایک طویل سانس لی: ''میں کوئی مناسب جگہ دیکھنے کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں گھوم رہی تھی کہ ایک گاؤں میں مجھے بے حد افسوسناک منظر دکھائی دیا.....!''

''کیا منظر.....؟ کیا دیکھا تم نے.....؟''

''وہاں جرگہ بیٹھا ہوا تھا' ایک حسین لڑکی اور ایک جواں سال لڑکے کو بڑی ہولناک سزا سنائی جا رہی تھی.....انہیں 6 دن بعد زمین میں زندہ گاڑھ دیا جائے گا.....!!''

''زندہ گاڑ دیا جائے گا.....'' میرے نہ سے نکلا: ''لیکن کیوں.....؟''

''اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں ہے' کیونکہ اس صورتحال نے مجھے پریشان کر دیا تھا اور میں یہاں سے فوراً ہی نکل آئی۔'' صومانہ نے بتایا۔

''یہ تو تم نے واقعی بہت خوفناک خبر سنائی ہے.....'' میں نے سر ہلایا: ''ان دونوں سے ایسا کون سا جرم سرزد ہو گیا تھا' جو یہ سزا سنائی گئی ہے.....جس کو سوچ کر ہی دل و دماغ خوف سے کانپ اٹھیں.....!''

''میں تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہوں.....!''

''ہاں.....میں بھی سردار بچل سے معلوم کرتا ہوں' ہوسکتا ہے کہ اس کے علم میں یہ بات ہو' اس گاؤں کا نام کیا ہے.....؟''

''جھامرو نام ہے گاؤں.....اور وہ یہاں سے تقریباً چالیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے.....!''

''ٹھیک ہے.....میں سردار بچل سے بات کرتا ہوں.....!'' صومانہ سر ہلا کر غائب ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد سردار کی طرف سے خود ہی ناشتے کا بلاوا آ گیا' میں فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ناشتے کے دوران میں نے گاؤں کی نسبت سے اس واقعے کا ذکر چھیڑ دیا' سردار نے فوراً ہی سر ہلا کر تائید کی:

''ایسا یقیناً ہوا ہوگا.....کیونکہ ان اطراف میں یہ رواج عام ہے.....''

''لیکن کیوں.....؟'' میں نے حیرت سے پوچھا: ''یہ تو.....یہ تو ظلم ہے' بربریت ہے.....!''

''ہوسکتا ہے کہ آپ کا خیال ٹھیک ہو بادشاہ سائیں.....'' اس نے جواب دیا: ''لیکن یہ یہاں کی بہت پرانی روایت ہے اور اس کو کاروکاری کہتے ہیں.....''

''کاروکاری.....!!'' میرے منہ سے نکلا: ''اس کا مقصد کیا ہے.....؟ یہ کیا چیز ہے.....؟''

''یہ اس خطے کی ریت روایت کا حصہ ہے.....یہ ایک ایسی سزا ہے' جسے آپ بہت پرانی رسم بھی کہہ سکتے ہو.....یہ سزا اس گاؤں کا جرگہ تجویز کرتا ہے کہ جس گاؤں کی لڑکی کسی غیر اور اجنبی شخص سے محبت کرتی ہے' اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر دونوں طرف کے جرگے فیصلہ کرتے ہیں اور ان دونوں کو مشترکہ طور پر زندہ زمین میں گاڑھ دیا

Digitized by Google

جاتا ہے تاکہ ان کے اس بھیانک انجام سے دیکھنے والوں کو عبرت ملے اور آئندہ کوئی اور یہ قدم اٹھانے کے بارے میں سوچنے کی بھی ہمت نہ کر سکے۔''

میں سناٹے میں آ گیا' اس معاشرے کی تصویر کا یہ رخ دیکھ کر میری عقل دنگ رہ گئی تھی' کل رات میں میں نے اس دنیا کو خود ہی سمندر سے تشبیہ دی تھی اور گلنار سے کہا تھا کہ اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے..... لیکن کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے.....؟ کیا ان زندہ جاوید جسموں کو زمین قبول کر لیتی ہو گی.....؟ وہ زمین..... جو ماں کی گود جیسی ہوتی ہے..... لیکن وہ زمین نہ صرف انہیں قبول کرتی ہے کہ جن کا ساری دنیا ساتھ چھوڑ دیتی ہے..... تو پھر.....! یہ ظلم اس سے کیسے برداشت ہو جاتا ہو گا.....؟ محبت اور عشق تو اس دنیا کی خوبصورتی اور رعنائی کا حصہ ہیں..... محبت ہی کے دم سے کارخانہ حیات میں جاودانی ہے' ترنگ اور توانائی ہے..... محبت تو جینے کے ڈھنگ سکھاتی ہے اور زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کرتی ہے..... تو پھر اس محبت سے نفرت کرنے والے اور اسے جرم سمجھنے والے کون ہوئے.....؟

اور پھر یہ بات بھی سچ ہے کہ محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی' کوئی وطن نہیں ہوتا' کوئی مذہب نہیں ہوتا..... یہ تو وہ قدرتی عمل ہے کہ جس میں انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں..... دل ہے.....! جس پر بھی مر مٹے..... اب گلنار کی مثال سامنے تھی' وہ شیطانوں کے درمیان رہ کر کیا کچھ نہیں کر گزری تھی' میرے سامنے بھی وہ بے حیائی کا مظاہرہ کر چکی تھی' لیکن جب اس کے دل و دماغ نے پلٹا کھایا تو اس کے طور اطوار ہی بدل گئے' اس نے مجھ پر بھروسہ کیا اور اپنی پچھلی زندگی کو بھول کر نئی زندگی کا آغاز کر دیا تھا' تھی تو یہ وہی گلنار.....! لیکن اب سوچ کا فرق تھا' ارادے کی پختگی تھی اور اس نے اپنی منزل کو دیکھ لیا تھا.....

''کس سوچ میں ڈوب گئے بادشاہ سائیں.....!'' اچانک ہی سردار نچل کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔

''؟'' میں..... میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا سردار.....!'' میں نے جواب دیا: ''یہ تو سراسر ناانصافی اور بے رحمی ہے.....!''

''تم ٹھیک کہتے ہو سائیں.....!'' اس نے افسردہ انداز میں سر ہلایا: ''لیکن کس میں ہمت ہے کہ وہ اس جرگے سے ٹکرائے اور اسے ان بہیمانہ فیصلوں سے باز رکھے.....!''

''لیکن کسی کو آواز تو اٹھانی پڑے گی.....!'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا: ''چاہے وہ میں ہوں یا تم ہو.....!''

''میں یا آپ.....!'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا: ''مجھے ابھی صرف ان کی فکر ہے کہ جنہیں چھ دن بعد اس بھیانک صورتحال سے دو چار ہونا ہے.....!''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں سائیں.....؟''

''میں ان دونوں کو اس ظلم سے بچانا چاہتا ہوں۔'' میں نے بتایا: ''میں چاہتا ہوں کہ انہیں محبت کا پھل ملے' نا کہ اتنی کڑی اور بے رحم سزا کے وہ حقدار ہوں.....!''

''لیکن یہ کس طرح ہو گا سردار.....!''

''اس گاؤں میں تمہاری کوئی واقفیت ہے.....!''

''ہاں سائیں.....!'' اس نے فوراً ہی سر ہلایا: ''وہاں کا ایک زمیندار میرا بہت پرانا دوست ہے..... اور میں نے سنا ہے کہ وہ کچھ عرصے سے پریشان بھی ہے.....!''

''کیوں..... کیا ہوا.....؟''

Digitized by Google

''گاؤں میں اس کی بہت بڑی اراضی ہے' کئی ایکڑ زمین ہے اس کی ملکیت میں..... لیکن اب وہ زمین بنجر ہو کر رہ گئی ہے..... سنا ہے کہ پچھلے سالوں کے مقابلے میں اس سال اسے روپے میں چونی کا بھی فائدہ نہیں ہوا ہے..... فصلیں ہی نہیں ہوئیں تو منافع کہاں سے ہوگا.....!''

''ہوں.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا: ''اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے.....؟''

''اللہ سائیں کو خبر ہوگی.....'' اس نے کندھے اچکائے: ''اس نے تو ہر طرح کے طریقے آزمائے نہ جانے کون کون سی مہنگی ترین کھاد لا کر ڈال دی' لیکن مسئلہ اپنی ہی جگہ پر ہے..... وہ زمین بنجر ہو گئی تھی اور بنجر ہی رہی.....!''

''ہوں..... اگر ہم اس کے مہمان بن جائیں تو اس پر بوجھ تو نہیں ہوگا.....!''

''کیا بات کر رہے ہو بادشاہ سائیں.....!'' اس نے گویا برا مان کر کہا: ''آپ جیسی ہستی کسی پر بوجھ ہو سکتی ہے.....؟ آپ تو صحرا میں جائیں تو پھول کھلا دیں' آپ کی تو بات ہی نرالی ہے.....!''

''برا مت مانو' میں نے احتیاطاً پوچھا تھا۔'' میں جلدی سے بولا۔

''آپ تو ایسی بات سوچا بھی نہیں کرو..... جب تک سردار سچل زندہ ہے۔ آپ کو کسی قسم کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہونے دے گا۔ جان بھی دے دے گا آپ کیلئے.....!''

''ٹھیک ہے' اپنے اس دوست کو اطلاع کروا دو کہ ہم لوگ کل صبح اس کے یہاں پہنچ رہے ہیں' ہو سکتا ہے کہ اس کی فصلوں کے سلسلے میں بھی میں کوئی حل نکال سکوں..... کوشش کروں گا کہ اسے اس پریشانی سے نجات مل جائے۔''

''واہ..... آپ نے بول دیا۔ اب تو اس کا کام پکا ہے' دن پھر گئے بیچارے کے.....!''

''میں اپنی کوشش کروں گا بھئی.....!'' میں نے کہا: ''آگے کام رب العزت کا ہے.....''

''اور آپ ضرور کامیاب ہونگے' میری دعا ہے.....!''

میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اس گاؤں میں پہنچنے کا راستہ کھل گیا تھا اور اب وہاں پہنچنے کے بعد ہی صورتحال کا جائزہ لینا تھا اور ان دونوں معصوموں کی جان بچانی تھی' مجھے اندازہ تھا کہ یہ ایک بے حد مشکل کام ثابت ہوگا' لیکن میرا تو سفر ہی ظلم کے خلاف تھا' میرا شعار مظلوموں کی مدد کرنا تھا تو پھر اس واقعے سے میں کس طرح اپنی آنکھیں بند کر لیتا.....؟ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا.....! جب صومانہ نے مجھے اطلاع دی تھی تو اس وقت خود اس کا چہرہ بھی بتا رہا تھا کہ اس بات سے اسے بھی دکھ پہنچا ہے..... وہ تو جن زادی تھی..... میں تو پھر بھی گوشت پوست کا انسان تھا.....!

☆.....☆.....☆

دوسرے دن صبح سویرے میں اور سردار سچل جھامرو گاؤں کیلئے روانہ ہو گئے' گلنار کو ہم نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ البتہ صومانہ میرے ساتھ تھی اور میرے اس فیصلے پر وہ کافی خوش دکھائی دے رہی تھی' یعنی اس کی بھی منشاء یہی تھی کہ میں اس رسم کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں۔

سردار سچل کے دوست کا نام احسان تھا' وہ کافی ملنسار آدمی ثابت ہوا' اس نے اپنے گاؤں کی حدود میں ہی اپنا ملازم بھیج دیا تھا' جس کے ساتھ باقی سفر ہم نے بیل گاڑی میں طے کیا تھا..... یہ گاؤں بھی دوسرے روایتی علاقے کی طرح تھا' چاروں طرف سبزہ بکھیرا ہوا تھا' جن کی حدود ختم ہوتے ہی نوکیلی پہاڑیوں کی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں..... کئی جگہوں

Digitized by Google

پرنہریں' پن گھٹ اور مویشیوں کے ریوڑ دکھائی دے رہے تھے..... یہ کافی بڑے رقبے پر پھیلا ہوا گاؤں تھا..... اس میں زیادہ تر لال اینٹوں سے بنے ہوئے مکانات تھے' کچھ کچھ کچے بھی تھے' جن کے اوپری حصے چھتوں کے بجائے ٹاٹ کی بوریوں سے ڈھکے ہوئے تھے' لیکن ان کی تعداد کم ہی تھی..... یہاں بھینسوں کیلئے کئی باڑے بھی موجود تھے' راستے میں سردار سچل نے مجھے بتایا کہ اس گاؤں میں کافی تیزی سے ترقی عمل میں آئی ہے اور یہ ایک خوشحال اور خود کفیل علاقہ ہے..... یہاں کی فیصلوں کا اناج اور باڑھوں کا دودھ کئی شہروں میں سپلائی ہوتا ہے۔

احسان کا گھر کسی حویلی سے کم نہیں تھا' سردار سچل نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ احسان شادی شدہ ہے اور اس کی ایک نہیں بلکہ دو بیویاں ہیں اور دونوں اسی حویلی میں رہتی ہیں.....

ہمیں مہمان خانے میں بٹھا دیا گیا اور پھر فوراً ہی ہمیں لسی کے گلاس پیش کئے گئے' یہ یہاں کی روایت تھی کہ مہمان کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی اسے لسی پیش کر دی جاتی تھی اور میزبان بعد میں سامنے آتا تھا۔ پھر یہی ہوا' جیسے ہی ہمارے گلاسوں میں لسی کا اختتام ہوا' ہمارا میزبان مسکراتے ہوئے نمودار ہوا' گلے ملے' مصافحہ کیا اور علیک سلیک میں سردار سچل نے میرا تعارف کروایا:

''ان کا شمار بھی میرے دوستوں میں ہوتا ہے' یہ شہر میں رہتے ہیں' سلمان نام ہے ان کا.....!''

''کبھی ذکر نہیں ہوا ان کا.....!'' احسان نے مسکراتے ہوئے غور سے مجھے دیکھا۔

''ہماری دوستی زیادہ پرانی نہیں ہے.....'' سردار نے جواب دیا: ''انہیں گاؤں کی سیر کرنے کا بہت شوق تھا' یہ مجھ سے ملنے آئے تو میں نے سوچا کہ تمہارے گاؤں لے آؤں' تاکہ ان کی خواہش پوری ہو جائے..... بات یہ ہے کہ ان کا کہنا ٹالنا میرے لئے ممکن نہیں ہے' کیونکہ میں ایک مسئلے میں پھنس گیا تھا تو انہوں نے ہی میری مدد کی تھی اور اس پریشانی سے مجھے نکالا تھا۔ ارے احسان سائیں.....! یہ بڑے فیض والے ہیں' کوئی مسئلہ درپیش ہو تو انہیں ضرور بتانا.....!''

میں سردار سچل کی لفاظی پر حیران رہ گیا' کس طرح باتیں بگھار کر وہ اس شخص کو اپنے ڈھب پر لے کر آ رہا تھا..... احسان نے میری طرف دیکھا اور جلدی سے بولا:

''مشکل میں تو اس وقت میں بھی گرفتار ہوں..... بہت پریشان ہوں.....''

''مولا سائیں کرم کرے گا.....!'' سردار سچل بولا: ''سلمان صاحب بہت علم والے اور کرامت والے ہیں.....!''

''ٹھیک ہے..... میں بتا دوں گا' پہلے آپ تھوڑا آرام کریں' میں کھانا تیار کرواتا ہوں..... کھانے کے بعد آرام سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی.....!'' یہ کہہ کر احسان بڑے عاجزانہ انداز سے اجازت مانگ کر وہاں سے چلا گیا' اس کے جاتے ہی میں نے سردار سچل کو گھورا:

تم تو میرا چلتا پھرتا اشتہار بن سکتے ہو.....!''

کمال کر دیا تم نے.....!''

''بس سائیں.....!'' وہ انکساری سے بولا: ''پہلے گاڑیاں لوٹتا تھا' اب لوگوں کے دل لوٹنے کے چکر میں لگا رہتا ہوں.....''

مجھے ہنسی آ گئی' احسان نے بھرپور انداز میں ہماری خاطر مدارت کی تھی' وہ میری طرف بار بار متوجہ ہو رہا تھا' میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے اپنے دل کا حال بتانے کیلئے بہت بے چین ہے..... کھانے کے بعد میں نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا:

Digitized by Google

''ہاں تو احسان صاحب.....! اب آپ اپنی پریشانی سے آگاہ کریں.....؟ ہوسکتا ہے کہ میرے پاس اس کا کوئی حل موجود ہو۔''

''آمین.....!!'' سردار بچل بلند آواز میں بولا۔ ایک بار پھر میں نے اسے گھورا۔

''بات یہ ہے سلمان صاحب کہ میں اپنی زمینوں کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں' ایک وقت تھا کہ سب سے بڑی فصل میری ہی زمینوں سے اٹھتی تھی اور اس بات کے گواہ گاؤں کے علاوہ شہر کے وہ تاجر بھی تھے' جو میرا مال خریدتے تھے..... لیکن اب چند مہینوں سے نہ جانے میری فصلوں کو کس کی نظر کھا گئی ہے..... اور اب یہ حال ہے کہ میری وہ زمینیں بنجر پڑی ہیں..... میں نے ہر طریقہ استعمال کر لیا' جس نے جو بھی بتایا' وہ کر ڈالا' لیکن سب کچھ بے سود..... اگر یہی حال رہا تو میں تھوڑے ہی عرصے میں قلاش ہو جاؤں گا اور پھر ایسی بنجر زمینوں کو کون خریدے گا.....؟ اس وقت یہ حال ہے کہ ان فکروں میں میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں..... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں.....!!''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا' میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا..... تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا:

''اس صورتحال کو کتنا عرصہ ہوا ہے.....؟''

''کئی سال سے یہی حال ہے' میری کئی فصلیں تباہ ہو گئیں.....!''

''ہوں..... اور اس سے قبل آپ کی زمینیں بہت زرخیز تھیں؟''

''ہاں سلمان صاحب.....! اس بھینس کی طرح' جو اپنے وزن کے برابر دودھ دیتی ہے۔''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے سر ہلایا: ''مجھے آج رات کا موقع دیں' کل صبح میں آپ کو بتا سکوں گا کہ کیا کرنا ہے.....''

''اوہ.....'' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں: ''تو کیا میں امید رکھوں کہ میری زمینیں پھر سے سونا اگلنے لگیں گی.....؟''

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے۔'' میں نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے.....!'' احسان نے جواب دیا: ''کیا آپ گاؤں کی سیر کرنا چاہیں گے.....؟''

''بالکل.....!'' میں نے فوراً کہا: ''میرے آنے کی وجہ تو یہی ہے کہ میں گاؤں کے ماحول سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں..... یہ خالص قدرتی زندگی مجھے بے حد متاثر کرتی ہے۔''

''میرے لئے بے حد خوشی کا مقام ہوگا کہ میں ایک پردیسی انسان کو اپنے گاؤں کی خوبیوں اور اچھائیوں سے آگاہ کروں۔''

احسان نے خندہ پیشانی سے کہا اور پھر وہ ہمیں لے کر باہر نکل آیا۔

گاؤں واقعی بے حد دلفریب مناظر سے لبریز تھا۔ ہر طرف ہریالی بکھری ہوئی تھی' پھر احسان ہمیں اپنی زمینوں پر بھی لے گیا' وہ سچ ہی کہہ رہا تھا' جو ہریالی اور سبزہ دوسری جگہوں پر دکھائی دے رہا تھا وہ یہاں قطعی ناپید تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم ایک اجاڑ اور ویران میدان میں کھڑے ہوں' میں نے چاروں طرف معنی خیز انداز میں دیکھا اور پھر احسان سے مخاطب ہوا۔

''آپ واقعی بہت بڑی پریشانی کا شکار ہیں' یہاں آکر مجھے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے۔''

''دیکھ لیں آپ.....!'' اس کی آواز میں دکھ تھا: ''جس طرح میں برداشت کر رہا ہوں' اسے میرا دل ہی جانتا ہے.....!''

(اس دلچسپ داستان کے بقایا واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے)

Digitized by Google

تعارف

افتخار چوہدری

ادارہ

کنسٹرکشن میٹریل محض ریت بجری اور سیمنٹ کا ڈھیر ہوتا ہے، اسے گھر کسی صورت نہیں کہا جا سکتا۔اس میٹریل کو گھر میں تبدیل کرنے کے لیے ماہر کاریگر دن رات ایک کر دیتے ہیں، تب کہیں جا کر وہ رامیٹریل خوبصورت گھر کی صورت اختیار کرتا ہے۔

ایسے ہی اپنے فن میں یکتا جوہری بے ڈھنگے پتھر کے ڈھیلے کو تراش خراش کے بعد ہیرے کی شکل دیتا ہے، اور کمہار گارے کے لوندے کو گھومتے ہوئے چاک پر رکھ کر اپنی انگلیوں کی مہارت سے دیدزیب برتن میں ڈھال دیتا ہے۔

آپ دنیا کے کسی بھی شعبے کو دیکھ لیجیے را میٹریل کو خوبصورت اور آئیڈیل چیز میں بدلنے کے پیچھے زرخیز ذہن اور فنکار ہاتھوں کا کمال ہوتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں نئے لکھاریوں کی کھیپ را میٹریل جیسی ہوتی ہے بے شک یہ لوگ ہیرے جیسی خصوصیات کے اجزائے ترکیبی تو رکھتے ہیں مگر ایک بے ڈھنگے پتھر کی صورت، جنہیں ایک ماہر جوہری کے ہاتھوں تراش خراش کی ضرورت بحرحال ہوتی ہے۔

ہیرے تراشنے کے بعد چمکانے دمکانے کا یہی کمال ترین کام محترمہ منزہ سہام صاحبہ کے ہاتھوں سے سرانجام پا رہا ہے، وہ نا صرف سوشل میڈیا کے مدمقابل کتاب دوستی کے حق میں جنگ لڑ رہی ہیں بلکہ ایسے ہاتھ اور ذہن پیدا کر رہی ہیں جو اس مُلک خداداد کی علمی اور ثقافتی سرحدوں کی اپنی قلموں سے آبیاری کرنے اور دشمن ملک کی بے ہودہ ثقافتی یلغار کے سامنے بند باندھنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

میرے خیال میں یہی کام کسی مجاہدے سے کم نہیں تھا کہ کسی نو آموز لکھاری کو لفظ لفظ جوڑ کر کسی کردار کی شکل واضح کرنا سکھایا جائے، چہ جائیکہ میرے جیسے گمنام رائیٹرز کو تعارف کے لیے پیش کر دیا جائے جسے شاید اس کے پڑوسی بھی ٹھیک سے نہ جانتے ہوں، اور تحریریں،، معیاری،، جیسے باعزت لفظ سے تہی دامن ہوں۔

Digitized by Google

سچ پوچھیں تو ابھی تک مجھے یہی کنفرم نہیں ہے کہ میں رائیٹرز کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل بھی ہوں کے نہیں۔ ویسے بھی تعارف تعریف کی ایک ذیلی شاخ جیسے ہے جو نام والوں کا ہوتا ہے، مجھ جیسے حقیر پُرتقصیر بندہ ناچیز کا تعارف لکھوانا اور پھر چھاپنے جیسا رسک لینے کا کام لیجنڈ ادیب سہام مرزا کی بیٹی منزہ سہام صاحبہ جیسے دل گردے والی خاتون ہی کرسکتی ہے۔

تو لیجئے میرا تعارف حاضرِ خدمت ہے۔

جس دن ماہ دولت نے اس دنیا میں قدم رنجہ فرمایا اور اپنی سوجی ہوئی آنکھیں کھول کر رنگ و بو سے بھری ہوئی اس دنیا کو ایک نظرِ بے نیازی سے دیکھا تو وہ نئے سال کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ تھی، جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے دنیا جو نیو ہیپی ائیر کی خوشی مناتی ہے اس میں ہمارا پورا ہاتھ ہے۔

والدین کی پہلی اولادِ نرینہ ہونے کی خوشی میں بادام اور اخروٹ ملے گڑ کی کئی بوریاں پورے گاؤں میں تقسیم کی گئی، (ظلم کی انتہا ملاحظہ فرمائیں جس کی وجہ سے اتنا گڑ تقسیم ہوا اسے چکھا تک نہیں)ہاہاہاہا۔

تعلیم کی ابتدا سرکاری سکول سے کی اور بوائیلر انجینئرنگ کے ڈپلومے تک پہنچتے پہنچتے انتہا ہوگئی۔

میری ایک بہن اور دو بھائی ہیں، بہن مجھ سے چھوٹی ہے اور وہ اکیلی ہی سات بہنوں کے برابر ہے (ہاہاہاہا) اللہ کرے وہ یہ لائن نہ پڑھ لے ورنہ میری خیر نہیں ہے۔

وہ آرمی میڈیکل کور میں میجر کے رینک پر ہیں جبکہ بہنوئی ڈینٹل سرجن ہیں۔

بہن سے چھوٹے بھائی ٹیلر ماسٹر ہیں اور سب سے چھوٹے بھائی اور ان کی مسز بھی آرمی میڈیکل کور میں میجر ڈاکٹر کے رینک پر فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

اتفاق سے چاروں کی پوسٹنگ کراچی میں ہے اس لیے کسی دن ان سے ملنے کے بہانے سچی کہانیوں کے آفس چھاپہ مارنے کا ارادہ ہے تاکہ خود مشاہدہ کرسکوں کہ ہماری کہانیوں کا کیسے پوسٹمارٹم کیا جاتا ہے۔

میرے قبلہ و کعبہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں جبکہ بہن بھائی دنیا کے بہترین بہن بھائی ہیں اور شریک حیات اللہ نے مجھے ایسی دی ہے جیسی میں چاہتا تھا۔

میں بچپن میں لڑاکا یا شرارتی بالکل بھی نہیں تھا، بس خاموش طبع اداس اور سہما ہوا سا لڑکا تھا، سکول کے زمانے میں مارشل آرٹ کا شوق چرایا تو کو رین تائیکوانڈو میں ڈسٹرکٹ اور پنجاب کے بعد نیشنل چیمپئن آف پاکستان کا ماؤنٹ ایورسٹ سر کیا اسلام آباد سپورٹس بورڈ کی جانب سے ایران میں ہونے والی تہران گیمز میں پاکستان کی نمائندگی۔

میری فرشتہ صفت ماں کی دعاؤں سے زندگی کے ہر موڑ پر کامیابی میرے ہم رکاب رہی۔

اب ایک نامور فوڈ انڈسٹری میں جاب کر رہا ہوں۔

اس کے علاوہ آپ مجھے ٹو ان ون قسم کی کوئی چیز سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ میں نے باقاعدہ خطاطی سیکھی ہے، اس لیے بیک وقت رائٹر اور پینٹر (ہاہاہاہا کیسی رہی رائٹر اور پینٹر کی کیمسٹری)۔

ویسے آپس کی بات ہے میں اتفاقی طور پر رائٹر بنا ہوں، ہوا یوں کے سالوں پہلے کسی فارغ زمانے میں ایک تحریر لکھی تھی جو کتابوں کے ڈھیر میں کہیں گم پڑی رہی یا پھر عصرِ حاضر کے عظیم مزاح

Digitized by Google

نگار مشتاق یوسفی کے بقول پال میں لگی رہی۔

ایک دن اچانک وہ تحریر ہاتھ لگی تو اسے شائع کروانے کا سوچا قریبی دوست سے ذکر کیا تو اس نے مجھے ایک فون نمبر دیا، اور کہا کہ اس نمبر پر رابطہ کرو شاید بات بن جائے۔

میں نے فون کیا تو دوسری طرف ایڈیٹر صاحب تھے، اطمینان سے میری بات سننے کے بعد انہوں نے مجھے تحریر بھیجنے کے لیے کہا، اندھا کیا چاہے دو آنکھوں کے مصداق، میں نے فوراً بھیج دی۔

چند دن بعد ان کا فون آیا کہ تحریر تو جاندار ہے، مگر یہ سچی کہانیاں کے پیٹرن کے مطابق نہیں ہے، انہوں نے بہت خوبصورت الفاظ میں تحریر کی تعریف کی تو میں پھول کر کپا ہو گیا۔

انہوں نے مجھے اپنے پرچے کے مطابق لکھنے کے لیے کہا تو مجھے لگا کہ اگر میں نے واقعی نا لکھا تو اردو ادب ادھورا رہ جائے گا (ہاہاہاہا)

بحر حال اتنے بڑے رائٹر کی تعریف میرے لیے مہمیز کا کام کر گئی اب تک سچی کہانیاں، الف کتاب، (آن لائن) الفانوس سہ ماہی ادبی پرچہ) اور جلتا دیا میں میرے دو درجن کے قریب افسانے شائع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ تین ناول تخلیق کر چکا ہوں میں سمجھتا ہوں اگر اس دن ایڈیٹر صاحب سے بات نہ ہوتی تو شاید میں ابھی تک ایک بھی افسانہ نہ لکھ پاتا، میرے لکھنے کا کریڈٹ بحر حال انہیں کو جاتا ہے، مدت ہوئی ان سے بات ہوئے اگر ان کی نظر سے یہ تحریر گزرے تو میری طرف سے دونوں ایڑیاں جوڑ کر ٹھک کرتے ہوئے ایک جاندار سلیوٹ ان کے لیے۔

ان کے بعد موسٹ رسپیکٹ فل رائٹر اور ایڈیٹر ناصر رضا صاحب سچی کہانیوں میں آئے (اللہ پاک انہیں غریقِ رحمت کرے) انہوں نے خود فون کر کے اس ناچیز کی حوصلہ افزائی فرمائی، حال احوال پوچھا میرے تخلیق کیے ہوئے افسانوں کا نالے لے کے سراہا، اور مزید لکھنے کی ترغیب دیتے رہے، سردیوں کی میٹھی دھوپ جیسا وہ شفیق شخص ہماری آنکھوں کے سامنے خواب خیال ہو گیا اور ہم دیکھتے رہ گئے۔ شاید..... نہیں بلکہ یقیناً ہم سب کا ایک دن فل اینڈ فائنل ڈراپ سین یہی ہو گا۔

میں نئے لکھنے والوں سے التماس کروں گا کہ وہ جو کچھ بھی تخلیق کریں اس میں پازیٹو میسج ضرور ہونا چاہیے تاکہ پڑھنے والے آپ کے مشاہدے کا فائدہ اٹھا کر ٹھوکر کھائے بنا ہی سنبھل جائیں۔

اور آخر میں سچی کہانیوں کے ان تمام سینئر رائٹرز کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہیں پڑھ پڑھ کر میں نے سطریں سیدھی کرنا سیکھی ہیں۔ میرا بہت دل کر رہا ہے کہ میں ان تمام رائٹرز کا فرداً فرداً نام لے کر شکریہ ادا کروں مگر منزہ سہام صاحبہ کی قینچی میری آنکھوں کے سامنے ایسے گردش کر رہی ہے جیسے قربانی کے جانور کے سامنے چھری..... ذہن کے کسی گوشے میں یہ خوف بھی ناگ کی طرح پھن اٹھا رہا ہے کہ کہیں وہ یہ فتویٰ بھی نہ لگا دیں کہ تعارف کی چند لائنیں لکھنے کے لیے کیا کہا دیا موصوف تو کئی صفحوں پر ہی پھیل گئے ہیں۔

محترمہ منزہ سہام صاحبہ آپ جس طرح لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں پنپنے کا موقع فراہم کر رہی ہیں اس کے لیے آپ بے پناہ ستائش اور مبارک باد کی مستحق ہیں، یقیناً یہی مستحسن عمل آگے چل کر اس قبیلے کو کاروان کی شکل میں بدل کر رکھ دے گا جو اردو ادب کے لیے ثمر آور اور آپ کے لیے توشہ آخرت ثابت ہو گا۔

باقی رہے نام اللہ کا.....

☆☆.....☆☆

Digitized by

کراچی سے ارسال کردہ اچھوتی تحریر

انعم یا منعم

وہ اُن کی اکلوتی بیٹی تھی بے انتہا حسین اور

پھر اچانک وہ سب ہو گیا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا.....

سیمیں غزالہ نہاں

ہر ماں کو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی بڑی آرزو ہوتی ہے۔ وہ تو پالنے سے ہی اُس کو دولہا بنانے کے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ اور جیسے ہی بیٹا برسرِ روزگار ہوتا ہے اس کے لیے دلہن کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔

میرے ساتھ بھی یہ ہی ہوا..... میں گھر میں سب سے چھوٹا اور پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس لیے مجھے دولہا بنانے کے خواب دیکھنے میں امی کے ساتھ میری پانچوں بڑی بہنیں بھی شامل تھیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جیسے ہی مجھے ایک معقول ملازمت ملی ..... میری پانچوں بہنوں نے میرے لیے دلہن کی تلاش شروع کر دی۔

جبکہ میں ابھی اور اتنی جلدی شادی کے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا میں ابھی آزاد رہ کر زندگی انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ مگر جس شدت سے امی کو پوتا کھلانے کا ارمان تھا۔ میری بہنوں کو بھی بھتیجا بھتیجی کا شوق تھا۔ اس لیے میرے نہیں نہیں کرنے کے باوجود مجھے شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔

بہر حال میری والدہ اور بہنوں کی پسند بہت اچھی تھی۔ جو مجھے بھی پسند آئی اور بہت جلدی ہماری ڈیٹی ہم آہنگی ہو گئی۔ میری طرح میری بیوی بھی شوخ چنچل تھی اور وہ بھی آزادی سے زندگی انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ وہ ابھی بچوں کے چکر میں اتنی جلدی پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔

میری دادی اماں کا کہنا تھا کہ جوڑے آسمانوں پر طے ہوتے ہیں اور جب نئی روح کو دنیا میں آنا ہوتا ہے تو..... ان کا ملاپ زمین پر ہو جاتا ہے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ہماری خواہش نہ ہونے کے باوجود میرے بیوی کے یہاں 'خوشخبری' ہو گئی۔

جس سے مجھ سے زیادہ میری ماں بہنوں کو خوشی ہوئی۔ قصہ مختصر کہ ابھی شادی کو سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک جیتی جاگتی پیاری سی گڑیا میری بیوی کی گود میں آ گئی۔

کہاں تو ہم دونوں میاں بیوی ابھی بچوں کی ذمہ داریاں قبول کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر بچی کی صورت دیکھتے ہی وہ ہمیں بہت عزیز ہو گئی واقعی اللہ

Digitized by

تعالیٰ نے اولاد کی صورت میں بہترین رحمت اور نعمت بنائی ہے۔

بچی گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اور جیسے جیسے بڑی ہورہی تھی۔ اس کی خوبصورتی بھی بڑھتی جارہی تھی یا ہم دونوں کو وہ سب سے زیادہ حسین سب سے زیادہ پیاری لگتی تھی۔

اس بچی کی خاطر میری بہنیں اپنی سسرال سے جلدی جلدی آنے لگیں تھیں اور اس سے خوب لاڈ کرتیں اس کا نام ہم نے 'انعمت' یعنی اللہ کا انعام رکھا..... اس کو سب پیار سے انعم کہتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بچی دو سال کی ہوگئی۔ اب میرے گھر والوں کی خواہش تھی کہ انعم کا بھائی بھی جلدی سے آجائے۔ میری والدہ کو پوتی کا شوق پورا ہونے کے بعد پوتا کھلانے کی شدید آرزو ہوگئی تھی۔ ایک دفعہ پھر ان کا مطالبہ زور پکڑنے لگا تھا۔ نہ صرف میرے گھر والے بلکہ سب دوست احباب اور رشتہ داروں کا بھی یہ ہی کہنا تھا کہ ایک بیٹا بھی ہوجائے تو فیملی مکمل ہوجائے گی۔ ہمارے معاشرے میں جب تک لڑکی لڑکے کی شادی نہ ہو ہر ایک کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا ہے۔

''کہیں رشتہ لگا؟''

''کوئی بات بنی؟''

پھر جب شادی ہوجاتی ہے تو یہ سوال ہر ایک کے لبوں پر مچلتا رہتا ہے۔

''کوئی خوش خبری؟''

جب خوشخبری ہوجائے تو اگر بیٹا ہے تو بیٹی کی دعائیں شروع ہوجاتی ہیں اگر پہلی بیٹی ہو تو اور بھی شدت سے بیٹے کا مطالبہ ہونے لگتا ہے۔ بیٹا اور بیٹی دونوں ہوجائیں تو پھر ہر ایک سے یہ سننا پڑتا ہے۔

''صرف دو اولادیں؟''

''بھئی دو تو اور ہونے چاہئیں۔ بیٹی کے لیے بہن اور بیٹے کے لیے ایک بھائی تو ضروری

URDU TUBE
A WORLD OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

Digitized by Google

ہے۔''

''گویا کسی حال میں چین نہیں..... یہ انسان کی فطرت ہے۔''

ایسے ہی سوالوں کا ہمیں بھی سامنا کرنا پڑ رہا تھا..... اور ہم دونوں میاں بیوی..... ہر ایک کو یہ کہہ کر ٹالتے رہتے کہ.....

''اتنی جلدی نہیں..... ابھی نہیں۔ مگر ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ابھی نہیں' کبھی نہیں' میں بدل جائے گا۔

ہوا یہ کہ میری بیٹی کی تیسری سالگرہ تھی۔ ہم اپنی بچی کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے مناتے تھے۔ فیملی کے خاص خاص لوگ اور کچھ دوست مدعو تھے سب لوگ بہت خوش تھے..... گھر کے وسیع لاؤنج میں انتظام کیا گیا تھا سب مہمان آ چکے تھے۔ میری بیوی اوپر اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی۔ اس نے آج کی تقریب کے لیے بہت خوبصورت بلیو رنگ کی سلک کی ساڑھی خریدی تھی۔ جو اس کے گورے رنگ پر خوب جچ رہی تھی۔

وہ تیار ہو کر اوپر سے اتر رہی تھی کہ نجانے کس طرح اس کی سینڈل کی پنسل ہیل سیڑھیوں میں کہیں پھنس گئی اُس کا توازن بگڑا اور وہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آ گری۔ میں نے جلدی سے اُس کو گاڑی میں ڈالا اور ایمرجنسی میں اسپتال پہنچا۔ وہ گرتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی دراصل سیڑھیوں کا کنارہ اس کے پیٹ میں اس طرح لگا تھا کہ اس کا اندرونی نظام بری طرح مجروح ہو گیا تھا۔ ایمرجنسی میں اُس کا آپریشن ہوا۔ تقریب کی خوشیاں ماند پڑ گئیں۔

میری بہنوں نے گھر پر آئے ہوئے مہمانوں کو سنبھالا اور اُن کو کھلا پلا کے رخصت کر کے سب ہاسپٹل پہنچ گئے۔ میری بیوی کی جان تو بچ گئی مگر وہ آئندہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی۔ اور ہم دونوں کا یہ کہنا 'ابھی نہیں' کبھی نہیں میں تبدیل ہو گیا۔

میری بیوی کی مکمل صحت یابی میں تین مہینے لگ گئے اور جب اس کو اپنی محرومی کا پتہ چلا تو بہت روئی..... مگر اب کیا ہو سکتا تھا..... ہم دونوں کو اپنے بیٹے کی خواہش تو تھی۔ مگر ہم نے قدرت کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے فیصلے کو ٹالا تھا اس لیے اللہ نے ہمیں یہ سزا دی کہ ہم دوبارہ اولاد کی خوشی ہی نہ دیکھ سکیں۔

قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں..... اس میں خلل ڈالنے والا سراسر نقصان میں رہتا ہے..... مگر اب کیا ہو سکتا تھا سوائے توبہ اور استغفار کے..... سو اب ہم ہر وقت اللہ سے معافی مانگتے رہتے۔

بچی کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہو رہی تھی' اس کی ہر ضرورت اس کے کہنے سے پہلے ہی پوری ہو جاتی..... ہم اس کے ہونٹوں کی جنبش سے اس کی خواہشات کو سمجھ لیتے اور فوراً پوری کر دیتے۔ کہتے ہیں انسان کے پاس ایک ہی دولت رہ سکتی ہے اولاد یا روپیہ پیسہ ہمارے پاس روپیہ اور پیسہ تو بہت تھا لیکن اولاد جیسی دولت صرف ایک بیٹی تھی۔ بہر حال اب ہم نے صبر و شکر سے ہی کام لینا تھا۔

چند سال یونہی گزر گئے..... میرے والدین بھی داغ مفارقت دے گئے۔ والدین کے ترکے میں سے جو حصہ ملا اس سے میں نے اپنا الگ گھر خرید لیا اور ناظم آباد کے علاقے سے گلشن میں شفٹ ہو گئے۔ اسی دوران میری بیوی کو بھی والدین کے ترکے میں سے حصہ ملا جو میرے حصے

Digitized by

سے کئی گنا زیادہ تھا..... دراصل اس کے والدین بہت پیسے والے تھے..... اس لیے اس کو بہت زیادہ ملا۔

اب تو میری بچی کروڑ پتی والدین کی اولاد ہوگئی تھی۔ اس لیے اس کی پرورش اور بھی ناز و نعم میں ہونے لگی' اب اس کی عمر تقریباً آٹھ سال ہوگئی تھی۔ وہ اکثر پیٹ میں درد کی شکایت کرتی' اس کو ہم نے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کوئی خاص بیماری یا وجہ تشخیص نہیں ہوئی۔

بچی بڑی ہورہی تھی مگر اب اس کی عادتوں میں نمایاں تبدیلی محسوس ہورہی تھی۔ وہ سب سے الگ تھلگ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہنے لگی۔ زیادہ بات چیت بھی نہیں کرتی اور رشتہ داروں سے ملنے جلنے سے بھی کترانے لگی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی سہیلیوں سے بھی میل جول ختم کردیا۔

ہم نے اس کی تبدیلی کو اس کی بہن بھائی نہ ہونے کی محرومی سمجھا اس لیے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔

پھر اس نے لڑکیوں کے ڈریس کو چھوڑ کر لڑکوں والے کپڑے پہننے شروع کردیے اپنی ماں سے ضد کرکے نئی شرٹ اور جینز خریدنے لگی اور استعمال بھی کرنے لگی۔

ہم فیشن ایبل تو تھے مگر کبھی مغربی اطوار نہیں اپنائے تھے۔ ہم لوگ مشرقی روایات پر پابند تھے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیاں مغربی ڈریس نہیں پہنتی تھیں۔ اس کی ہمارے بڑوں کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ مگر میری بچی کو جب دوپٹہ اوڑھانے کا وقت آرہا تھا تو اس نے ایسے لباس پہننے شروع کردیے تھے جو عریاں محسوس ہوتے تھے۔ ہمیں اس کی یہ تبدیلی اور روش پسند نہیں آئی اور ہم نے اس کو روکنا ٹوکنا شروع کردیا۔

مگر اب وہ ہماری بات نہیں سنتی تھی۔ بلکہ اب تو وہ ہم سے بات ہی نہیں کرتی تھی اب تو وہ کھانا بھی ہمارے ساتھ نہیں کھاتی تھی اپنے کمرے میں اکیلی الگ کھاتی تھی..... وہ خودسر ہوتی جارہی تھی۔

اس کے چہرے سے لڑکیوں والی معصومیت اور خوبصورتی ماند پڑتی جارہی تھی۔ ہم اس سے بات کرنا چاہتے مگر وہ اپنا کمرہ بند کیے رکھتی۔ میری بیوی کا خیال تھا کہ کسی نے کچھ کردیا ہے یا کسی کی نظر بد کا شکار ہوگئی ہے۔ ابھی وہ اس کا حل سوچ ہی رہی تھی کہ اس کے اسکول سے بھی شکایتیں آنے لگیں کہ وہ لڑکیوں والی روش چھوڑ کر لڑکوں جیسی حرکتیں کرنے لگی ہے اور لڑکوں سے دوستی بڑھانے لگی ہے ایسی عادتیں دیکھ کر کلاس کی لڑکیوں نے خود ہی دوستی چھوڑ دی اسکول کو ایجوکیشن تھا وہاں تو لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔

ہم دونوں میاں بیوی نے اس سے باز پرس کی تو اس نے اسکول جانا ہی چھوڑ دیا۔ زبردستی اور سختی سے اس کو پاس بٹھا کر اس کا مسئلہ جاننا چاہا تو رونے لگی اور بولی۔

"کسی سے بات کرنے کا دل نہیں چاہتا....." ہم نے اس دن اس کو غور سے دیکھا تو اس کے چہرے پر واقعی تبدیلی نظر آئی۔ اور ہم دونوں انجانے اندیشوں میں گھر گئے۔ وہ نفسیاتی مریض نظر آنے لگی تھی۔

اس دن اتفاق سے میری بڑی بہن کی بہو جو ڈاکٹر تھی ملنے آگئی ہم دونوں میاں بیوی نے اس کا مسئلہ بتا کر مشورہ مانگا۔

اور جب وہ اس سے ملی تو چونک گئی پھر اس

Digitized by Google

نے جو کچھ ہمیں بتایا تو اس کو سن کر ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے بتایا۔

''ماموں جان اس لڑکی میں واضح طور پر جنس تبدیل ہونے کی نشانیاں پیدا ہو رہی ہیں..... اس کے جسم میں مردانہ ہارمونز نشوونما پا رہے ہیں..... ہوسکتا ہے اس کی جنس مکمل طور پر تبدیل ہو جائے اور یہ لڑکی سے لڑکا بن جائے..... اور اگر ایسا خود بخود نہ ہوا تو نہ یہ لڑکی رہے گی اور نہ لڑکا..... اور یہ بہت تکلیف دہ ہوگا..... آپ کے لیے بھی اور اس کے لیے بھی..... بہتر یہ ہوگا کہ اس کا آپریشن کروالیا جائے۔''

پھر اس نے ایک ڈاکٹر کا پتہ دیا کہ اس سے مل کر مشورہ کرلیں۔ ابھی ہم لوگ اسی کشمکش میں تھے کہ کیا کیا جائے کہ ایک دن اچانک اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا اور ایمرجنسی میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا جس کا میری بہن کی بہو نے بتایا تھا۔

اس ڈاکٹر نے بھی وہی بتایا جو میری بھانجی بہو نے بتایا تھا۔ اس نے کہا کہ اس میں مردانہ ہارمونز مکمل طور پر نشوونما پا چکے ہیں اور آپریشن ضروری ہے اور یہ کہ اگر آپ افورڈ کرسکتے ہیں تو بیرون ملک خصوصی طور پر کینیڈا لے کر جائیں وہاں اس قسم کا آپریشن بہت کامیابی سے ہوتا ہے اور اس سلسلے میں وہ ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہیں۔

ڈاکٹر نے اس کے کچھ ٹیسٹ کروائے اور رپورٹ انہوں نے خود کینیڈا بھیجنے کی ذمہ داری قبول کی۔

ہمارے لیے یہ زیادہ بہتر تھا کہ اس کا آپریشن بیرون ملک میں ہی ہو..... کیونکہ ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ لوگوں کو اس طرح کی باتیں ہضم نہیں ہوتیں' وہ سوالات کر کر کے ہمارا اور اس کا جینا دوبھر کردیتے..... ذلت اور خواری الگ ہوتی' میری بھانجی بہو بھی پیشہ وارانہ اصول کے تحت رازداری کا وعدہ کرچکی تھی۔

سرمائے کی ہمارے پاس کمی نہیں تھی۔ جو کچھ بھی تھا سب اسی بچی کے لیے تھا میڈیکل مسئلے کی وجہ سے ویزا بھی آسانی سے مل گیا پھر ہم نے چپکے چپکے کینیڈا جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔

کینیڈا میں اس کا فوری آپریشن ہوا اور اس کی جنس مکمل تبدیل ہوگئی اب انعم نہیں بلکہ منعم میں تبدیل ہوگیا۔ جی ہاں ہم نے اس کا نام منعم ہی رکھا۔ ہم نے کوششیں کرکے اس کو وہاں کے بہترین تعلیمی ادارے میں داخلہ دلوادیا اور ہاسٹل میں رہائش کا انتظام کرکے پاکستان واپس آگئے۔

پاکستان واپس آکر ہم نے یہ مشہور کردیا کہ انعم کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا ہے ہمارے خیال میں یہ جھوٹ بھی نہیں تھا کیونکہ انعم تو اب ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی تھی۔

یہاں آکر میں نے سب سے پہلے اپنی ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست دی اور چپکے چپکے اپنی سب جائیداد بیچنا شروع کردیں ساتھ ہی ہم نے کینیڈا کے امیگریشن کے لیے اپلائی کردیا۔ اور بیوی کے علاج کا بہانہ بنا کر وزٹ ویزے پر کینیڈا آگئے..... کچھ عرصہ اسی طرح چلتا رہا اس کے بعد کینیڈا کی امیگریشن مل گئی تو ہم لوگ یہاں شفٹ ہوگئے یہاں آکر پاکستان میں یہ مشہور کردیا کہ میری بیوی کو بیٹا ہوا ہے جس کا نام منعم رکھا گیا ہے۔

ایسا ہم نے لوگوں کے سوالات سے بچنے کے

Digitized by

لیے کیا تھا..... کیونکہ پھر تو سب کیوں؟ کیسے؟ اور کب؟ جیسے سوالات کر کر کے ہمیں اور ہمارے بچے کو پریشان کر دیتے پھر کچھ لوگ مذاق کا نشانہ بناتے کچھ ہمیں گناہوں کی سزا کا مستحق ٹھہراتے۔ اور نجانے کیا کیا باتیں ہوتیں جو ہمارے بچے کے مستقبل پر اثر انداز ہوتیں۔

یہ ہی سب سوچ کے ہم نے پورے خاندان سے کٹ کر رہنے کا فیصلہ کیا اور پورے بیس سال تک وطن واپس آنے سے گریز کیا وقت بھی اتنی تیزی سے گزرا کہ پتہ ہی نہیں چلا۔

اب منعم کی عمر تقریباً تینتیس سال ہو رہی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی بڑھاپے کی منزل پر پہنچ گئے تھے منعم اپنی نئی زندگی سے مطمئن تھا اور اب اپنی تعلیم مکمل کر کے ملازمت بھی کر رہا تھا۔

اس کو اپنی کلاس فیلو اسپینش مسلمان لڑکی پسند آ گئی تھی اور دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ لڑکی بھی ایک حادثے میں ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی اور اس نے اپنے بارے میں سب کچھ سچ بتا دیا تھا' اب ہمیں یہ نہیں معلوم کہ منعم نے اپنے بارے میں سب کچھ سچ بتایا تھا یا نہیں' بہر حال دونوں کی شادی ہو گئی اس افسانوی کہانی کے پورا ہونے کے بعد ہمیں اپنے وطن کی یاد ستانے لگی تو ہم نے وطن واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔

میری بہن کی ڈاکٹر بہو نے اپنے پیشہ وارانہ فرائض کا پاس رکھتے ہوئے اس راز کو کسی پر نہیں کھولا تھا اس لیے یہاں کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا لیکن میں نے اپنی اس بڑی بہن کے سامنے اس راز سے پردہ اٹھایا تو رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہو گیا۔ اور لوگ انعم سے منعم بننے کی کہانی جان گئے۔ اب لوگ بلا ٹکٹ تماشہ لگانے لگے اور ہر کوئی ہم سے ملنے کے بہانے انعم سے منعم بننے کی کہانی سننے کا مطالبہ کرنے لگے ان کے سوالات ایسے تفتیشی انداز میں ہوتے جیسے ہم نے یا ہماری بچی نے کوئی جرم کیا تھا۔ اب تو وہ راز جو ہم نے خود سے بھی چھپایا تھا طشت از بام ہو گیا تھا۔ اچھا ہوا منعم ہمارے ساتھ پاکستان نہیں آیا تھا ورنہ تو لوگ اس کا جینا بھی حرام کر دیتے۔

ہمیں اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ ایک تو ہم نے قدرت کے فیصلے میں رکاوٹ ڈالی' اللہ نے ہمارے نصیب میں رحمت اور نعمت دونوں لکھی تھی۔ مگر ہم نے دنیاوی تدبیریں کر کے اس کو ٹال دیا پھر انعم سے منعم بننے کی کہانی کو انعم کو مار کے انعام کے پیدا ہونے کا افسانہ بنا دیا۔

''اللہ کہتا ہے (مفہوم) اے میرے بندے اگر تو میری رضا پر راضی نہ ہو گا اور اپنی مرضی کے فیصلے چاہے گا تو میں تجھے تیری چاہت میں تھکا دوں گا پھر ہو گا وہی جو میں چاہتا ہوں اور اگر تو میری رضا میں راضی ہو گا تو میں وہ بھی عطا کروں گا جس کی تجھے چاہت ہے اور وہ بھی دوں گا جو میری رضا ہے۔''

میری قسمت میں بیٹی اور بیٹا دونوں تھے۔ اس لیے اللہ نے کچھ دن ہمیں بیٹی کی خوشیاں دکھا کے اسی کو بیٹا بنا دیا کیونکہ ہم نے اس کے فیصلے پر راضی ہونے سے انکار کر کے قانون قدرت کے فیصلے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی مرضی چلا رہے تھے۔ قانون قدرت میں رکاوٹ ڈالنے کے سراسر نقصان ہی ہوتا ہے۔

ہم اب اپنی غلطی پر نادم ہیں اور ہر وقت اللہ سے معافی مانگتے رہتے ہیں اللہ ہمیں معاف کرے آمین آپ بھی ہمارے لیے دعا کریں۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

کینیڈا سے ارسال کردہ عبرت ناک کہانی

برباد

اس نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی جہنم بنا ڈالی تھی
اور پھر ہمت ہار کر آخرت بھی تباہ کر ڈالی.....

مونا شہزاد

سردیوں کی تنہا رات تھی، آج تو چاند بھی لگتا تھا تھک کر سو گیا تھا۔ برف کا عکس آسمان پر پڑھ رہا تھا اس لیے حد نظر تک سفیدی نظر آ رہی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے زمین نے برف کی سفید چادر اوڑھ لی تھی۔ رشنا نایاب آتشدان میں جلتی لکڑیوں کو خالی خالی نظروں سے تک رہی تھی، لکڑیاں جل جل کر سرخ کوئلے میں بدل گئی تھیں۔ بعض دفعہ نیلی سی چنگاریاں اٹھتیں اور سرخ چنگاریوں سے بے تابی سے گلے ملتیں۔ اچانک رشنا کی توجہ اپنے ہاتھوں پر مبذول ہوگئی۔ اس نے بے یقینی سے اپنے ہاتھوں کو گھورا۔

''کیا یہ واقعی اس کے ہاتھ تھے؟''

اس کے ہاتھوں پر تہہ در تہہ سلوٹیں تھیں، اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو بے شمار سلوٹوں نے اس کے روح کو جھلسا دیا، وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

''یہ میں رشنا نایاب نہیں ہو سکتی۔ میری جوانی کیسے مجھے چھوڑ کر رخصت ہو سکتی ہے؟''

وہ آہستہ آہستہ چلتی کمرے میں پڑی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے چادر کھینچی، وہ خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہوگئی، ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں اسے ماہ وش رشنا نایاب کے بجائے ایک تھکی ہاری، شکستہ حال بڑھیا نظر آئی، اس عورت کے چہرے پر سلوٹوں کے جال در جال بچھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بجھتی ہوئی شمع کی سی ٹمٹماہٹ تھی۔ اس بڑھیا کا ایک ایک نقش چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''دیکھو مجھے غور سے، میں سامان عبرت ہوں، میں وہ خاکی ہوں جو خاک سے رشتہ توڑ دیتا ہے فخر کی انگلی تھام کر، غرور کی پوشاک پہن کر، خود پسندی کا چشمہ لگا کر آسمان کی بلندی کو اپنا مسکن سمجھ لیتا ہوں، سارے رشتے، ناطے پیروں میں روند کر آخر میں بے وزن ہو کر ہوا میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتا رہتا ہوں۔''

رشنا نایاب نے بے ساختہ اپنے لبوں پر ہاتھ

Digitized by Google

رکھ لیا، کیونکہ اسے خدشہ تھا کہیں وہ دیوانہ وار چیخنے نہ لگے۔ اس کا آئینے میں قید عکس چلایا۔

''رشنا نایاب کچھ یاد آیا، تم نے کس کس کی محبت کو پیروں تلے مسلا تھا؟''

رشنا نے تیزی سے آئینے کو ڈھک دیا اور خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

''مجھے نہیں دیکھنا اپنا عکس، مجھے کچھ یاد نہیں ہے کہ میں نے ماضی میں کیا بویا تھا؟''

کمرے میں لگے قد آدم فریم میں مقید اس کی تصویر چیخی۔

''جھوٹی! فریبی بڑھیا!''

رشنا نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے اور زور سے چلائی۔

''بکواس مت کرو! میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔''

اچانک تصویر کے فریم میں زندگی کے آثار نمودار ہوئے اور جوان و حسین رشنا نایاب تصویر کے فریم سے باہر نکل آئی۔ اس کے جسم پر بھاری سرخ عروسی جوڑا دہک رہا تھا، اس کا سنگھار مکمل تھا، اس کا نولکھا ہار اس کی پوشاک پر عجب بہار دکھا رہا تھا، اس کے ہاتھوں پر لگی حنا کی خوشبو رشنا دور کھڑی بھی محسوس کر سکتی تھی۔ رشنا پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے ماضی کے روپہلے روپ کو تک رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں مسلیں مگر جوان اور خوبصورت رشنا نایاب ایک زندہ حقیقت بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جواں سال رشنا نایاب کی آنکھوں سے نفرت و حقارت کے شرارے نکل رہے تھے۔ اچانک ڈریسنگ ٹیبل سے چادر پھسل کر گر پڑی۔ رشنا کی آنکھیں دہشت سے پھٹ

Digitized by Google

گئیں، ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے سے رشنا نایاب کا بوڑھا تھکا ہارا عکس مجسم ہوکر باہر نکل رہا تھا۔ رشنا نایاب کا بوڑھا عکس بھی اس کی طرف بڑھنے لگا، وہ کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کچھ کہنے کی کوشش کررہا تھا، رشنا نایاب کا دل اچھل کر حلق میں آچکا تھا، اس نے اپنی طرف بے بسی سے دونوں کو بڑھتے دیکھا، نہ جانے کیسے اس میں ہمت آگئی، اس نے بے ساختہ کھڑکی کھولی اور کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ باہر گری تو اسے کافی چوٹ لگی مگر وہ لنگڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اس نے اپنے دونوں ہم زادوں کو اپنے پیچھے تعاقب میں آتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے جسم پر ایک باریک نائٹ گاؤن تھا، پیر جوتوں سے عاری تھے۔ وہ آج ایسے بھاگ رہی تھی جیسے کئی آسیبوں سے پیچھا چھڑوا رہی ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا اس کے دونوں ہمزاد ایک مستقل رفتار سے اس کے تعاقب میں مصروف تھے۔

رشنا نے موڑ مڑا تو اسے لگا کہ اب وہ اکیلی ہے، اچانک ایک تیز روشنی اس کے چہرے پر پڑی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اس کو ایسے لگا جیسے اس کے ماضی کا فلیش بیک اس کی نظروں کے سامنے چل پڑا ہو۔

☆.....☆.....☆

رشنا نایاب کو اللہ تعالیٰ نے بے مثال رنگ و روپ سے نوازا تھا، شروع سے گھر میں، سکول میں وہ ہر جگہ اپنی خوبصورتی کے باعث ممتاز رہتی، سکول میں ہمیشہ ڈراموں میں اسے شہزادی کا کردار دیا جاتا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اس لئے وہ اپنے والدین کی آنکھوں کا بھی تارا تھی۔ اس کے حسن کی خاندان بھر میں دھوم تھی، اس کا تایا زاد رضا میر بچپن سے اس پر فدا تھا، جیسے جیسے بچپن کا ساتھ چھٹا تو دونوں کو ایک دوسرے کی محبت کا اندازہ ہوا، مگر رشنا صرف اپنی ذات اور اپنے روپ سے محبت کرتی تھی، رشنا نایاب کے لئے اس کی خوبصورتی ہی دنیا کی سب سے بڑی زندہ حقیقت تھی۔ جوان ہوکر اس میں فلم ایکٹرس بننے کی آرزو جاگ اٹھی، اس نے گھر والوں اور رضا میر کی مخالفت کے باوجود فلم کا آڈیشن دیا، حسب توقع وہ کامیاب ہوگئی۔ اس کی پہلی فلم ہی باکس آفس پر ہٹ تھی، اس کے بعد وہ ایک مشہور زمانہ فلم ایکٹرس بن گئی۔ اس کے والدین نے اس کی منت وسماجت کرکے اس کی شادی رضا میر سے کردی، اس نے شادی کے لئے ''ہاں'' اس شرط پر کی کہ شادی خفیہ رہے گی۔ اس کے والدین اور رضا میر اپنی محبت سے ہار گئے اور اس کی خواہش کے آگے جھک گئے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد جب اسے ماں بننے کی خوش خبری ملی، تو وہ بجائے خوش ہونے کے رضا میر سے بہت لڑی، اس نے پوری کوشش کی کہ وہ اس بچے کو ضائع کردے، مگر بچے کی خوش قسمتی تھی کہ جب تک اسے ہوش آیا حمل کے تین ماہ گزر چکے تھے، اب ہر ڈاکٹر اسقاط حمل میں اس کی جان کو خطرہ بتاتا مجبوراً رشنا نے اپنے جھوٹے ایکسیڈینٹ کی افواہ پھیلائی اور علاج کے بہانے رضا میر کے ساتھ نیویارک آگئی۔ انجان ملک میں اس کا وقت بہت مشکل سے رو دھو کر وقت گزرا، فلمی حلقے میں اس کے سیکرٹری نے اس کے ایکسڈینٹ کی جھوٹی خبر پھیلا دی اس طرح وہ پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کی جھوٹی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ آخرکار وہ دن بھی آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جڑواں بیٹی، بیٹے سے نوازا مگر اس کا دل بچوں کو جنم دے کر بھی نہ

Digitized by

پسیجا۔اس نے پیدائش کے فوراً بعد ان بچوں کی صورت دیکھنے سے بھی انکار کر دیا، اس نے رضا میر سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ رضا میر اس کے سامنے بہت گڑگڑایا مگر رشنا نایاب نے آئینے میں اپنے فگر کا جائزہ لیتے ہوئے نفرت سے کہا۔

''بے وقوف آدمی تمہارے ان بچوں نے میرا فگر تباہ کر دیا ہے۔ میں رشنا نایاب ہوں، تمہارے بچوں کی آیا نہیں۔''

اگلے روز کی فلائیٹ سے وہ واپس آ گئی، واپس آ کر وہ اپنی مصنوعی فلمی دنیا میں کھو گئی، ایک دن رجسٹرڈ ڈاک سے اسے طلاق نامہ ملا اس کی ماں اسی غم میں دل پکڑ کر بیٹھ گئیں اور جہان فانی سے کوچ کر گئیں۔ رشنا نایاب ریس میں تیز بھاگنے میں اتنی مصروف تھی کہ اس حقیقت سے مکمل بے بہرہ تھی کہ وہ اس سفر میں کیا کیا کھو چکی ہے؟۔ رشنا کے ابا بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدموں سے خوفزدہ تھے، مگر رشنا کے پاس ان کے لیے وقت نہیں تھا۔ ایک دن وہ بھی رشنا کو چھوڑ کر شہر خموشاں کے باسی بن گئے۔ رشنا نایاب کا ساتھ آہستہ آہستہ سب مخلص دوستوں، رشتہ داروں نے چھوڑ دیا، مگر رشنا اتنا تیز بھاگ رہی تھی کہ اسے کسی کی فکر نہیں تھی، اس کے گرد خوشامدی اور بدقماش لوگوں کا گھیرا تھا، اس کے لئے شراب نوشی، سگریٹ، جوا، ریس سب ہائی سوسائٹی میں شامل ہونے کے طریقے تھے۔ اب رشنا کو کام ملنا کم ہو گیا مگر اس نے اپنی خواب گاہ کے دروازے ہر پروڈیوسر، ڈائریکٹر پر کھول دیئے اس طرح کچھ سال اور گزر گئے، مگر اب رشنا نایاب کی عمر بڑھتی نظر آتی تھی، وہ لاکھ میک اپ کا سہارا لیتی مگر اس کے چہرے کا آئینہ حقیقت کھول دیتا، ایک دن ایسا بھی طلوع ہوا کہ رشنا نایاب کی جگہ ایک اور خوبصورت، نیا، فریش چہرہ فلم انڈسٹری میں وارد ہوا۔ رشنا کے گرد جتنی جلدی مفاد پرستوں کی بھیڑ اکٹھی ہوئی تھی، اتنی جلدی وہ بھیڑ چھٹ بھی گئی۔ اب رشنا کو بڑی بہن، ماں، ہیروئن کی کزن جیسے رول آفر ہونے لگے، رشنا نایاب ایسے کردار کبھی نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ دیوانہ وار آئینے میں اپنا عکس دیکھتی اور عہد رفتہ کو آواز دیتی، وہ اب سخت تنہائی کا شکار تھی، اسے ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے، رشنا نے مجبور ہو کر دوسری شادی کی کوشش کی مگر ایک فلمی اداکارہ سے چند دن دل بہلانے پر تو سب راضی تھے، مگر اسے اپنی عزت بنانے پر کوئی راضی نہیں تھا، خاص طور پر جب سب لوگ اس کے کردار سے بخوبی واقف تھے۔ رشنا نے اپنے کانوں سے اپنے لئے ''رنڈی'' کا لفظ استعمال ہوتے سنا، اس کو پتا چلا کہ درحقیقت خوبصورت عورت وہ ہے جو عزت و وقار سے اپنی عصمت سنبھال کر اپنے تمام رشتوں کو نبھاتی ہے۔ رشنا نایاب تو ایک خوبصورت کٹھ پتلی تھی جو سج تو سکتی تھی، کسی کا گھر نہیں۔

وہ گلاب کا وہ مسلا ہوا پھول تھی، جس کی جگہ اب گلدان میں نہیں بلکہ کچرے کے ڈبے میں تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح ٹرین کی پٹری پر بہت رش تھا، ماضی کی ممتاز اداکارہ رشنا نایاب کی کچلی ہوئی لاش پائی گئی تھی۔ پولیس، ایمبولینس، میڈیا والوں کا ہجوم تھا۔ میڈیا کے رپورٹر دھڑا دھڑ لاش کی تصویریں بنا کر ماضی کی تصاویر کے ساتھ رپورٹ لائیو ٹیلی کاسٹ کر رہے تھے۔ دور اداس کھڑی رشنا نایاب کی روح نے اپنے آنسو صاف کئے اور دور سے بڑھتے سیاہ دھوئیں کا حصہ بن گئی۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

اصل پتہ

والدین اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں خوش نصیب ہیں
وہ لوگ جو اپنے والدین کے زیر سایہ پلتے ہیں.....

ارم ناز

زندگی میں دکھ اتنے ملتے ہیں کہ نہیں سمجھ آتا انسان انکا مقابلہ کیسے کرے اور اپنی یہ داستان کیسے دوسرے کے سامنے بیان کرے۔ مگر کہتے ہیں کہ دکھ بانٹ دینے سے دکھ کم ہو جاتا ہے تو میں اپنا دکھ آج یہاں آپ سب کے ساتھ بانٹ رہی ہوں کہ اس طرح ہی میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

میں ایک بیوہ خاتون ہوں اور میری عمر تینتیس سال ہے۔ میں تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں ہوں۔ آج سے چار سال پہلے میرا شوہر جو اب اس دنیا میں نہیں رہے وہ مجھے اس بے حس دنیا میں اکیلا چھوڑ گئے۔ اور میں سوائے افسوس کے کچھ نہیں کر سکی۔ میں جو ایک پل بھی اپنے شوہر کے سہارے کے بغیر نہیں رہ پاتی تھی، اور شاید کوئی بھی عورت اپنے شوہر کے بنا اس ظالم دنیا میں اکیلے نہیں جی سکتی ہے۔ مگر آج میں جی رہی ہوں، کیونکہ زندگی اور موت صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

ہماری شادی کو صرف دس سال کا عرصہ ہوا تھا، میں اپنے شوہر اور سسرال والوں کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ اور یہ خوشگوار زندگی گزرانے کے لئے میں نے بہت قربانیاں دی تھیں۔ مگر ایک دن اچانک آفس سے آنے کے بعد میرے میاں کے معدے میں درد اٹھا، میں نے فوراً انہیں قریبی ہسپتال دکھایا پھر بھی دل مطمئن نہ ہوا تو انہیں شہر کے بڑے ہسپتال لے کر گئے۔ ڈاکٹر نے کسی بیماری کی کوئی خاص تشخیص نہ کی اور نہ ہی کوئی تشویش والی بات بتائی مگر شاید اللہ کی یہی مرضی تھی کہ فقط دو گھنٹے کے اندر اندر جو شخص اپنے پیروں پر چل کر ہسپتال گیا تھا وہ واپس ڈیڈ باڈی کی صورت میں آیا۔ میرے تینوں بچے بہت چھوٹے تھے اور چھوٹی بیٹی تو فقط ایک سال کی تھی۔ جو ابھی ''بابا'' بولنا سیکھ رہی تھی اور اپنے باپ کی بہت لاڈلی تھی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ اپنے شوہر کی موت کے وقت مجھے کچھ ہوش نہ رہا، گھر رشتہ داروں سے

Digitized by Google

بھرنا شروع ہوگیا۔ جو بھی لوگ آتے انہیں یقین نہ آتا۔

''کل ہی تو انہیں دیکھا تھا۔ بھلے چنگے تھے۔''

''میرے ساتھ ہی تو سارا دن آفس میں تھے۔''

لوگوں کی بے یقین آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ مجھے اس وقت کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اتنے چھوٹے بچے تھے میرے، کیسے گزارا ہوگا انکے ساتھ، مگر وقت کا کام ہوتا ہے گزرنا اور یہ ظالم وقت گزر ہی جاتا ہے چاہے اچھا ہو یا برا۔

میرے شوہر! میں انکا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں ہی کرتی ہوں۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، انتہائی شریف اور سیدھے سادھے انسان تھے۔ سارا حلقہ احباب انکے بارے میں ہمیشہ اچھی رائے ہی دیتا تھا۔ ہماری دس سالہ شادی شدہ زندگی میں ہماری کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میرے شوہر ہمیشہ ہر بات مان لیتے تھے، کبھی بحث نہیں کرتے تھے۔ وقت کے بہت پابند تھے اور کبھی کام سے چھٹی نہیں کرتے تھے۔ بہت محنتی اور رزقِ حلال کمانے والے انسان تھے۔ جب ہی تو اللہ نے انہیں بہت زیادہ باعزت مقام دیا تھا۔ جب میری شادی ہوئی تھی تب میرے شوہر کی تنخواہ صرف چار ہزار تین سو روپے تھے۔ مگر انکی محنت اور لگن کے باعث وہ اسی فیکٹری کی منیجر کی سیٹ پر

URDU TUBE

موجود تھے۔ مگر تنخواہ زیادہ ہونے کے باوجود بھی میں نے انہیں کبھی فضول خرچی کرتے نہیں دیکھا۔ بہت سے ورکرز انکے انڈر کام کرتے تھے۔ اور وہ ان سب کا بہت خیال رکھتے تھے۔

اکثر میں چڑ کر کہتی ہے کہ ''اتنی محنت کے باوجود بھی ہماری بہت سی خواہشیں پوری نہیں ہو پاتی، آپکی فیکٹری کے ورکرز کی بیگمات کے کپڑے مجھ سے زیادہ ہی ہوں گے۔''

اور وہ جواب میں کہتے تھے کہ ''جتنی میری تنخواہ ہے اس میں میں روز تمہارے لئے کپڑے لاسکتا ہوں مگر جب ہمارے پاس اچھے کپڑے موجود ہیں تو مزید لے کر اسراف کرنے کا فائدہ؟ بہتر نہیں کہ ہم یہ پیسے کسی غریب کی مدد کے لئے دے دیں۔ اگلے جہاں میں بھی جانا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں وہاں تم لوگوں کے لئے مشکلا ت کھڑی کروں۔''

مجھے یاد ہے کہ جب بھی گاڑی میں بیٹھتے تھے تو قرآن پاک کی تلاوت اور ترجمہ لگا دیتے تھے، اس دن جب وہ آخری دفعہ میرے ساتھ ہسپتال جارہے تھے جب بھی انہوں نے سورہ رحمٰن لگا دی تھی۔ اور ہم خاموشی سے سن رہے تھے۔ راستے میں دو تین بار میں نے پوچھا کہ طبیعت کیسی ہے اب تو ''بہتر ہے'' کہہ کر خاموش ہوگئے۔

ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے مگر آج تک کوئی مسئلہ نہیں ہوا اور اس میں زیادہ ہاتھ میرے شوہر کا ہی تھا۔ کیونکہ اپنے بہن بھائیوں میں بڑا ہونے کے ناطے وہ سب سے بہت محبت کرتے تھے اور شفقت سے پیش آتے تھے۔

اتنی باتیں ہیں میرے شوہر کی کہ شروع کروں تو ختم کرنے کا دل ہی نہیں چاہتا، نہیں سمجھ آتا کہ کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔ میری چھوٹی بیٹی جب بھی اپنے بابا کے بارے میں سوال کرتی ہے تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اس دن جب وہ اسکول سے روتی ہوئی گھر آئی کہ سب بچوں کے بابا اسپورٹس ڈے پر آئے تھے مگر اسکے بابا کیوں نہیں آئے۔ کیا وہ اس سے پیار نہیں کرتے؟ اسکی یہ بات سن کر میرا کلیجہ منہ کو آگیا۔ اس معصوم سی ننھے ذہن کی بچی کو میں کیا بتاتی کہ اسکے بابا اسے بہت محبت کرتے ہیں مگر اپنی محبت دکھانے کے لئے اس دنیا میں نہیں موجود رہے۔ مگر میں نے اسے سمجھایا کہ اسکے بابا اللہ کے پاس جاچکے ہیں۔

''آپ نے کیوں بابا کو جانے دیا؟ کہہ دیتے کہ ابھی میری بچی کو انکے ساتھ کھیلنا ہے۔ اسکے لئے گڑیاں لانی ہیں۔''

اسکی یہ بات سن کر میں زاروقطار رونے لگی۔ اگر واقعی یہ سب میرے بس میں ہوتا تو میں انہیں نہیں جانے دیتی مگر بندے کو اللہ کی رضا میں راضی رہنا پڑتا ہے۔

میرے شوہر کو گزرے چار سال ہوچکے ہیں، میرا بیٹا اب تیرہ سال کا ہوگیا ہے۔ دکھ کم تو نہیں ہوا مگر مندمل ضرور ہوگیا تھا۔ مگر میرا بڑا بیٹا ابھی تک خوفزدہ رہتا ہے۔ کوئی بھی بیمار ہوتا تو ڈرتا تھا کہ اللہ کے پاس نہ چلا جائے۔ اندھیرے سے بھی بہت ڈرتا ہے اسلئے میں اسے اپنے ساتھ سلاتی ہوں۔ اس دن جب بچوں کا فارم فل کرنا تھا تو اس میں والد کے آفس اور نمبر کا خانہ بھی موجود تھا۔ میں نے وہ خانہ خالی چھوڑا تو چھوٹا بیٹا کہنے لگا۔

''جب نمبر موجودہ ہے تو لکھ دیں۔''

میں نے اسے سمجھایا کہ جب بابا ہی نہیں

Digitized by Google

رہے تو نمبر لکھنے کا فائدہ۔لیکن بچوں کی سمجھ اتنی زیادہ کہاں ہوتی ہے۔ وہ اور بڑا بیٹا آپس میں بحث کرنے لگے۔ جب چھوٹی بیٹی نے یہ صورتحال دیکھی تو اس نے اپنی عمر کے حساب سے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی۔اور کہا۔

''اس میں لکھ دو اللہ۔''

یہ سن کر دونوں بیٹے اسکا منہ تکنے لگے۔تو وہ اس پر کہنے لگی۔

''میں صحیح ہی تو کہہ رہوں مما۔ جب بابا اللہ کے پاس ہی چلے گئے ہیں تو اڈکا ہی پتہ لکھ دیں۔''

میں نے بے ساختہ اپنی بیٹی کو گلے لگا لیا۔اسکا ماتھا چوما اور کہا کہ یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔میں آپکی لیکچر کو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔

زندگی یونہی گزر رہی ہے۔بچوں کے چھوٹے سوالات اور انکی خواہشات کے ساتھ۔اللہ نے ماں کو اس خمیر سے بنایا ہے کہ وہ بچوں کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں، وقت پڑنے پر ماں بھی باپ بن جاتی ہیں۔

بس اللہ میری ہمت اور امید یونہی قائم رکھے۔قارئین سے التماس ہے کہ میرے حق میں دعا کریں اور میں بھی اپنے بچوں کے ساتھ سکون کی زندگی گزاروں اور آخر میں ایک گزارش کروں گی۔

کسی بھی یتیم بچے کو یہ احساس نہ دلائیں کہ وہ اس بھری پری دنیا میں بے آسرا اور بے سہارا ہے اور اس کی ماں ایک بیوہ عورت ہے جو صرف قابل رحم ہے۔ یہ اللہ کے فیصلے ہیں اور ہمیں اپنے آس پاس موجود ضرورت مندوں کو عزت کے ساتھ زندگی کی گاڑی چلانے میں مدد کرنی چاہیے کیونکہ آخر کار ہم سب کا پتہ بس اللہ ہی کا ہے۔

☆☆.....☆☆

غزل

ہموار راستوں کو دلدل کیا نہ جائے
جو کام آج کا ہے، وہ کل کیا نہ جائے

یہ کیا کہ دن گھڑی کو ہی تکتے گزر گیا
سوچا یہ تھا کہ ضائع کوئی پل کیا نہ جائے

مانا کہ آدمی کو ودیعت ہے عقل و فہم
ہر ایک مسئلے کو مگر حل کیا نہ جائے

کچھ تشنگی رہے کہ ہے اس سے نمودِ فن
تصویر آگہی کو مکمل کیا نہ جائے

جاذب یہی ہے مصلحتِ فن کا اقتضا
بازو کو شل، دماغ کو بوجھل کیا نہ جائے

مختار جاذب

Digitized by Google

لاہور سے ارسال کردہ وقتی عیش کی داستان

صبح کا بھولا

ماہین انتہائی فیشن ایبل اور بولڈ لڑکی تھی ایک وقت میں کئی لڑکوں سے فلرٹ کرنا ہی اُس کا مشغلہ تھا..... امیر کبیر لڑکیوں کے عشق میں مبتلا غریب نوجوانوں کے لیے سبق آموز تحریر.....

فرزانہ نگہت

اس شام جب میں کالج سے گھر لوٹی تو اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ ایک نہایت ہی خوبصورت پیاری سی بچی کو کھیلتے دیکھا۔ اس نے بالوں میں سیدھی مانگ کے ساتھ دو مینڈھیاں بنا رکھی تھیں اور ایک سخت سی پراندہ لگی چوٹی کر رکھی تھی اس کا لباس غریبانہ مگر صاف ستھرا تھا اس نے ایک ننھی سی اوڑھنی بھی لے رکھی تھی۔ اس بظاہر سادہ بلکہ پینڈو سے حلیے کے باوجود وہ اتنی خوبصورت اور پیاری تھی کہ میں اسے بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے دیکھنے لگی اس کی رنگت بیحد سرخ و سپید' ناک اور ہونٹ بیحد خوبصورت' ٹھوڑی گڑھے دار' پیشانی روشن و کشادہ آنکھیں بڑی بڑی سیاہ اور خوبصورت تھیں اس کی عمر چھ سات سال سے سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی ایسی کم عمری میں اتنی خوبصورتی اور دلکشی واقعی حیران کن تھی جب وہ ہنستی تھی تو اس کے دانت بھی موتیوں کی لڑی سی دکھا جاتے۔

''یہ بچی پچھلے کوارٹر میں نئے آنے والے نائیک کی بیٹی ہے۔'' والدہ نے میری دلچسپی دیکھتے ہوئے مجھے اطلاع بہم پہنچائی۔

''کتنی خوبصورت بچی ہے لگتا ہے اس کی ماں بھی بیحد خوبصورت ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''شاید..... یہ لوگ نئے نئے آئے ہیں اس لیے ابھی ان کی کسی سے واقفیت نہیں لیکن لگتا ہے یہ کسی گاؤں کے رہنے والے ہوں گے'' والدہ نے خیال ظاہر کیا

''گڑیا ذرا یہاں آؤ.....'' میں نے اس بچی کو اپنے پاس بلایا۔

وہ جھجکتی شرماتی میرے پاس چلی آئی۔

''گڑیا تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پیار سے پوچھا۔

''عفت.....'' اس نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

میرے مزید پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ لوگ گوجرانوالہ چھاؤنی سے ٹرانسفر ہو کر کوئٹہ پہنچے تھے وہ ٹیکسلا کے رہنے والے تھے وہیں ان کے

Digitized by Google

دادا کا بڑا سا مکان تھا ان کی زمین تھی بہت سی گائیں بھینسیں بکریاں تھیں چچا اور پھوپھیاں بھی وہیں رہتے تھے اس نے مجھے بتایا کہ اس کا صرف ایک چھوٹا بھائی تھا جو دو سال کا تھا۔

''گڑیا تمہاری امی بہت خوبصورت ہوں گی؟'' میں نے اپنے ذہن میں کافی دیر سے مچلتا سوال کر ہی ڈالا۔

''جی..... جی.....'' وہ ہکلا کر رہ گئی گویا اسے کوئی واضح جواب دینے میں ہچکچاہٹ مانع تھی۔

''بیٹی تم اپنی امی کو کہنا کہ ہمارے گھر آئے'' والدہ نے اسے تاکید کی۔

''جی اچھا.....'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس کے جانے کے بعد والدہ میری طرف مڑیں۔

''اب دیکھیں گے اس کی ماں کتنی خوبصورت ہے یہ دیہاتی عورتیں ہر چیز خالص کھاتی پیتی ہیں اس لیے سرخ وسپید اور صحت مند ہوتی ہیں۔''

لیکن چند دنوں کے بعد جب عفت کی ماں ہم سے ملنے آئی تو اسے دیکھ کر ہمیں بیحد مایوسی ہوئی۔ وہ گہرے سانولے رنگ اور موٹے نقوش والی فربہ اندام سی دیہاتی وضع قطع کی عورت تھی جس نے سفید ٹوپی والا برقعہ پہن رکھا تھا۔ ہم نے اپنی مایوسی بلکہ کبیدگی کو چھپاتے ہوئے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا اس کی اچھی خاصی خاطر تواضع کی وہ دیہاتن ضرورت تھی لیکن اس کے رکھ رکھاؤ بات چیت میں شائستگی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے پانچ جماعتیں پڑھ رکھی ہیں اس کا

URDU TUBE
HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

Digitized by Google

خاوند جس کا نام رمضان علی تھا اس کا خالہ زاد بھائی تھا وہ بہت اچھا انسان تھا اس کا بیحد خیال رکھتا تھا اور اپنے بچوں سے بھی بیحد محبت کرتا تھا والدہ نے اس سے باتوں باتوں میں پوچھ ڈالا کہ اس کی بیٹی عفت بیحد خوبصورت تھی اس کی کیا وجہ ہے؟ کی اوہ اپنی کسی خالہ یا پھوپھی پر گئی ہے؟ اس پر وہ بیساختہ ہنس دی۔

''نہیں آپا..... عفت اپنے ابے پر گئی ہے اس کا ابا ماشاء اللہ بہت ہی خوبصورت ہے عفت کا چھوٹا بھائی بھی اپنے ابا پر ہے۔'' اس کے لہجے میں اپنے شوہر کے لیے بے پناہ محبت کے ساتھ بے پناہ تفاخر کا رنگ جھلک رہا تھا۔

ہمیں بیحد حیرت ہوئی۔ کوئی مرد کیا واقعی ایسا حسین وجمیل ہوسکتا ہے؟

ہر چند کہ کسی نامحرم کے بارے میں متجسس ہونا کوئی پسندیدہ فعل نہیں تھا مگر میرے دل میں اسے دیکھنے کی بے پناہ خواہش اور اشتیاق پیدا ہوگیا' ادھر اس مختصر سی فوجی آبادی کی جن عورتوں نے رمضان علی کو دیکھا انہوں نے اس کی مردانہ وجاہت و جمال کی ایسی ایسی تصویر کھینچیں کہ میرا اشتیاق اور دلچسپی بیتابی کو چھونے لگی۔ یہ سب عورتیں اس کے حسن و جمال کے تذکرے کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر افسوس کرنا نہ بھولتی تھیں کہ اس حسین وجمیل انسان کو کیسی بدشکل و بے جوڑ سی بیوی ملی تھی جبکہ اس کے لیے تو کوئی حور پری ہونی چاہیے تھی۔

پھر بالآخر مجھے رمضان علی کو دیکھنے کا موقع مل ہی گیا..... اسے دیکھ کر لوگوں کی باتیں حرف بحرف سچ دکھائی دیں وہ واقعی ایسا ہی تھا جیسی اس کی شہرت تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اس بات پر افسوس ہونا قدرتی امر تھا کہ اسے اس کی جوڑ کی بیوی نہیں ملی تھی میں نے جب والدہ سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ رشتے آسمان پر بنا کرتے ہیں پیدائش' شادی اور موت تین چیزیں بالکل اللہ کی مرضی اور اختیار میں ہوتی ہیں یہ اس کی مرضی تھی کہ رمضان علی کو ایسی بیوی ملی ویسے بھی عورت کی صرف شکل و صورت ہی نہیں دیکھی جاتی یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس سیرت اور اخلاق کی مالک ہے امور خانہ داری کا کیا سلیقہ رکھتی ہے گھریلو ذمے داریوں کا کیا احساس رکھتی ہے اور رمضان علی کی بیوی شہناز بی بی سیرت اور اخلاق کی واقعی بہت اچھی تھی گھریلو کاموں میں طاق اور خاوند کی بیحد خدمت گزار تھی ہم جب بھی اس کے گھر جاتے غریبانہ ماحول کے باجود اسے بیحد صاف ستھرا پاتے دونوں بچے اور وہ خود بھی بیحد صاف ستھرے ہوتے۔ کھانا بھی وہ بیحد لذیذ پکاتی تھی ظاہر تھا کہ رمضان علی اپنی کم صورت اور بے جوڑ بیوی کے ساتھ بیحد مطمئن اور خوش تھا۔

کوئٹہ چھاؤنی میں واقعہ وہ مختصر سی فوجی بستی ایک نسبتاً ویران سے علاقے میں واقع تھی اس بستی میں ایک طرف نچلے درجے کے فوجی عہدیداروں کے ہٹ نما کوارٹر تھے تو دوسری طرف اعلیٰ فوجی عہدیداران کے بڑے بڑے شاندار بنگلے۔ ان دونوں حصوں کو ایک پتلی سڑک جدا کرتی تھی ان دونوں بستیوں کے مکین ایک دوسرے سے کوئی میل جول نہ رکھتے تھے شاید اس کی وجہ افسر و ماتحت کا رشتہ تھا یا طبقاتی فرق.....!

وقت گزرتا گیا.....

رمضان علی کے بارے میں لوگوں کا اشتیاق و تجسس ختم ہوتا چلا گیا زندگی پرانی نہج پر لوٹ آئی لیکن جلد ہی ہماری بستی میں ایسی افواہیں جنم لینے

Digitized by Google

لگیں جنہوں نے سب کے کان کھڑے کرنے شروع کر دیے۔ سڑک پار بڑے بڑے بنگلوں کی بستی میں مقیم ایک بریگیڈیر صاحب جو چند ماہ ہوئے کراچی سے ٹرانسفر ہو کر کوئٹہ پہنچے تھے ان کی حسین طرح دار اور نہایت فیشن ایبل اور آزاد خیال' آزادی پسند صاحب زادی رمضان علی کی طرف ملتفت ہوگئی اور اس پر بڑی مہربانیاں کرنے لگی۔

بریگیڈیر صاحب کے بارے میں ہمیں اتنا معلوم ہو سکا کہ ان کا تعلق نہایت امیر کبیر زمیندار گھرانے سے تھا ان کی تقریباً ہر بڑے شہر میں وسیع جائیدادیں موجود تھیں ان کے دو بڑے بیٹے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ امریکہ میں رہتے تھے ایک بیٹا انگلینڈ میں پڑھ رہا تھا ان کی صرف ایک ہی صاحبزادی تھی ماہین..... جو کراچی کے اعلیٰ تعلیمی ادارے کے ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہی تھی اور اب گریجویشن کے بعد گھر آ گئی تھی۔ وہ اب فارغ تھی اس لیے سیر و تفریح' کلب اور فلرٹیشن اس کے دلچسپ مشغلے بنے ہوئے تھے فلرٹیشن تو شاید اس کا مرغوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ ہمیں اکثر اپنی کار میں کسی نہ کسی ہیرو ٹائپ لڑکے کے ساتھ بیٹھی دکھائی دیتی تھی اس کی ایسی فطرت کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن تھا کہ اس نے رمضان علی کو دیکھ لیا ہو اور اس کی بے پناہ مردانہ وجاہت سے متاثر ہو کر اس کی طرف راغب ہوگئی ہو لہذا ہمیں جو باتیں معلوم ہوئیں وہ یہ تھیں کہ اس نے نہ صرف رمضان علی کو اپنے گھر بلانا شروع کر دیا تھا بلکہ اسے تحائف سے بھی نوازنا شروع کر دیا تھا۔

بریگیڈیر صاحب کی اس دختر اور رمضان علی میں تعلقات کیونکہ استوار ہوئے آج یہ بات محلے والوں کو بریگیڈیر صاحب کے اردلی کی بیوی زینب بی بی کی زبانی معلوم ہوئی اس کے محلے میں ایک صوبیدار کی بیوی سے مراسم تھے اس نے بتایا کہ بریگیڈیر صاحب کی صاحبزادی ماہین اکلوتی بیٹی اور سب سے چھوٹی اولاد ہونے کے سبب سب کی بیحد لاڈلی تھی اور بیحد خود سر اور سرکش واقع ہوئی تھی جو اپنے ماں باپ کی کم ہی سنتی تھی اور شروع ہی سے اپنی من مانی کرنے کی عادی چلی آ رہی تھی اس کی منگنی اس کے خالہ زاد عدیل سے ہو چکی تھی جو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا تھا عدیل کے ماں باپ اس کے بچپن ہی میں ہوائی حادثے میں انتقال کر چکے تھے جس کے بعد اس نے بریگیڈیر صاحب کے گھر میں ہی پرورش پائی تھی وہ بیحد وجیہہ و شکیل تھا اور لائق فائق بھی' عادات واطوار کا بہت اچھا تھا ماہین اپنے اس بچپن کے ساتھی کو بیحد پسند کرتی تھی اس لیے اس نے بخوشی منگنی کر لی تھی لیکن وہ فطرتاً آزاد خیال اور کھلاڑی قسم کی واقع ہوئی تھی اس لیے اپنی عدیل سے منگنی کے باوجود وہ ادھر ادھر فلرٹ کرتی پھرتی تھی اس کے ساتھی آئے دن بدلتے رہتے تھے کراچی میں بھی وہ اپنے ایسے ہی مختصر المدتی دوستوں کی بڑی تعداد چھوڑ آئی تھی اب یہاں کوئٹہ میں بھی اس کا یہی مشغلہ تھا اب تک اس کی دوستیاں امیر کبیر گھرانوں کے خوبرو لڑکوں سے ہوتی رہی تھیں لیکن جب اس کی نظر اس معمولی سے سپاہی رمضان علی پر پڑی تو وہ سب کچھ بھول گئی اور اس بری طرح اس پر عاشق ہوگئی کہ اچھے مہذب اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانوں کو چھوڑ کر اس کا کلمہ پڑھنے لگی۔ بریگیڈیر صاحب کے بنگلے سے رمضان علی کا کوارٹر نزدیک ہی تھا اس لیے وہ بہانے بہانے سے اپنا اردلی بھیج کر اسے اپنے بنگلے پر بلواتی اس کی شاندار تواضع کرتی' گھنٹوں

Digitized by Google

اس کے ساتھ باتیں کرتی رہتی اس کے ساتھ لمبی لمبی سیریں کرتی پھر اس نے اسے تحائف بھی دینے شروع کر دیے۔

رمضان علی دیہاتی قسم کا سیدھا سادا سا بندہ تھا فوج میں ہونے کے سبب وہ بھی عام سپاہیوں کی طرح اپنے افسروں کے حکم کا بندہ اور ان کے رعب میں رہتا تھا اس لیے وہ فوج کے اتنے اونچے عہدیدار کی بیٹی کو ہرگز ناراض نہیں کر سکتا تھا وہ مکمل طور پر اس کا غلام بن گیا۔

☆.....☆.....☆

ہماری بستی والوں کو ان خبروں نے باتوں کے لیے گرما گرم موضوع فراہم کر دیا جہاں دو عورتیں بیٹھتیں یہی ذکر چھڑ جاتا بڑی محفل ہوتی تو تبصرے بھی چٹخارے دار ہوتے لیکن ان باتوں کے باوجود سب کو رمضان علی کی بیوی شہناز بی بی سے گہری ہمدردی تھی جو بے چاری اپنی بدنامی یا عورتوں کے طنزیہ تمسخرانہ تبصروں کے خوف سے اپنے گھر میں ہی بند ہو کر رہ گئی تھی لیکن محلے کی عورتوں نے اسے تنہا نہ چھوڑا تھا وہ اکثر اس سے ملنے چلی جاتی تھیں مگر اس موضوع پر اس سے باتیں کرنے سے بچتی رہتی ہی رہتی تھیں والدہ بھی اس سے مل کر یوں ظاہر کرتی تھیں گویا انہیں کسی چیز کا علم نہیں تھا خالہ شہناز نہ خود ہی کسی کو کچھ بتاتی تھی لیکن اس کا دکھ اور رنج اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتا تھا۔

زینب بی بی کی زبانی محلے والیوں کو پل پل کی خبریں ملتی رہتی تھیں اس کے کہنے کے مطابق بریگیڈیر صاحب اور ان کی بیگم اس صورت حال سے بیحد نالاں اور ناخوش تھے وجہ صاف ظاہر تھی ایک تو رمضان علی نیم خواندہ سا پینڈو اور معمولی سپاہی تھا پھر وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ بھی تھا انہوں نے اپنی بیٹی کو بہتیرا سمجھایا بجھایا' بہت ڈانٹ ڈپٹ کی' ناراض ہوئے' کئی کئی دن اس سے بات نہ کی مگر اس پر کیا اثر ہونا تھا وہ شاید حقیقی معنوں میں رمضان علی کے عشق میں مبتلا ہو چکی تھی اس کی توجہ اور التفات کا ظاہر تھا کہ رمضان علی پر جلد یا بدیر کچھ اثر تو ہونا تھا کیونکہ وہ بھی تو بالآخر انسان ہی تھا اس کی مرعوبیت شرم و ہچکچاہٹ رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئی وہ بے تکلفانہ ماہین سے ہنسنے بولنے لگا۔

اس گوری چٹی کٹے بھورے بالوں تیکھے نقوش چھریرے جسم والی نہایت فیشن ایبل اور بے باک دوشیزہ کے سامنے ویسے بھی اس کی دیہاتی کم صورت بے ڈول جسم والی پینڈو سی بیوی کس گنتی میں تھی وہ تو اس کی ایسی توجہ' ایسی محبت' ایسا التفات پا کر اپنے آپ کو گویا ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا محسوس کرنے لگا۔

ننھی عفت اب بہت کم ہمارے گھر کھیلنے آتی تھی۔ وہ اپنے گھر کی کوئی بات ہمیں نہ بتاتی تھی ایک شام جب وہ کھیلنے ہمارے گھر آئی تو والدہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا

''تمہاری امی کا کیا حال ہے بیٹی..... ٹھیک ہیں نا؟''

''وہ بیمار ہیں..... روتی رہتی ہیں۔''

''کیوں۔ وہ کیوں روتی رہتی ہیں؟''

''ابو ان سے لڑتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم ٹیکسلا واپس چلے جائیں۔''

''ٹیکسلا؟''

''جی خالہ.....''

''تو تم لوگ چلے جاؤ گے؟''

''پتہ نہیں خالہ.....'' وہ مزید کچھ نہ بتا سکی۔

اس کی باتوں نے ہمیں پریشان کرنا ہی تھا۔

Digitized by Google

محلے والیوں کو بھی جب ان باتوں کی خبر ہوئی تو وہ بھی بیحد فکر مند اور پریشان ہوئیں۔ سب نے مل کر طے کیا کہ وہ اپنے مردوں سے بات کریں گی کہ وہ سب مل کر رمضان علی کو سمجھائیں۔ اسے اپنا گھر اجاڑنے سے منع کریں اس کے سر سے بریگیڈیر صاحب کی دختر نیک اختر کے عشق کا خناس نکالنے کی کوشش کریں۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا..... ابا جان کی سربراہی میں محلے کے آدمیوں کا ایک چھوٹا سا وفد رمضان علی کے گھر پہنچا ابا جان نے بعد میں بتایا کہ رمضان علی باہر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اس نے بہترین اور قیمتی تھری پیس، چمچماتے جوتے، بوٹائی اور قیمتی رسٹ واچ پہن رکھے تھے۔ قیمتی پرفیوم لگا رکھی تھی یقیناً یہ سب چیزیں ماہین صاحبہ کے دیئے ہوئے تحائف ہی تھے۔ وہ اس وقت کہیں کا کا شہزادہ معلوم ہو رہا تھا اس نے ان سب کے سمجھانے بجھانے، پند و نصائح کا کوئی اثر نہ لیا بلکہ یہ کہہ کر ان پر گویا بم گرا دیا کہ وہ اب اپنی بیوی اور بچوں کو ٹیکسلا بھیجنے والا تھا کیونکہ ماہین نے اس سے شادی کے لیے یہی شرط رکھی تھی اس شادی کے بعد اس نے اپنی بیوی کو طلاق نامہ بھجوا دینا تھا۔

اب تو محلے والوں کی پریشانی کی حد نہ رہی عورتوں کو سخت صدمہ اور دکھ پہنچا۔ بے چاری شہناز بی بی کوئٹہ میں اپنے وطن سے اتنی دور بالکل اکیلی تھی کوئی رشتہ دار ساتھی ہمدرد اس کا وہاں نہیں تھا انہوں نے اس کی ہر ممکن دلجوئی اور خبر گیری کرنی شروع کر دی ادھر اتمام حجت کے لیے ابا جان کی سربراہی میں محلے کے مردوں کا وفد بریگیڈیر صاحب سے بھی جا کر ملا اور ان سے درخواست کی کہ وہ بے گناہ، تنہا اور بے سہارا

غزل

یوں ستم گر نہیں ہوتے جاناں
پھول پتھر نہیں ہوتے جاناں

کیوں مرے دل سے کہیں جاتے ہو
گھر سے بے گھر نہیں ہوتے جاناں

وصل کی شب جو کرم تم نے کیے
کیوں مکرر نہیں ہوتے جاناں

غم کے دیپک نہیں جلتے جب تک
دل منور نہیں ہوتے جاناں

ہم تو رہتے ہیں تمہاری حد میں
حد سے باہر نہیں ہوتے جاناں

ایک جیسے ہیں خوشی کے لمحے
دکھ برابر نہیں ہوتے جاناں

اِس قدر خوں نہ بہانا دل کا
دل سمندر نہیں ہوتے جاناں

(باقی احمد پوری)

حسنِ انتخاب: یامین خان، پنڈی۔

Digitized by Google

عورت کا گھر اپنے دختر کے ہاتھوں اجڑنے سے بچائیں رمضان علی کا تبادلہ کسی دور دراز جگہ کروادیں تاکہ وہ بیوی بچوں کے ساتھ وہاں چلا جائے اور ان کی دختر کے ساتھ اس کے تعلقات ختم ہوجائیں مگر انہوں نے کہا وہ ایک دوسری یونٹ میں ہونے کے سبب رمضان علی کا تبادلہ کرانے کے مجاز نہ تھے اور کوئٹہ نئے نئے وارد ہونے کے سبب ان کے رمضان علی کی یونٹ کے کسی افسر سے تعلقات نہیں تھے۔

والد نے بتایا کہ بریگیڈیر صاحب اس وقت بیحد کبیدہ خاطر مایوس اور شکستہ دل دکھائی دے رہے تھے انہیں اس صورت حال پر غصہ بھی بہت تھا لیکن اپنی خودسر اور سرکش بیٹی کے سامنے مجبور و بے بس وہ کچھ نہ کرسکتے تھے جس نے انہیں واضح طور پر دھمکی دی تھی کہ اگر اسے رمضان علی سے شادی سے روکا گیا تو وہ خودکشی کرلے گی۔

پھر ایک دن رمضان علی کی بیوی روتی ہوئی ہمارے گھر آئی اس نے والدہ کو بتایا کہ وہ بچوں کے ساتھ ٹیکسلا جارہی ہے کیونکہ اس کا خاوند چند دنوں تک بریگیڈیر صاحب کی بیٹی سے شادی کرنے والا ہے۔

اس خبر نے پورے محلے کو سن کر کے رکھ دیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی تھی کیونکہ ماہین صاحبہ کا اپنے ماں باپ یہی مطالبہ تھا اور چونکہ بریگیڈیر صاحب کی اس نازوں پلی بیٹی نے شادی کے بعد بھی پہلے جیسی ہی زندگی گزارنی تھی اس لیے بریگیڈیر صاحب نے اپنی بے شمار زمینوں میں سے چند مربع زمین اس کے نام کردی تھی تاکہ اس کی آمدنی سے پہلے جیسی شاہانہ گزر بسر ہوتی رہے اور یہ طے کرلیا گیا تھا کہ شادی کے بعد رمضان علی فوج کی نوکری چھوڑ دے گا اور بریگیڈیر صاحب کے ساتھ مل کر جو چند ماہ میں ریٹائر ہونے والے تھے پراپرٹی کا کاروبار کرے گا یہ لوگ مستقلاً کراچی جاکر آباد ہوجائیں گے جہاں بریگیڈیر صاحب کی محل نما رہائش گاہ' کئی جائیدادیں' فلیٹ اور پلازے وغیرہ تھے۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ان خبروں کی سنسنی خیزی بھی اپنی انتہا کو پہنچتی گئی۔

آخر ایک دن رمضان علی کی بیوی روتی دھوتی محلے والیوں سے مل ملا کر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ٹیکسلا سدھار گئی اس نے بتایا تھا کہ رمضان علی نے اسے طلاق نہ دی تھی کہ بلکہ کہا تھا کہ وہ اپنی شادی کے بعد وہ اسے طلاق بھجوادے گا۔

اب ہمیں رمضان علی اور بریگیڈیر صاحب کی بیٹی کی شادی کا انتظار تھا۔ زینب بی بی ہمیں اس گھر کی تمام خبریں باقاعدگی سے پہنچاتی آرہی تھی اس کے بیان کے مطابق بریگیڈیر صاحب کے بنگلے کو خوب سجایا آراستہ کیا جارہا تھا۔ جھنڈیاں' رنگین بلب' کاغذی پھول وغیرہ لگائے جارہے تھے۔

رشتے دار بھی آرہے تھے غرض یہ کہ وہاں خوب چہل پہل دکھائی دے رہی تھی پھر بریگیڈیر صاحب کے تینوں بیٹے اعجاز' فیاض اور ریاض بھی امریکہ اور انگلینڈ سے بمعہ خاندان آگئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ان کے آتے ہی اس بات پر ضرور ہنگامہ برپا ہوجائے گا کہ ان کی اکلوتی اعلیٰ تعلیم یافتہ لاڈلی ماڈرن اور آزاد خیال بہن کی شادی ایک نیم خواندہ و غریب پینڈو کے ساتھ کیوں ہورہی ہے؟ لیکن حیرت ناک طور پر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی پھر شادی کے کارڈ بھی چھپ گئے۔ ان کارڈوں پر یہ تو لکھا ہوا تھا کہ ماہین کی شادی

Digitized by Google

فلاں تاریخ کو انجام پانے والی تھی مگر کس کے ساتھ؟ یہ نہیں لکھا گیا تھا۔

پھر شادی کا دن آن پہنچا اس کے ساتھ ہی حالات نے ایسی کروٹ لی کہ سب چکرا کر رہ گئے! یعنی ماہین کی شادی رمضان علی کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے بچپن کے منگیتر عدیل سے ہوگئی۔ یہ کیسے ہوا؟ یہ سب باتیں ہمیں زینب بی بی ہی کی زبانی معلوم ہوئیں۔

ہوا یہ تھا کہ بریگیڈیر صاحب اور ان کی بیگم شروع ہی سے اپنے بیٹوں کو تمام حالات سے باخبر رکھے ہوئے تھیں خط و کتابت کے ذریعہ ہی ان میں یہ منصوبہ طے پا گیا کہ ماہین کو ہر قیمت پر اس پینڈو رمضان علی سے شادی کرنے سے روکنا ہے۔

ریاض اور اعجاز نے جو امریکہ میں رہتے تھے اس سلسلے میں عدیل سے بات کی اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا اس کے ساتھ مل کر ماہین کو اس جذباتی بھنور سے نکالنے کا فیصلہ کیا اور اسے ساتھ لیے پاکستان پہنچ گئے ماہین کو جب اس کی آمد کی خبر ملی تو اس کے سر سے رمضان علی کے عشق کا بھوت کسی گھٹیا شراب کے نشے کی طرح اتر گیا اپنے بچپن کے انتہائی مخلص' انتہائی محبت کرنے والے ساتھی' اپنے منگیتر کی آمد پر وہ ایسی مسرور و شاداں ہوئی کہ ماں باپ اور بھائی سب حیران ہو گئے جو یہ اندیشے اپنے دل میں بٹھائے اب تک انتہائی خوفزدہ اور متوحش چلے آ رہے تھے کہ جانے اس موقع پر وہ کیا ہنگامہ کھڑا کرے گی سب عزیزوں رشتہ داروں ملنے جلنے والوں کے سامنے ان کی عزت کا جنازہ نکال دے گی۔

بہر کیف عدیل کو اگلے دن اس بنگلے پر لے جایا گیا جسے بریگیڈیر صاحب نے شادی کے لیے حاصل کیا تھا اور جسے خوب سجایا سنوارا گیا تھا وہاں سے عدیل کی بڑی دھوم دھام سے بارات بریگیڈیر صاحب کے بنگلے پر گئی اور ماہین بیاہ کر عدیل کے ہمراہ اس کے بنگلے پر آ گئی وہاں اگلے دن شاندار ولیمہ ہوا اس کے بعد دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ چل نکلا۔ پھر کچھ عرصے بعد اعجاز' ریاض' ماہین اور عدیل کراچی چلے گئے جہاں سے وہ امریکہ پرواز کر گئے۔

رمضان علی کا کیا بنا؟

شادی کے دن وہ بے چارہ اپنے گھر بیٹھا انتظار ہی کرتا رہا کہ بریگیڈیر صاحب کے گھر سے کوئی آئے اور اسے اس بنگلے پر لے جائے جہاں سے اس کی بارات جانی تھی مگر کوئی بھی اسے لینے نہ آیا.....

اس نے شاید چھپ چھپاتے باہر نکل کر سب کچھ معلوم کر لیا تھا اس لیے وہ خاموشی سے اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھا رہا تھا پھر ایک دن محلے والوں نے اس کے دروازے کو تالا لگا ہوا دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس شادی سے پہلے ہی نوکری سے استعفیٰ دے چکا تھا اور اب وہ اپنے گاؤں چلا گیا تھا جہاں اس کی وفا شعار بیوی بھی اس کے لوٹ آنے کی منتظر تھی اپنی تمام تر بے وفائیوں' ستم رانیوں' لغزشوں کے باوجود اس نے یہ بات عقل کی کی تھی کہ اسے طلاق نہ دی تھی اس کا گھر سلامت تھا۔ واقعی صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔

ایک امیر زادی کے تفریحی عشق اور ایک سادہ لوح شخص کے مبتلائے فریب ہونے کا یہ واقعہ ایسا دلچسپ اور سنسنی خیز تھا کہ اس علاقے کے لوگ مدتوں اسے یاد کرتے اور سر دھنتے رہے!

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

زندگی تو بہت بری ہے

بگڑے نوجوان کی کتھا.....ایک وقت ایسا بھی آیا کہ زندگی ہی بگڑ گئی.....

ارشد ابرار ارش

اس الجھے بالوں والے بوڑھے فقیر کی باتوں کے مفاہیم و مطالب پہلے پہل میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ اس میں زیادہ قصور میری بلوغت کا ہی تھا۔ دنیا بھر کی تھکان اٹھائے اس میلے کچیلے کپڑوں والے فقیر سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تب میری مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں۔ دنیا کو دیکھنے اور کھوجنے کا شوق من میں موجزن تھا۔ میرے پاؤں نے سکون کرنا کبھی سیکھا ہی نہیں تھا دن بھر خوب مستیوں میں گزرتے اور میں یہاں وہاں تمام دن آزادانہ گھومتا رہتا۔

ہماری پہلی ملاقات خزاں موسم میں بستی کے سرے پر سالوں سے اگے بوڑھے برگد کے نیچے ہوئی تھی۔ وہ فقیر اپنی دھن میں مست برگد کی چھاؤں میں آلتی پالتی مارے زمین پر خدا جانے کون سی زبان کے کچھ الفاظ لکھ رہا تھا جو میں بارہا کوشش کے باوجود بھی پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر رہا۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر محو و مشغول تھا کہ اسے اپنے آس پاس کے ماحول کی بھی چنداں فکر نہیں تھی کہ میں کتنی دیر سے اس کے قریب کھڑا رہا مگر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تک نہیں۔ اور اتنی دیر سے میں اس کے پاس کھڑا بات کرنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگا۔ مگر اتنی دیر بعد بھی میرے پاس بات شروع کرنے کے لیے کوئی موضوع نہیں تھا

''کیا لکھ رہے ہو تم.....؟'' یہی وہ پہلا جملہ تھا جو اتنی دیر سوچ بچار کے بعد میں ادا کرنے میں کامیاب ہو پایا۔

''زرد پتوں کا نوحہ۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر اپنے کھنکتے ہوئے مگر اس قدر مدھم لہجے میں جواب دیا کہ میں باوجود توجہ کے بمشکل سننے میں کامیاب ہو سکا مگر بات کا مطلب سمجھنے میں ابھی بھی ناکام رہا

''زرد پتوں کا نوحہ کیا ہوتا ہے؟'' میں ایک قدم مزید اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا تاکہ اگلی دفعہ سننے میں مشکل نا ہو۔ میرے پاؤں تلے آنے والے زرد پتوں کی چرمراہٹ بھی مجھے بخوبی سنائی دی۔

''زرد پتوں کی چرمراہٹ نوحہ ہے، زوال کا نوحہ۔ سبز تھے تو زینت تھے زرد ہوئے تو پاؤں تلے آ

Digitized by Google

گئے۔''اس بار فقیر نے میرے پاؤں تلے چرمرائے ہوئے پتوں کی جانب نگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ میں ابھی تک اس کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ پایا تھا۔

اس الجھے بالوں والے فقیر کی ابھی باتوں کی تہہ تک تو میں ابھی بھی نہیں پہنچ پایا تھا مگر اب مزید بات جاری رکھنے کے لیے میرے پاس الفاظ بھی ختم ہو چکے تھے۔

میں نے اوپر برگد کی جانب نگاہ کی تو دیکھا خزاں نے عمر رسیدہ برگد کو عریاں کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ خزاں رسیدہ پتے یہاں وہاں سارے میں بکھرے ہوئے تھے۔ برگد کی ننگی ٹہنیوں سے سورج کی تیز دھوپ چھن چھن کر اس فقیر کی پیٹھ کو جھلسا رہی تھی مگر اسے اس بات کی جیسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔

''گھر کہاں ہے تمہارا اور اس گرمی میں یہاں مٹی پر کیوں بیٹھے ہوئے ہو تم.....؟'' مجھے بالآخر تھوڑی دیر بعد بات جاری رکھنے کو موضوع مل ہی گیا۔

''گھر تھا، ٹوٹ گیا' مٹی پر اس لیے بیٹھا ہوں کیونکہ مٹی 'میں' مارتی ہے عجز سکھاتی ہے۔'' وہ اب پھر سے زمین پر نا سمجھ آنے والی عجیب وغریب زبان میں کچھ لکھنے لگا تھا۔

میرے پاس اب پھر بولنے کو کچھ بھی نہیں تھا تبھی مجھے اسی لمحے ایک شرارت سوجھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور زمین پر کھینچی گئی اس کی تمام لکیروں کو ہاتھ سے مٹا دیا۔

زمین پر کچھ لکھتے اس کے ہاتھ اچانک رکے تبھی اس نے پہلی بار میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

URDU TUBE
A WORLD OF ENTERTAINMENT

Digitized by Google

میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ کتنی ہی دیر وہ یوں خاموش بیٹھا کڑے تیوروں سے مجھے دیکھتا رہا۔

مجھے آج بھی یاد پڑتا ہے وہ عجیب سے چہرے کا مالک تھا جیسے کوئی جنگ زدہ شہر ہو۔ اس کے چہرے پر اس قدر ویرانی تھی جیسے کسی غریب ملک میں ایک سامراجی ملک کے قبضہ کرنے کے بعد ہوتی ہے۔ میں اسے یوں خوفناک پیلی زرد آنکھوں سے اپنی طرف مسلسل گھورتی نگاہوں سے دیکھتا پا کر ہول سا گیا اور میرا دل میرے پاؤں تلے آنے والے زرد پتوں کی طرح کپکپا اٹھا۔

میں وہاں سے اب بھاگ جانا تھا مگر بھاگنا محال تھا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ رکھے ہوں۔ خوف سے میرے قدم بھاری ہو گئے۔

''بنی ہوئی کو بگاڑو گے تو خود بھی اجڑ جاؤ گے۔'' کافی دیر اپنی پیلی زرد آنکھوں سے مجھے گھورنے کے بعد کہتا ہوا وہ فقیر وہاں سے اٹھ کے چلا گیا۔

برگد کے خزاں رسیدہ پتے اب بھی اس کے پاؤں تلے چرمرا رہے تھے۔

''زرد پتوں کا نوحہ'' پتوں کی چرمراہٹ سن کر فقیر کا جملہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

☆.....☆.....☆

یہ میرے مزاج کا طنطنہ ہی تھا جس نے ہمیشہ مجھے سب سے الگ تھلگ رکھا اور کبھی چھوٹے بھائیوں کو میرے قریب بھٹکنے تک نہیں دیا۔ میں گھر میں پہلی اولاد ہونے کے ناطے سب سے لاڈ اٹھوانا اور اپنی تمام خواہشات پوری کروانا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے والدین کا اضافی پیار بھی میرے حصے میں آیا۔

میرا کہا ہمیشہ حرفِ آخر سمجھا جاتا ورنہ زرا سی تاخیر کی صورت میں گھر سر پر اٹھا لیتا تھا۔ اپنے مزاج سے مجبور بھی تھا کہ غصہ ہمیشہ میری ناک پر دھرا رہتا۔ ابا سمجھاتے تھے ''فلک شیر پتر۔۔۔ اپنے مزاج میں کچھ نرمی پیدا کرو اس قدر گرمی اچھی نہیں ہوتی۔'' میں اثبات میں سر تو ہلا دیتا مگر ابا کی نصیحتوں پر کبھی عمل پیرا نہیں ہوا۔

زرا قد کاٹھ نکالا تو آنکھوں نے بھی بڑے بڑے اور اونچے اونچے خواب دیکھنا شروع کر دیے۔ ابا ہزار بار کی ہوئی نصیحت پھر دہراتے۔

''پتر آسمان پر نگاہیں ضرور رکھو مگر مت بھولو کہ تمہارے پاؤں ابھی بھی زمین پر ہیں..... یاد رکھنا کہ آسمان پر تھوکا ہمیشہ منہ پر پلٹتا ہے۔'' مگر ابا کو کون سمجھاتا کہ چڑھتی جوانی پاؤں زمین پر رکھنے ہی کب دیتی ہے بھلا؟

زرا سے پر کیا نکلے مجھے گاؤں کی زندگی بے معنی و بے مقصد لگنے لگی۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا کچھ بڑا کرنا چاہتا تھا جو گاؤں میں رہتے ہوئے ممکن ہی نہیں تھا۔

میری بے لگام خواہشوں کو روکنا میرے لیے اب ناممکن تھا۔ اپنی اگلی زندگی کے حوالے سے دیکھے جانے والے خوابوں کا ایک ریلہ ہوتا جو میرے اندر بہتا رہتا۔ میرا دماغ ہمہ وقت نت نئے منصوبے بناتا رہتا۔

میں تمام دنیا کو مسخر کرنا چاہتا تھا دنیا کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا میری منزل یہ نہیں تھی میرے راستے مجھے بلاتے تھے اور مجھے لگتا میں گاؤں میں خود کو ضائع کر رہا ہوں۔

اب یہاں سے میرا دل اٹھ چکا تھا گاؤں کے اس دو کمروں پر مشتمل گھر میں میرا دم گھٹنے لگا۔

میں نے والدین کے سامنے شہری زندگی اور سہولیات کے گن گانا شروع کر دیے۔ مگر ابا کی محدود آمدنی میں یہ سب ممکن نا تھا دوسرا گاؤں اور اپنی مٹی کی محبت ان کی نس نس میں بس چکی تھی۔ اپنی زمینیں

URDU TUBE
Digitized by Google

انہیں جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ ان کے لیے گاؤں کو ترک کر کے شہر چلے جانا محال ترین عمل تھا جس پر وہ ہرگز تیار نہیں تھے۔

نتیجتاً میرے چڑچڑے پن میں اضافہ ہونے لگا۔ میں بات بے بات چھوٹے بھائیوں کی دھلائی کر دیتا۔ گھر میں اماں کے ہر کام میں کیڑے نکالتا۔ ہر وقت منہ پھلائے رہتا۔ سب سے ناراض رہنا میں نے اپنا وطیرہ بنا لیا۔ مجھے لگتا یہ سب لوگ میرے خوابوں کی راہ میں رکاوٹ ہیں میرے تابناک مستقبل کے حصول کے لیے میرے اپنے میرے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔ خدا جانے کیوں یہ لوگ برسوں سے گاؤں کی بوسیدہ زندگی جیئے چلے جا رہے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ میں اکثر و بیشتر برہم رہتا۔ اماں ابا سو طرح سے سمجھاتے مگر ان کی تمام نصیحتیں میرے کانوں سے ٹکراتے ہی بے اثر ہو جاتیں۔

اگلے سال اماں نے خاموشی سے آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لیے مٹی اوڑھ لی۔ بظاہر انہیں کوئی بیماری بھی نہیں تھی خدا جانے ایسا کون سا دکھ تھا جو وہ اندر ہی اندر پالتی رہیں اور ایک دن یہی دکھ ان کی جان کو آ گیا۔ اماں حیات تھیں تو ان کا وجود بے ضرر سا لگتا۔ پہلے ان کی ذات کی اہمیت معلوم نہیں تھی، اب ہونے لگی تھی۔ اللہ نے ہمیں بہن دی ہی نہیں تھی ہم پانچ بھائی اپنے روزمرہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی رشتہ داروں اور محلہ داروں کے محتاج ہونے لگے۔

میں نے پھر بھی اس زندگی کو اپنا لیا مگر چھوٹے بھائیوں کے لیے زندگی اس قدر آسان نہیں تھی۔ بھائیوں کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے اور گھر کے توازن کے لیے ایک وجود زن کی لازمی ضرورت تھی۔

اسی مجبوری کے پیش نظر اور عزیز و اقارب کے بے انتہا اصرار پر دو سال بعد ابا نے گاؤں کی ہی ایک بیوہ عورت کے ساتھ سادگی سے نکاح پڑھوا لیا۔

ابا چاہتے تھے میں شادی کر لوں مگر میں گاؤں کی کسی گنوار لڑکی کو پاؤں کی زنجیر بنا کر ہمیشہ کے لیے یہیں مقید ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجبوراً ابا کو دوسری شادی کرنی پڑی۔

گھر میں نئی عورت کی آمد گویا میرے لیے میرے خوابوں کی تکمیل کا عندیہ ثابت ہوئی۔ میرے اندر دبی ہوئی برسوں پرانی خواہش پھر سے انگڑائیاں لینے لگی۔ میں نے 'نئی ماں' سے روز کا جھگڑا معمول بنا لیا۔ حالانکہ وہ عادتاً و مزاجاً شریف طبع تھیں، امورِ خانہ داری اور ہم سب بھائیوں کی ضروریات کا بخوبی خیال رکھتیں مگر میں ان کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی کو بھی پکڑ لیتا اور روز رات کو ابا کے سامنے رائی کا پہاڑ بنا کے پیش کرتا۔

میں ان کے لیے ایک جھگڑالو ساس کی کمی پوری کر رہا تھا۔ اور ان کے ہر کام میں مین میخ نکالنا ضروری خیال کرتا۔

گھر میں جھگڑے بڑھنے لگے سکون تباہ ہونے لگا آس پڑوس میں سب یہی سمجھتے کہ سوتیلی ماں بچوں پر ظلم کرتی ہے جبکہ حقیقتاً وہ صلح جو عورت تھی۔

ابا میری عادات سے واقف تھے اس لیے روز سمجھاتے، چھوٹے سب بھائی ترحم آمیز نگاہوں سے میری جانب دیکھتے مگر یہاں نا تو پہلے کسی پر اثر ہوتا تھا نا ہی اب ہوا۔

ایسے ہی ایک عام سے دن ایک معمولی سی بات کا بتنگڑ بنا کر میں نے اپنا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ درحقیقت گھر چھوڑنے کا فیصلہ میرا ان سوچوں کو عملی جامہ پہنانا تھا جن کی منصوبہ بندی میں پچھلے کئی ماہ سے کر رہا تھا۔

میں نے ابا کے بندھے ہاتھوں کی پرواہ بھی نہیں، بھائیوں کے آنسوؤں تک کو نہیں دیکھا اور نا ہی اپنی

Digitized by Google

سوتیلی ماں کے دیے گئے 'واسطوں' کی لاج رکھی اور ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر کراچی چلا آیا۔

کراچی میں میری خوش قسمتی اپنے دونوں بازو کھولے مجھے گلے لگانے کو منتظر کھڑی تھی۔

گاؤں والوں سے سنتا تھا کہ کراچی غریبوں کی ماں ہے جبکہ میرے لیے تو ماں سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئی۔

مجھے زیادہ دن دھکے نہیں کھانے پڑے اور ایک کپڑا بنانے کی فیکٹری میں مجھے کام مل گیا۔۔۔

مالک نیک دل تھا مزدوروں پر رحم دل تھا۔ فیکٹری مالک سے میری ملاقات غیر متوقع طور پر ایک پارک میں ہوئی تھی جہاں وہ روز صبح سویرے ہوا خوری کے لیے آتے تھے۔۔۔

نعیم صاحب کو میں نے اپنے متعلق فرضی کہانی گھڑ کے سنائی اور خود پر ہونے والے مظالم کی داستان مرچ مصالحے لگا کر صاحب کے گوش گزار کی تو نرم دل نعیم صاحب جلد ہی پگھل گئے اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے میری رہائش کا بندوبست کیا اور اپنی فیکٹری میں ملازمت بھی دے دی۔

جلد ہی میں نے مشینوں سے دوستی کر لی۔ کام سیکھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور میرے ہنر کا طوطی بولنے لگا اور قلیل مدت میں ہی فیکٹری میں اپنے کام کے حوالے سے مشہور ہونے لگا۔ نعیم صاحب میرے ہنر کے گرویدہ ہو گئے اور میری تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے مزدوروں کی فہرست سے ترقی دے کر اسسٹنٹ منیجر کا عہدہ بھی دے دیا۔

اس تمام عرصے میں کبھی گاؤں مڑ کے واپس نہیں گیا۔ حالانکہ کئی بار دل کو گاؤں کی گلیاں کھینچتی تھی مگر میں نے دل پتھر کر لیا۔۔۔

آج جب میں اس عہدے پر پہنچ چکا تب بھی میں اپنے والد اور بھائیوں کی خبر گیری کو واپس نہیں گیا۔ ہاں اس دوران دو چار خطوط کا تبادلہ ضرور ہوا۔

میں نے ابا کو پیغام بھجوایا کہ وہ سب بھائیوں کو لے کر یہاں شہر آ جائے یہاں اب میری مالی حالت اس قدر بہتر تھی کہ میں اپنے بھائیوں کا خرچ بخوبی اٹھا سکتا تھا۔

مگر ابا کی وہی ضد کہ وہ گاؤں چھوڑ کے کہیں نہیں جا سکتے نا ہی وہ کبھی اپنی زمینیں بیچیں گے۔ مجھے ابا پر سخت غصہ آتا تھا۔ ابا دل ہی دل میں میرے خلاف ناراضی رکھتے تھے اور گاؤں چھوڑنے کی بجائے مجھے واپس گاؤں بلا کر میری شادی کرنا چاہتے تھے مگر میرے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں تھا کہ میں اپنے گاؤں کی کسی اجڈ گنوار لڑکی سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے پھر سے وہیں مقید ہو جاؤں۔ گاؤں میرے مستقبل کے منصوبوں میں کہیں شامل نہیں تھا

یہاں خوش قسمتی مجھ پر دل کھول کر برس رہی تھی اور میں اتنا بے وقوف نہیں تھا اپنی خوش قسمتی کو پیٹھ دکھا کے واپس پیچھے بھاگ جاؤں اور وہی زندگی اپنا لوں جہاں میرا دم گھٹتا تھا۔

اب جبکہ نعیم صاحب نے مجھے ایک گھر دے کر اپنی بیٹی سے شادی کا عندیہ دے دیا تو واپس گاؤں چلے جانا کفرانِ نعمت ہی تو تھا۔ یہ سراسر بے وقوفانہ فیصلہ تھا جو میں نے اگلے ہی خط میں داشگاف الفاظ میں ابا تک پہنچا دیا۔

اب میری طبیعت میں اگر کچھ مغرورانہ پن شامل ہونے لگا تو میں خود کو اس میں حق بجانب سمجھتا تھا مجھ میں کچھ تو ایسا تھا جو پوری فیکٹری میں نعیم صاحب کی نگاہِ انتخاب صرف مجھ پر آ ٹھہری۔۔۔ یہ میرا ہنر ہی تھا جس نے نعیم صاحب کی نگاہوں میں مجھے معتبر ٹھہرایا

اور انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے مجھے منتخب کیا۔ نعیم صاحب کے داماد کے طور پر پہچانا جانا تو میں نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں دیکھا تھا بجائے اس کے کہ

Digitized by Google

یہ سب حقیقت میں میرے سامنے رونما ہونے لگے۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگتا، میں ان دنوں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتا میرے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں تھے اور مجھے اپنا آپ معتبر نظر آنے لگا۔

میری چال ڈھال، اندازِ تکلم، پہناوے میں غیر معمولی فرق آ گیا۔ اب بے اختیار دوسرے فیکٹری مزدوروں سے مخاطب ہوتے ہوئے میرا اندازِ تخاطب اور الفاظ تحقیرانہ ہو جاتے۔

میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتا۔ میں کئی بار نعیم صاحب کی اکلوتی بیٹی ماریہ کو فیکٹری وزٹ پر آیا دیکھ چکا تھا۔

گو کہ طبیعت، فطرت اور تربیت میں میرا ماریہ سے کوئی موازنہ و مقابلہ ہرگز نہیں تھا بلکہ یہ موازنہ حور کی بغل میں لنگور کے مصداق ہوتا مگر ان دنوں مجھے اپنا آپ بھی کسی شہزادے سے کم نا لگتا اور خدا جانے کیوں میری گردن میں ایک سریا سا آ گیا جو اسے کبھی جھکنے کا خیال تک نا آنے دیتا۔

میں وقت کے پنوں پر اپنی داستان خود رقم کر رہا تھا۔ ابا کی ضد پر بے انتہا غصہ بھی آتا تھا مجھے۔ خدا جانے ان کے دماغ میں یہ بات کیوں نہیں سماتی تھی کہ گاؤں میں کچھ نہیں رکھا۔ دنیا کے ساتھ رہنے کے لیے دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا پڑتی ہیں، دنیا کے قدم سے قدم ملانا پڑتا ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے کچھ لوگوں کو کچلنا پڑے تب بھی دنیا پیچھے مڑ کے نہیں دیکھتی۔ ابا کو بھلا کیا معلوم کہ میں کس طرح اپنی ذہانت، چالبازی اور سیاسی سوچ سے مزدور یونین کا صدر اور پھر سابقہ منیجر کے خلاف کامیاب سازش کے بعد اس کی جگہ لینے میں کامیاب ہوا تھا۔ میرے مطابق انہیں دنیا کے ساتھ چلنا آتا ہی نہیں تھا جو وہ برسوں سے ابھی تک کھیتوں میں ہل جوت رہے تھے۔

اب اگر ابا کو شہر پسند نہیں تھا تو مجھے بھی گاؤں سے نفرت تھی۔ وہ انا کے گھوڑے پر سوار تھے تو مجھے بھی اپنا مستقبل عزیز تھا۔ یہاں میرے لیے ایک دلکش اور قابلِ رشک زندگی میری منتظر کھڑی تھی۔ پیچھے گاؤں میں سوائے خواری، جاہلیت، اور کولہو کے بیل کی طرح کام کاج کرنے کے میرے لیے کچھ نہیں تھا۔ واپس جانے کی صورت میں ابا سال بھر میں وہیں کسی گنوار لڑکی سے شادی کر دیتے اور میں ہمیشہ کے لیے گاؤں کا ہو کر رہ جاتا اور اس مقام تک پہنچنے کی ساری محنت گاؤں کی ہی مٹی میں مل جاتی۔

یہاں میں نعیم صاحب کا ہونے والا داماد تھا نعیم صاحب جنہیں سو پچاس لوگ جھک کے سلام کرتے تھے۔ ان کے پاس پیسہ، نام، شہرت، سٹیٹس، زمینیں، فیکٹری، بنک بیلنس، گاڑیاں، دیدہ زیب گھر، نوکر چاکر۔۔۔ کیا نہیں تھا۔ مجھے مستقبل میں نعیم صاحب کی جگہ لینی تھی ابا کی جگہ کھیتوں میں تمام عمر ہل نہیں چلانے تھے۔

میں نے اسی دن فیصلہ کر لیا جب ابا نے ناراضی بھرا اپنا آخری خط لکھا کہ میں واپس آ جاؤں کیونکہ وہ اب بوڑھے ہونے لگے ہیں انہیں عمر کے اس حصے میں میری ضرورت ہے۔ واپس نا آنے کی صورت میں ابا مجھ سے ہمیشہ کے لیے خفا ہو جاتے۔۔۔

مگر میں نے شہر کو اپنے گاؤں پر فوقیت دی۔ اور ساری زندگی کھیتی باڑی کرنے سے نعیم صاحب کا داماد بن کے یہیں اپنا مستقبل سنوارنے کو ترجیح دی۔

☆.....☆.....☆

ماریہ سے شادی کر کے گویا میں نے اپنے خوابوں کو پا لیا تھا۔ مجھے وہی پرتعیش زندگی مل گئی جس کے میں برسوں سے خواب دیکھتا آیا تھا اور جس کے لیے میں اپنے خاندان اور گاؤں کو کئی سالوں کے فاصلے پر چھوڑ آیا تھا۔

مگر میری آنکھوں سے شادی کی پہلی ہی رات

Digitized by Google

ماریہ نے خوش فہمی کی پٹی کھینچ کے اتار دی۔ درحقیقت ماریہ کے پاؤں زنجیر کرنے کے لیے ہی نعیم صاحب نے میرا انتخاب کیا تھا۔ فیشن زدہ اور بگڑے معاشرے کی دلدادہ ماریہ کو برداشت کرنا میرے لیے لوہے کے چنے چبانے جیسا تھا۔ وہ امیر زادی حد درجہ بگڑی ہوئی تھی اور بیباک اس قدر کہ اس نے سہاگ رات میں ہی اپنے معاشقے گنوانے کے ساتھ ساتھ مجھے میری اوقات بھی یاد دلا دی۔ میں اس کی نظر میں نعیم صاحب اور ان کے ٹکڑوں پر پلنے والا ایک وفادار ملازم تھا اس سے بڑھ کے کچھ بھی نہیں۔ اور ماریہ کے بقول یہ شادی اس کے پاؤں کی زنجیر ہرگز نہیں بن سکتی۔

میں رات بھر آنکھیں پھاڑے ماریہ کو دیکھتا رہا اور وہ سگریٹ پھونکتی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ فون پر قہقہے لگاتی رہی۔

اگلے دن میں اپنی شکایت لے کر نعیم صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے میرے سامنے ہاتھ باندھ لیے کہ وہ اب ماریہ کو سمجھا سمجھا کر تھک چکے ہیں اب مجھے ہی کسی طرح اس آزاد طبع گھوڑی کو قابو کرنا ہوگا۔ مگر ماریہ ایسی گھوڑی تھی جو مجھ جیسوں کو اپنی پیٹھ پر ہاتھ بھی نا رکھنے دے۔ میں تو اس کی نگاہ میں کسی اجڈ گنوار جوکر سے کم نہیں تھا۔ وہ مجھ پر ہنستی تھی، میرے سامنے بیٹھ کے مجھ پر ٹھٹے لگاتی، اور میری تحقیر کھل کر کرتی گویا میں اس کا مجازی خدا نہیں گھر کا کوئی تنخواہ دار ملازم ہوں جو وقت پر اپنا کام تک مکمل نہیں کرتا۔

میرے دن رات کڑھنے میں گزرنے لگے۔ بے بسی اس قدر تھی کہ میں اپنی بیوی کے پاس بھی نہیں بھٹک سکتا تھا اور اگر ایسی جرات کبھی کر بھی لیتا تو ماریہ گھر سر پر اٹھا لیتی اور مجھے میری اوقات یاد آ جاتی۔

زندگی میں سب کچھ میسر تھا گاڑی، بنگلہ، سٹیٹس، عزت، شہرت۔۔۔۔ کچھ نہیں تھا تو گھر کا وہ سکون مفقود تھا جس کا ایک شوہر حقدار و متقاضی ہوتا ہے۔

میں فیکٹری منیجر تھا اور عین ممکن تھا کل کو نعیم صاحب کی وفات کے بعد فیکٹری کا ملکیت بھی میرے حصے میں آ جاتی۔ کیونکہ ماریہ کو صرف آزادی درکار تھی وہ جس قدر شاطر سہی میری کمینی سوچ تک کبھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میری مکروہ سوچیں آجکل فیکٹری کی ملکیت کے اردگرد منڈلانے لگی تھیں۔ اس کے لیے ایک لمبا انتظار درکار تھا جب تک نعیم صاحب حیات تھے۔ ان کے آنکھیں موندتے ہی یہ فیکٹری مجھے مل جاتی پھر میں فیکٹری کے سیاہ و سفید کا مالک بن جاتا۔ فیکٹری کی ملکیت کے لیے ہی تو میں اپنی ہر تذلیل و تحقیر کے باوجود اب تک ماریہ کو برداشت کرتا چلا آ رہا تھا

مگر یہ صرف میری سوچ تھی اوپر والے مالک کو کچھ اور ہی منظور تھا۔۔۔

میری شادی شدہ زندگی بلکہ ذلالت شدہ زندگی کا یہ تیسرا سال تھا

زندگی کا مزاج اب بھی میرے ساتھ وہی سرد و گرم تھا۔ ایسے لگتا جیسے قسمت نے میرے ساتھ کوئی بھونڈا مذاق کیا ہو اور زندگی مجھ سے چند قدم دور کھڑی میری حالت پر قہقہے لگا رہی ہو۔

گھر سے باہر اور فیکٹری میں بطور منیجر کام کرتے ہوئے میرا ایک خاص مرتبہ اور شان تھی۔ رعب و دبدبہ تھا جو مزدوروں کو میرے سامنے آنکھ اٹھانے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا مگر میں نعیم صاحب کے عالیشان گھر میں قدم رکھتے ہی بھیگی بلی بن جاتا۔ فیکٹری والا میرا رعب و دبدبہ ہوا میں تحلیل ہو جاتا اور میں ماریہ کے آگے بے بس ہو جاتا کیونکہ اس کی نظر میں اب بھی میری اوقات کسی نوکر سے ہرگز بڑھ کے نہیں تھی۔

میں اب اپنی اسی زندگی سے سمجھوتہ کر چکا تھا۔ بے بس اس لیے بھی تھا کہ نعیم صاحب جیتے جی

Digitized by

اپنی یہ عالیشان کوٹھی ماریہ کے نام لکھ چکے تھے انہوں نے اپنے لیے صرف فیکٹری رکھی تھی جو ممکنہ طور پر مجھے سنبھالنی تھی۔ میں ہی ان کا سب سے قریب ترین اور قابلِ بھروسہ عزیز تھا۔

یہ شادی کے تین سال بعد کا ذکر ہے جب میری کار ایک شدید حادثے کا شکار ہوئی اور میں اپنی ایک ٹانگ اور بازو کھو بیٹھا۔ اس حادثے نے مجھے میری زندگی کے بھیانک ترین موڑ پر لا کھڑا کیا۔ کئی ماہ مسلسل ہسپتال میں گزارنے کے بعد واپسی پر میں ایک بیساکھی اور مصنوعی بازو کا محتاج تھا۔

نعیم صاحب نے ہی ہسپتال کا تمام خرچ اٹھایا۔ زندگی ایک دم سے میرے لیے تبدیل ہوگئی۔

فیکٹری میں میری جگہ نئے منیجر کو مل گئی اور میری زندگی صرف گھر تک محدود ہوگئی۔ وہ گھر جہاں اب ماریہ مجھے اپنے جوتے کی نوک پر رکھتی۔

ہسپتال سے واپس گھر منتقل ہوتے ہی اس نے طلاق کا وہ شور مچایا کہ نعیم صاحب بھی شرمندہ نگاہوں سے مجھے ماریہ کو طلاق دینے پر مجبور کرنے لگے۔

میری پرتعیش زندگی ایک ہی جھٹکے میں ختم ہوگئی تھی۔ میں اب اس گھر پر بوجھ تھا۔ طلاق کے بعد ماریہ نے اپنے بوائے فرینڈ سے دوسری شادی رچالی تھی اس بار نعیم صاحب نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔

میرا نامکمل وجود اب ناکارہ بھی تھا آہستہ آہستہ نعیم صاحب کی نگاہِ ترحم بھی بدلنے لگی۔ میں ہر کسی کے لیے ایک بوجھ تھا اس سے پہلے کہ نعیم صاحب وہ بوجھ خود اتار کر پھینک دیتے میں نے واپس چلے جانا بہتر سمجھا۔ وہیں جہاں میں پانچ سال پہلے سب کو ٹھکرا کر اپنے خوابوں کی تکمیل کو نکلا تھا۔

میں نے بہت جلدی انسانی رویوں کو بدلتے دیکھا تھا۔ کبھی میں خود بھی اپنے تمام خونی رشتوں سے نگاہیں اور رویے بدل کر ان سب کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

آج میں ایک بار پھر شرمندہ نگاہوں سے اسی دروازے پر واپس آیا کھڑا تھا جس پر کبھی تھوک کے شہر بھاگ گیا تھا۔

اس کچے گھر کے مکینوں نے کچھ ایسی گرمجوشی اور محبت سے میرا استقبال کیا کہ میری جھکی ہوئی شرمندہ آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔

میں ان سب کی محبتوں کا ہرگز حقدار نہیں تھا مگر میرے بھائیوں اور بوڑھے والد کی بانہیں پھر بھی میرے لیے کھلی ہوئی تھی۔۔۔

اب میں ہر سال اپنے نامکمل وجود کے ساتھ شدت سے خزاں موسم کا انتظار کرتا ہوں۔

خزاں اپنی ازلی بے دردی سے سرسبز درختوں کو برہنہ کردیتی ہے اور میں اپنے گاؤں کے اس بوڑھے برگد تلے آبیٹھتا ہوں۔

میرے اکلوتے پاؤں تلے اب بھی خزاں رسیدہ پتے چرمراتے ہیں تو بوڑھے فقیر کے الفاظ میری سماعتوں سے ٹکرانے لگتے ہیں۔

''بنی ہوئی کو بگاڑو گے تو خود بھی اجڑ جاؤ گے۔''

''زرد پتوں کی چرمراہٹ نوحہ ہے..... زوال کا نوحہ۔''

''سبز تھے تو زینت تھے، زرد ہوئے تو پاؤں تلے آگئے.....''

میں دن بھر برگد تلے بیٹھا اپنے بوسیدہ حلیے کے ساتھ زمین پر اپنے ماضی کی آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا ہوں۔

روز میرے دل میں ایک حسرت جاگتی ہے کہ کوئی بچہ آکے مجھ سے پوچھے۔

''بابا کیا لکھ رہے ہو تم.....؟'' اور میں اس کے پاؤں تلے آئے بوڑھے برگد کے چرمرائے ہوئے پتوں کو دیکھ کر اسے بتاؤں ''زرد پتوں کا نوحہ۔''

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

کراچی سے ارسال کردہ سسپنس اور تھرل سے بھرپور تحریر

گمشدہ

نعیمہ کا بیٹا لاپتہ تھا گھر والے روز کرب سے گزرتے تھے بالآخر
یہ معمہ حل ہو ہی گیا کہ جنید کی گمشدگی میں کس کا ہاتھ تھا.....

ماہم اوزلین

''اتنی رات ہوگئی ہے، اس وقت وہ کہاں جاسکتا ہے؟'' نعیمہ کی آواز میں وہی پریشانی گھلی ہوئی تھی، جو ایک ماں کے لہجے میں اولاد کے لیے ہوتی ہے۔

''پتا نہیں امی! میں اتنی دفعہ اس کا نمبر ٹرائی کر چکا ہوں بند جارہا ہے۔'' جنید کی آواز میں بھی فکر تھی۔

''اس کے کسی دوست وغیرہ کو فون ملاؤ۔ ہوسکتا ہے وہ وہاں چلا گیا ہو۔'' یہ آواز عزیز ماموں کی تھی۔

''نہیں بھائی جان! بتاتا ئے وہ کہیں نہیں جاتا۔'' نعیمہ اتنا تو اپنی اولاد کو جانتی ہی تھیں۔

''ویسے تمہاری اولاد بھی نا نعیمہ! بہانے بہانے سے مجھے پریشان ہی کرتی رہتی ہے۔ میں نے یہ سوچ کر اتنے سال تمہاری اور ان کی کفالت کی کہ چلو بہن کے بچے ہیں، یتیم ہیں۔ میری ذمہ داری ہیں۔ پھر ان کے بڑے ہوتے ہی جب مجھے لگا کہ یہ گھر کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں اور میں ذمہ داری سے آزاد ہوں تو تم نے زویا کی شادی کا چکر اٹھا دیا۔ اور اب یہ جنید کی گمشدگی کا مسئلہ۔ سکون میری زندگی میں لکھا ہی نہیں ہے۔''

''بات ہی ایسی ہوگئی بھائی صاحب ورنہ یوں آپ کو پریشان نہ کرتے۔'' نعیمہ شرمندہ شرمندہ سی تھیں۔

جنید مزید کچھ سنے بنا کچن میں آگیا۔

''کیا ضروری ہے کہ یہ جب بھی یہاں آئیں تو ہر دفعہ اپنے دو سال کے کیے گئے احسانوں کی فہرست یاد کروائیں۔'' وہ چڑ کر سامنے کھڑی طوبیٰ سے بولا۔

''احسان دو سال کا ہو یا دو دن۔ احسان احسان ہی ہوتا ہے۔ آپ نفی کر کے اسے جھٹلا نہیں سکتے بھائی۔'' طوبیٰ چائے کے لیے کیتلی نکالتے ہوئے بولی۔

''احسان جتانے سے اس کا ثواب اور اس کی ویلیو دونوں ختم ہوجاتی ہیں۔'' وہ کچن میں رکھی دو سیٹوں پر مشتمل ڈائننگ چیئر کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

Digitized by Google

''میں اس وقت آپ سے بحث نہیں کرسکتی۔'' وہ جھک کر چولہے کی لو تیز کرنے لگی۔

''تم اس وقت کیوں ان کے لیے چائے بنا رہی ہو؟ اس پر بھی انہیں ہمارے گھر میں بھیجے گئے دو سال کے راشن کا حساب یاد آجائے گا۔'' وہ سخت بدمزا ہو کر بولا اور موبائل نکال کر جُنید کے دوست کو دوبارہ کال ملانے لگا۔

''مہمان چاہے جیسے بھی ہو اس کی مہمانوازی کرنا فرض ہوتا ہے۔''

''ہیلو ارسل!'' جنید فون پر مصروف ہوگیا۔ ''سوری اگر میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا ہو تو۔ دراصل جُنید صبح یونیورسٹی کے لیے نکلا تھا مگر ابھی تک نہیں آیا اور تم ہی اس کے واحد قریبی دوست ہو جس کے گھر وہ آتا جاتا رہتا ہے۔ اگر تمہیں کچھ پتہ ہو تو۔۔۔''

''نہیں نمبر بھی بند ہے۔'' وہ ارسل کو بتا رہا تھا۔

''طوبیٰ! جنید! بیٹا دروازے پر دیکھو کون ہے۔'' دروازے کی گھنٹی مسلسل بجنے پر نعیمہ کی آواز آئی۔

اس سے پہلے کے طوبیٰ باہر جاتی، جنید نے اشارے سے روکا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز ''میں دیکھتا ہوں'' کہتا باہر نکل گیا۔

''ویسے برا مت ماننا نعیمہ! تمہاری اولاد شروع سے ہی کام چور ہے۔ میں نے کبھی بھی انہیں پہلی آواز پر چستی سے کام کرتے نہیں دیکھا۔''

''بچے ہیں بھائی صاحب!''

URDU TUBE
www.urdutube.com

Digitized by Google

''پچھلے دس سال سے تمہارے یہ بچے ابھی تک بچے ہی ہیں۔ انہیں اب بڑا کر بھی دو۔'' وہ طنز سے بولا۔

کچن سے نکل کر لاؤنج عبور کرنے پر جنید کے کانوں میں ماموں کی طنز بھری آواز پڑی۔

''چلو اگر تمہیں کچھ پتہ چلے تو مجھے ضرور خبر کرنا۔'' اس نے ارسل سے کہہ کر فون بند کر دیا اور دروازہ کھولا۔

''کوئی اطلاع ملی؟'' سامنے دروازے پر روئی روئی آنکھوں کے ساتھ آرزو آپا کھڑی تھی۔

''نہیں! اندر آجائیں۔'' اس نے آرزو آپا کو راستہ دیا۔

''آپ بھی اندر آجائیں عاکف بھائی۔'' اس نے آگے بڑھ کر گاڑی میں بیٹھے اپنے بہنوئی کو کہا۔

''نہیں یار! مجھے صبح آفس کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہے۔ اس لیے بہت معذرت۔ بس تمہاری آپا کو چھوڑنے آیا تھا۔ کوئی کام ہو تو فوراً کال کرنا۔'' وہ مٹھاس سے کہتے، گاڑی کو پہلے گیئر پر ڈالتے چلتے بنے۔

''ایسے موقعوں پر خود سے دوسروں کے کام آیا جاتا ہے عاکف بھائی۔'' وہ دل ہی دل میں کہتا اندر آگیا۔

لاؤنج میں آپا امی کے گلے لگی رو رہی تھی۔

''دراصل ماموں مجھے لگا کہ ممانی نے ہارون کو بھیجا ہوگا آپ کو لینے کے لیے، اس لیے آپ خود ہی دروازہ کھول لیں گے۔ ممانی سے کہاں برداشت ہوتا کہ آپ اتنی دیر یہاں رہیں۔'' وہ بے مروتی سے بولا۔

''ایسے موقعوں پر ایسی باتیں مت کرو بیٹا۔'' نعیمہ نے ٹوکا۔

''کب نکلا تھا جنید گھر سے؟'' آرزو آپا بیچ میں بولی، عزیز ماموں کو جواب دینے کا موقع نہ ملا۔

''صبح گیا تھا، یونیورسٹی کے لیے۔'' نعیمہ دکھ سے بولیں۔

''ایک اور کپ بنا دو، آپا آئی ہیں۔'' وہ کچن میں آکر بولا۔

کپ سیٹ کرتی طوبیٰ سر ہلا کر کیبنٹ سے ایک اور کپ نکالنے لگی۔

''بلکہ رکو!'' وہ کہہ کر دو قدم پیچھے ہوا اور کچن کے دروازے سے سر نکال کر لاؤنج میں جھانکا۔ ''مزید چائے نہ بناؤ۔ میرے خیال سے ماموں اب جانے ہی والے ہیں۔ پانچ منٹ بعد چائے لے کر جانا۔''

''اپنا دل اتنا تنگ نہ کریں بھائی۔'' طوبیٰ کے لہجے میں نرمی تھی۔

''دو سیال ہم پر خرچ کرنے پر ہی ان کی جیب تنگ پڑ گئی تھی، ہم آٹھ سال میں اپنا دل بھی تنگ نہ کریں؟'' وہ بلاوجہ تلخ ہوا۔

''شہید کے لیے دعا کریں کہ وہ خیر خیریت سے مل جائے۔'' وہ نظر انداز کر کے بولی کیونکہ جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے نکال کر دیکھا تو عروج کی کال تھی۔ وہ کال ریسیو کرتا اپنے کمرے میں آگیا۔

''پریشان مت ہوں۔ انشاء اللہ مل جائے گا وہ۔'' وہ دوسری طرف سے بولی۔

''انشاء اللہ!'' وہ گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''صبح بھائی بھابھی تمہاری طرف آنا چاہتے ہیں۔'' اس نے اطلاع دی۔

''کس لیے؟'' وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا۔

''تسلی دینے کے لیے۔''

''ضرورت نہیں ہے۔''

Digitized by Google

''آر یو شیور؟''

''ہاں یار! ہمارے بیچ فارمیلٹی کا رشتہ ہے ہی کب۔ میں صبح ویسے ہی تھانے جاؤں گا رپورٹ لکھوانے۔''

''کل؟ تھوڑا انتظار کرلیں، ہوسکتا ہے وہ واپس آجائے۔''

''وہ زندگی میں آج تک ایسے غائب نہیں ہوا۔ اس نے آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔ میں اس کے ملنے کے انتظار میں یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ سکتا۔'' اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ اگر وہ مرد نہ ہوتا تو یقیناً آپا اور طوبیٰ کی طرح بہت سے آنسو بہا چکا ہوتا۔

''وہ مل جائے گا بہت جلد۔''

''دعا کرنا پلیز۔'' اس نے کہہ کر فون بند کردیا۔

☆.....☆.....☆

صبح دس بجے ہی وہ تھانے پہنچ گیا تھا، اس کے ساتھ ارسل بھی تھا۔ اکھڑے اکھڑے پینٹ والا تھانے کا وہ کمرہ صاف ستھرا اور بہتر حالت میں تھا۔ جنید ٹیبل کے سامنے بیٹھے حوالدار کی جانب آیا۔

''مجھے گمشدگی کی ایف آئی آر لکھوانی ہے۔''

'صبر شہزادے، نہ سلام نہ خیریت۔ کیا سینما سے آیا ہے جو یوں ہیرو والی اینٹری مار رہا ہے؟'' حوالدار نے کہہ کر خود ہی قہقہہ لگایا۔ پیچھے دراز سے فائل نکالتے سپاہی نے قہقہہ میں ساتھ دیا۔

جنید نے انہیں گھورا۔

''سوری۔ ہم پریشان ہیں اس لیے سلام وغیرہ کا دھیان نہیں رہا۔'' جنید کے تیور دیکھتے ہوئے ارسل فوراً بولا۔

''چل بیٹھ جاؤ آرام سے، نہ مجھے جلدی ہے نہ تمہیں۔'' حوالدار نے سامنے پڑی کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔ ''بتاؤ کس کے لیے لکھوانی ہے۔''

''میرے چھوٹے بھائی کے لیے۔ اکیس سال کا ہے، یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ اس کا اب آخری سیمسٹر ہے۔'' وہ لوگ بیٹھ گئے۔

''ہوں۔ کب سے غائب ہے؟'' حوالدار اب کچھ سنجیدہ لگ رہا تھا۔

''کل صبح سے۔ یونیورسٹی کے لیے گھر سے نکلا تھا، مگر وہاں بھی نہیں پہنچا۔''

''نشے، لڑکی یا جوے وغیرہ میں ملوث تھا وہ؟''

''نہیں!''

''کبھی ایسے گھر سے گیا ہے وہ، گھر والوں سے ناراض ہو کر؟ بھئی آج کل کے لونڈے تو یوں ہی ماں باپ کی توجہ لینے کے لیے غائب ہوجاتے ہیں۔'' اس نے پھر کہہ کر قہقہہ لگایا۔

''نہیں وہ ایسا نہیں ہے۔'' وہ ضبط سے بولا۔

''گمشدگی سے چند دن پہلے اس نے کسی رقم وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا گھر میں؟''

''نہیں۔ وہ ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ اس کے پاس اپنے پیسے وافر مقدار میں ہوتے تھے۔ آپ رپورٹ لکھیں پہلے۔''

''بات سن لونڈے۔ میں نے دو باتیں تم سے ہنس کر کرلی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم میرے اوپر چڑھائی کرو۔ مجھے نہ بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ پہلے تفتیش پوری ہونے دو۔ ہاں تو بتاؤ کوئی بڑی رقم کی ضرورت پڑی ہوا سے؟ گھر والوں سے کوئی جھگڑا ہوا تھا کیا؟''

اس سے پہلے کہ جنید ان پر برہم ہوتا، ارسل نے اس کی کہنی پر ہاتھ رکھ کر اس کے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا لڑکا تھا، جھگڑ اوغیرہ والی فطرت نہیں تھی، نہ گھر والوں سے کوئی مسئلہ تھا۔ اس کا یوں غائب ہونا ہمیں پریشان کررہا

Digitized by Google

ہے۔''

ارسل نے جواب دیا۔

''رابطہ کیا اس نے؟''

''اگر رابطہ ہوجاتا تو آپکے پاس کیوں آتے۔'' جنید نے چڑ کر کہا۔

''اپنا لہجہ ٹھیک رکھ کر بات کرو ورنہ اس سامنے پڑی جیل میں ڈالنے میں مجھے دو منٹ بھی نہیں لگیں گے۔'' حوالدار کی آواز اونچی ہوگئی۔

''تو آپ سوال تو بے تکے نہ کریں۔'' جنید بھی بناڈرے بولا۔

''کیا تو ہمیں بتائے گا کہ کیا سوال کریں تفتیش میں؟'' اس کا انداز کڑک ہوگیا۔

''کیا ہوگیا رحیم؟'' باہر کا دروازہ کھلا اور پولیس کی وردی میں ایک جوان اندر آیا۔ حوالدار اور سپاہی نے مستعدی اسے سلوٹ کیا۔

جنید اور ارسل نے ساتھ نظر اٹھا کر اس کے یونیفارم پر لگے بیج کو دیکھا ''ایس ایچ او کامران۔''

''سر یہ دونوں رپورٹ لکھوانے آئیں ہیں اپنے بھائی کی مگر شاید تمیز گھر رکھ کر آگئے ہیں۔'' حوالدار نے انہیں گھور کر کہا۔

''میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا ہے رحیم کہ لوگ چاہے جیسے بھی ہوں، تمہیں اپنا انداز صحیح رکھنا ہے کیونکہ عوام کی خدمت ہمارا فرض ہے۔''

''میں اس کی طرف سے آپ دونوں سے معذرت کرتا ہوں۔ حوالدار رحیم دل کے برے نہیں ہیں، بس کڑک انداز ان کی فطرت ہے۔'' ایس ایچ او کامران نے نرم خو لہجے میں کہا۔

جنید کے ماتھے پر سلوٹیں معدوم ہوگئیں۔

''کوئی بات نہیں سر۔''

''میں آپ لوگوں کی رپورٹ لکھوا دیتا ہوں، آج کل نوجوانوں کو اغوا کرنے کا گروہ بہت سرگرم ہے۔ اور یہ کیس مہینہ کا۔۔۔۔'' وہ سوچنے کے لیے ایک دم چپ ہوا۔

''تیسرا کیس ہے سر۔'' حوالدار نے لقمہ دیا۔

''ہاں! تھینک یو رحیم! اب یہ تیسرا کیس ہے۔ اور اتنی کوشش کے باوجود بھی ہم ان کا کوئی سراغ نہیں لگا پائے ہیں۔''

''تو آپ کو کوئی انفارمیشن بھی نہیں ملی ان اغوا کاروں کے بارے میں؟'' جنید نے پوچھا۔

''ہاں بس یہی پتہ چلا ہے کہ وہ لوگ اغوا کر کے لوگوں کو اسمگل کر دیتے ہیں۔''

جنید کی سانس اٹکی۔

''اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں پتہ چل سکا، یہ بھی نہیں کہ ابھی جو اغوا ہوئے ہیں وہ اسی گروہ نے کیے ہیں یا نہیں اور یہ بھی کہ انہیں اسمگل کر دیا ہے یا نہیں۔''

''خدا ٹھیک ہوگا، مل جائے گا۔'' جنید یوں بولا جیسے انہیں بتانے سے زیادہ وہ خود کو تسلی دے رہا ہو۔

''ہاں آپ لوگ بے فکر ہوجائیں۔ ہم پوری چھان بین کریں گے۔ آپ یہ کارڈ رکھیں، یہ میرے دوست ہیں، بہت اچھے سراغ رساں ہیں۔ آپ ان سے رابطہ کرلیں، یہ آپکی مدد کریں گے۔''

''شکریہ۔'' جنید نے کارڈ لیا اور وہ لوگ رپورٹ لکھوا کر باہر آگئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر جنید نے پہلا کام اس سراغ رساں سے رابطہ کیا۔ ایس ایچ او کی باتوں نے اس کی فکر اور پریشانی میں حد درجہ اضافہ کر دیا تھا۔ شاید یہ سراغ رساں کسی مشکل میں کام آسکے۔ اس کے دل میں امید جاگی۔ اس نے نمبر ڈائل کیا۔

''آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔''

''یار!''

ارسل نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب

Digitized by Google

دیکھا۔

''نمبر بند ہے۔'' کہہ کر اس نے دوسرا لینڈ لائن نمبر ڈائل کیا۔ چوتھی بیل پر کال اٹھالی گئی۔

''السلام علیکم! سلیم امجد کا گھر یہی ہے؟''

''جی!'' سندھی لہجے میں بولتا آدمی شاید وہ کوئی نوکر تھا۔

''سلیم سر سے بات کروا دیجیے۔''

''وہ تو شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ایک مہینے بعد آئیں گے۔''

''اچھا!'' اس کی امید موہوم ہوئی۔ ''کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے ان کا۔''

''جی سر۔ مگر آپ کو کیا کام ہے؟''

''مجھے ایک گمشدگی کے کیس کے سلسلے میں ان کی مدد چاہیے۔''

''سوری سر! وہ آج کل ایک کیس کے سلسلے میں مصروف ہیں۔ اور ایک کیس کے ختم ہونے سے پہلے وہ دوسرا کیس نہیں لیتے۔ آپ اپنا نام اور نمبر نوٹ کروا دیں۔''

جنید کی ساری امید ہی ٹوٹ گئی۔ اس نے سب نوٹ کروا کر فون بند کر دیا۔

''آپ فرنٹ سیٹ پر آجائیں جنید بھائی۔ میں ڈرائیو کر لیتا ہوں۔'' اس کی حالت دیکھ کر ارسل بولا۔

جنید سر ہلا کر گاڑی سے اترا اور دوسری طرف آکر بیٹھ گیا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ گھر والوں کو تسلی دینے کے لیے ذہن میں لفظوں کے تانے بنے لگا۔

☆.....☆.....☆

''حُنید کے دوستوں میں اور کون کون ہے؟'' جنید نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے گھر جانے سے پہلے ایک ڈھابے پر گاڑی رکوالی۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ پہلے یونیورسٹی جا کر حُنید کے دوستوں اور یونیورسٹی والوں سے حُنید کے متعلق بات کرے۔

''زیادہ نہیں ہے۔ کلاس کے دو تین لڑکے ہیں، سعد، اسلم، ولید، عسرہ اور۔۔۔'' وہ بولتے بولتے اٹکا۔

''اور کون؟''

''اور بریزہ بھی۔''

☆.....☆.....☆

وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا یونیورسٹی گراونڈ میں تیسری بار داخل ہوا۔ آج اس کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔ کلاس شروع ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ مگر اسے نہ تو کلاس مل رہی تھی نہ ہی اپنا ڈپارٹمنٹ۔ امی کی صبح جلدی اٹھنے کی اور جلدی یونیورسٹی پہنچنے کی ساری ہدایتیں اس کے دماغ میں گھوم رہی تھی۔ مگر وہ اولاد ہی کیا جو ماں کی بات کو خاطر میں لائے۔ سو اب پچھتاوے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اتنی دیر سے چلتے چلتے اس کی سانس بہت تیز چل رہی تھی، اور ماتھے پر پسینے کے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔

گراونڈ میں بہت فاصلے پر چند ہی اسٹوڈنٹ تھے جب اسے سامنے سے ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ موبائل میں گم، جینز پر ڈیزائنر شارٹ کرتی، برائے نام آستین اور دوپٹہ ندارد۔ اس نے ناگواری سے اس لڑکی کو دیکھا مگر سامنے موجود سیڑھیاں اترتا آگے بڑھا۔

''آپ کو پتہ ہے کہ بی بی اے کا ڈپارٹمنٹ کدھر ہے؟''

اس لڑکی نے موبائل سے نظریں ہٹا کر اس صاف رنگت اور ڈارک براؤن آنکھوں والے لڑکے کو بغور دیکھا۔

Digitized by Google

''ہاں بس وہ سامنے ہے۔ پارکنگ کے بالکل برابر میں۔'' وہ سکون سے بولی۔

''کیا؟'' وہ تقریباً چلایا۔ ''پارکنگ کے برابر میں؟ میں صبح سے اب تک درجن بھر اسٹوڈنٹ سے ڈپارٹمنٹ کا پوچھ چکا ہوں اور سب نے مجھے یونیورسٹی کے کونے کونے میں بھیج دیا مگر وہاں کا کسی نے نہیں بولا۔''

''آپ فریشر ہیں تو سب آپ کے ساتھ ریگنگ کررہے ہیں۔'' وہ مسکرا کر اپنے سکون بھرے انداز میں بولی۔

''یہ اچھا مذاق نکالا ہے لوگوں نے، اچھے خاصے بندے کو خوار کروانے کا۔'' وہ چڑ کر کہتا پیچھے موجود سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا اور پانی کی بوتل نکال کر پینے لگا۔

''اوہ! السلام علیکم! میرا نام حُنید ہے۔'' وہ یکدم پانی پیتے پیتے بولا۔

''میرا نام بریزہ ہے۔'' اس نے اپنے کھلے سلکی بالوں کی لٹوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''بریزہ مطلب؟'' اس نے بوتل کا ڈھکن لگایا۔

''بریزہ مطلب اللہ کا تحفہ۔ میں اپنے مام ڈیڈ کی شادی کے آٹھ سال بعد ہوئی تھی اور پورے گھر کے لیے تحفہ کی طرح تھی اس لیے انہوں نے میرا نام بریزہ رکھ دیا۔'' اس نے اپنے پرس کو ایک کہنی سے دوسری کہنی پر منتقل کیا۔

''اور میرا نام سہیلی حُنید ہے۔ اور یہ میرے ماں باپ نے اس لیے رکھا کیوں کہ یہ میرے بھائی کے نام جنید کے ساتھ میچ ہوسکے۔'' وہ ہنسا۔ ''چلیں میں چلتا ہوں، ویسے ہی کلاس کا ٹائم ختم ہی ہونے والا ہے۔'' وہ واپس کھڑا ہوکر جانے لگا۔

''کلاس نہیں ہوگی، سر آج نہیں آئے۔'' وہ پیچھے سے بولی۔

وہ تحیر سا اسے دیکھنے لگا۔

''میں بھی بی بی اے کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ آج میرا بھی پہلا دن ہے۔''

اس کے ہونٹ ''اوہ'' کے انداز میں گول ہوگئے، وہ رک گیا۔ ''چلیں اچھا ہے آپ نے بتادیا۔ ورنہ جتنا میں آج چلا ہوں، میری تو ٹانگوں میں درد ہوگیا ہے اب۔''

وہ ہنسی۔ ''اگلے سال تک تم خود ایسے ہی فریشرز کی ٹانگوں میں درد کروا رہے ہوگے۔''

''دیکھتے ہیں۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''خیر نائس ٹو میٹ یو۔'' بریزہ نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

حُنید نے دوسکینڈ اس کے بڑھے ہاتھ کو دیکھا۔

''سیم ہیئر۔'' اس نے مسکرا کر جیب میں ہاتھ ڈالے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ضروری نہیں کہ انسان تعلیم کے نام پر اپنی اقدار کو فراموش کردے۔

بریزہ بنا برا منائے آگے چلی گئی۔ مگر جاتے جاتے اس نے پلٹ کر ایک بار حُنید کو دیکھا ضرور تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ لوگ یونیورسٹی کی پارکنگ سے نکل کر یونیورسٹی گراؤنڈ میں داخل ہورہے تھے جب ارسل بولا۔

''ڈپارٹمنٹ اس طرف ہے جنید بھائی۔''

وہ ڈپارٹمنٹ میں آئے تو سامنے سے ہی بریزہ آتی دکھائی دی۔ وہ جنید کے برابر سے گزر رہی تھی مگر ارسل کو دیکھ کر رک گئی۔

''ارسل سنو۔'' وہ بے تابی سے اس کی جانب بڑھی۔

جنید رکا اور پلٹ کر پیچھے آتے ارسل اور اس نازک اور حسین لڑکی کو دیکھا۔

''کہاں ہو تم؟ جنید کدھر ہے؟ میں کل سے اسے کال کر رہی ہوں کوئی رسپانس ہی نہیں ہے۔ تم بھی میرا فون نہیں اٹھا رہے۔ اب کونسی نئی بات پر ناراض ہے وہ؟ اور تمہیں بھی ساتھ ملا لیا۔ میں اب کی دفعہ۔۔۔۔'' وہ نان اسٹاپ بول رہی تھی۔

''بریزہ! بریزہ! بات سنو۔۔'' وہ گھبرا کر کبھی جنید کو دیکھتا تو کبھی بریزہ کو۔

''خنید کل صبح سے لاپتہ ہے۔ وہ گھر نہیں آیا نہ یونیورسٹی۔ اس کے گھر والے پریشان ہیں۔ اور یہ اس کے بھائی ہیں جنید۔'' اس نے جنید کی طرف اشارہ کیا مگر بریزہ نے پلٹ کر جنید کو نہ دیکھا۔ وہ تو آنکھیں پھاڑ کر ارسل کو دیکھ رہی تھی۔ جو اس نے سنا تھا اس پر دماغ یقین نہیں کر رہا تھا، یا شاید دل۔

''تم فکر نہ کرو، وہ مل جائے گا۔ ہم بس پوچھنا چاہتے تھے کہ تمہاری اس سے آخری بات کب ہوئی تھی؟'' ارسل اس سے نرم آواز میں بولا۔

''پتہ نہیں۔۔ شاید پرسوں۔۔ مگر زیادہ نہیں ہوئی تھی۔'' وہ ٹوٹے الفاظ اور لہجے میں بولی۔

''تقریباً کتنے بجے اور کتنی۔۔'' جنید نے ارسل کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ارسل سوال پوچھتے پوچھتے رکا۔

''ٹھیک ہے ابھی زیادہ سوال نہ کرو اس سے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ شاید وہ اس کی حالت اور جذبات سمجھ گیا تھا۔

''پانی پینا ہے مجھے۔'' بریزہ کی بوجھل سی آواز آئی۔

وہ تینوں اکٹھے کینٹین چلے گئے۔

''آپ کچھ لیں گے جنید بھائی؟'' ارسل پیسے نکالتے ہوئے بولا۔

جنید نے نفی میں گردن ہلا دی مگر پھر بھی اس نے اس کے لیے چائے اور بسکٹ منگوا لیے۔

''آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔'' اس نے کہہ کر ٹیبل پر چائے رکھی تو جنید چپ چاپ بیٹھ گیا کیونکہ اتنا تو وہ سمجھ چکا تھا کہ پریشانی میں کھانا پینا تیاگ کر کے وہ مشکلوں کو کم کرنے کے بجائے بڑھا ہی سکتا تھا۔

ساتھ بیٹھی بریزہ پانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔ ارسل بھی ساتھ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہاں کینٹین میں بہت شور اور رش تھا مگر وہ تینوں اس شور اور ہنگامے سے دور اپنے اپنے جذبات کو قابو کرنے میں مگن تھے۔

''ارے ابراہیم! یہ جیولٹ اپنے رومیو کے بغیر ہی بیٹھی ہے؟'' کسی لڑکے کی دور سے ہلکی سی آواز صرف ارسل کے کان میں پڑی تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''چلیں جنید بھائی بہت دیر ہوگئی ہے۔'' وہ یکدم ہی اٹھ گیا۔

جنید نے حیرت سے اسے دیکھا، انہیں بیٹھے ہوئے بہ مشکل دو منٹ ہی ہوئے تھے۔

''چلو بریزہ تم بھی گھر جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' وہ سر ہلا کر اٹھ گئی۔

وہ لوگ اٹھ کر باہر آ گئے۔ سب سے آگے تیز تیز سے چلتے ہوئے ارسل نے دو تین بار پلٹ کینٹین میں کھڑے ابراہیم کو دیکھا تھا۔

''بریزہ خنید کی صرف دوست نہیں ہے۔'' اپنی سوچوں میں گم جنید بولا۔

ارسل نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ سوال تھا یا تبصرہ، وہ سمجھ نہیں سکا۔

☆.....☆.....☆

''السلام علیکم!'' خنید اگلے دن اسے کلاس میں

Digitized by Google

بیٹھا دیکھ کر بولا۔

بریزہ نے موبائل سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

''اوہ ہائے حنید۔'' وہ خوشگوار سے لہجے میں بولی۔

''حنید نہیں۔ حُنید!'' اس نے فوراً تصحیح کی۔

''ہاں وہی!'' وہ لاپرواہی سے بولی۔

اسی وقت ایک لڑکی ہانپتی کانپتی آئی اور حُنید کے برابر سے گزرتی دھپ کر کے بریزہ کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھی۔

''یار جلدی جلدی کرنے کے باوجود بھی میں اتنا لیٹ ہوں۔ میں یہی دعا کرتی آرہی تھی کہ کلاس نہ شروع ہوئی ہو۔ پتہ نہیں یہاں کے ٹیچرز کلاس شروع ہونے کے بعد اندر آنے دیتے ہیں یا نہیں؟ ویسے ابھی تو تمہیں بھی نہیں پتہ ہوگا۔ خیر آہستہ آہستہ دیکھ لیں گے کہ کیا۔۔۔'' وہ لڑکی بُلٹ ٹرین سے بھی زیادہ رفتار سے بول رہی تھی۔

حُنید نے اپنا آپ وہاں غیر ضروری سمجھا اور پیچھے کی سیٹ کی جانب چلا گیا۔ بریزہ نے اسے جاتے دیکھا اور پھر اپنے ساتھ بیٹھی لڑکی عسرہ کو دیکھا جس کی ٹرین ابھی بھی چل رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ارسل یونیورسٹی کی پارکنگ میں بائیک پر بیٹھا حُنید کا منتظر تھا جب برابر میں پراڈو میں بیٹھتی ہوئی لڑکی پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے حسرت یا شاید آس سے اس ایئر کنڈیشن گاڑی کا دیکھا اور اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کیا۔ گرمی آج تھوڑی زیادہ تھی، اسلیے شیڈ کے نیچے کھڑے رہنے کے باوجود بھی اسے پسینے آرہے تھے۔ پراڈو کا طواف کرتی اس کی نظروں کی توجہ اس وقت بھٹکی جب اس کی نظر گاڑی کے پاس گری فائل پر پڑی۔

اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر فائل اٹھائی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھے آدمی کے شیشے کے سامنے فائل لہرائی۔

اس کے آدمی کے اترنے سے پہلے ہی پچھلی سیٹ پر وہ بیٹھی لڑکی اتر کر آئی۔

''اوہ تھینک یو۔ یہ میری ہی ہے۔ سوری مجھ سے گر گئی تھی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ کہہ کر واپس بائیک کے پاس آگیا۔

''سوری یار دیر ہوگئی۔ اتنی مشکلوں سے سر کی منتیں ترلے کر کے دیا ہے تیرا اسائنمنٹ۔'' حُنید تیز تیز چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔

گاڑی میں بیٹھتی لڑکی حُنید کی آواز سن کر پلٹی۔

''شکر ہوگیا۔ اتنی دیر سے گرمی میں سڑ رہا تھا میں۔ چل بائیک نکال لے اپنی۔''

''یہ تمہارا دوست ہے ہادی؟'' اس کی آواز پر وہ دونوں پلٹے۔

''بریزہ تم! ہاں یہ میرا دوست ہے ارسل۔ ارسل یہ بریزہ۔ میری کلاس فیلو ہے۔'' اس نے دونوں کا تعارف کروایا۔

''ہادی؟'' ارسل ٹھٹکا۔

''ہاں ایکچولی مجھ سے حُنید کا نام صحیح پرونا ؤنس نہیں ہوتا اس لیے مجھے ہادی ٹھیک لگا۔''

ارسل کے لب اوہ انداز میں گول ہوگئے۔

''یہ ہماری کلاس میں نہیں ہے؟ میں نے اسے آج پہلی دفعہ دیکھا ہے۔'' بریزہ نے حُنید کی طرف دیکھا۔

''میں ٹیلی کام ڈپارٹمنٹ میں ہوں۔'' وہ مسکرا کر کہتا واپس بائیک کی طرف پلٹ گیا۔

''اچھا!'' بریزہ ان لوگوں کو جاتا دیکھ کر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

تیزی سے بائیک بھگاتے ارسل کا چہرہ سپاٹ

URDU TUBE

Digitized by

تھا۔

☆.....☆.....☆

جنید اور ارسل گھر پہنچے تو حسب توقع سب ان کے انتظار میں تھے بلکہ ان کے بجائے حُنید کے انتظار میں تھے۔

جنید تھکے تھکے قدموں سے چلتا نعیمہ کے برابر میں آن بیٹھا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔ سوال پوچھنے کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ جو وہ پوچھنا چاہتے تھے اس کا جواب ان دونوں کے چہروں پر رقم تھا۔ وہ تکلیف دہ خاموش ماحول قائم رہتا اگر نعیمہ کی سسکیوں کی آواز نہ گونجتی۔

''امی!'' جنید نے بے بسی بھرے انداز میں ان کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔ ''ہم کوشش تو کر رہے ہیں نا۔''

''کیا اس کی بائیک بھی کہیں نہیں ملی؟'' آرزو آپا نے پوچھا۔

''نہیں ہم نے پورے راستے ڈھونڈا اگر کہیں نہیں ملی۔''

''اگر ہوتی بھی تو اب تک کوئی چورا چکا لے جا چکا ہوگا۔'' ارسل سر جھکائے بولا۔

آرزو آپا نے متفق ہو کر سر ہلایا۔

''صبر کریں آنٹی۔'' ارسل نے انہیں تسلی دینی چاہی۔

''کیسے صبر کروں! مرے ہوئے پر تو صبر آجاتا ہے مگر اپنے زندہ اور گمشدہ بیٹے کے لیے صبر کا حوصلہ کہاں سے لاؤں؟'' ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں تھا۔

جنید کی آنکھوں میں نمی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ تکلیف دہ خاموش ماحول پھر سے قائم ہو چکا تھا مگر اس میں اب نعیمہ کی سسکیاں بھی شامل تھیں۔

☆.....☆.....☆

''چل دے بھی دے یار۔ تیرا تو بنا ہوا ہے اسائنمنٹ۔ اب کونسی کہانیاں لکھ رہا ہے۔'' سعد نے جھپٹ کر ولید کا اسائنمنٹ لیا۔

ولید ''ارے ارے'' ہی کرتا رہ گیا۔

سورج کی بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی نے آج موسم خوش گوار بنا دیا تھا اس لیے لائبریری میں اے سی کے اندر بیٹھنے کے بجائے ان لوگوں نے یونیورسٹی کے گارڈن میں بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔

''اتنی جلدی کیسے بناؤ گے تم؟ میں نے کل پورا دن بیٹھ کر بنایا ہے اسائنمنٹ اور ابھی آدھے گھنٹے بعد ہی کلاس ہے۔'' عسرہ نے فکر سے اپنا چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں تو تمہاری اسی محنت کا مجھے فائدہ ہوا ہے نا۔ بنا بنایا اسائنمنٹ مل گیا، بس چھاپنا ہے۔'' وہ ہنس کر کہتا پیپرز پر جھک گیا۔

''اور اگر تم رات میں جلدی سونے کے بجائے ای میل کر دیتی تھی تو ہمیں یہ چھاپنے کی محنت بھی نہ کرنی پڑتی، ڈائریکٹ پرنٹ نکال کر لاتے،'' اسلم نے لقمہ دیا۔

''ارے تو تم لوگ لکھنے میں اتنی محنت کیوں کر رہے ہو، مت دینا اسائنمنٹ، پیپر بھی مت دینا۔ فیل ہو کر یونی چھوڑ دو اور گھر بیٹھو مزے سے۔'' عسرہ نے طنز کا تیر چلایا۔

''آئیڈیا اچھا ہے۔'' ان تینوں میں سے کوئی بھی شرمندہ نظر نہیں آرہا تھا۔

بریزہ ان لوگوں کی باتوں پر مسکراتی اپنے ہینڈ بیگ میں سے موبائل نکالنے لگی۔ وہ آج پنک کلر کی کرتی اور بلیک ٹراؤزر میں تھی، اپنے سلکی بالوں کی اس نے پونی بنائی ہوئی تھی۔

''آ گیا!''

موبائل پر میسج ٹائپ کرتا بریزہ کا ہاتھ ٹھہرا اور

Digitized by Google

اس نے سر اٹھا کر نیوی بلیوی شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس حُنید کو دیکھا۔

''مجھے ہی میسج کر رہی تھی نا، جیسے ہمیشہ کرتی ہو اگر مجھے دیر ہو جائے پہنچنے میں۔'' وہ مسکرا کر اس کے برابر میں گھاس پر بیٹھا۔

''دوستوں میں سے کوئی بھی لیٹ ہو جائے تو میں اسے میسج کرتی ہوں ہادی۔'' اپنا دوپٹہ کاندھوں پر مزید پھیلاتی بریزہ مخل سی بولی۔

''تو یہ فکر خاص صرف میرے لیے نہیں ہے؟'' وہ بظاہر شرارت سے بولا مگر آنکھوں میں چھپی محبت پوشیدہ نہیں تھی۔

''ہوسکتا ہے کہ تمہاری یہ خوش فہمی کبھی خوش قسمتی میں بدل جائے۔'' بریزہ نے اس کی ڈراک براؤن آنکھوں کو دیکھا جو دن کی روشنی میں ہمیشہ زیادہ واضح ہوا کرتی تھیں۔

''چلیں اب، کلاس شروع ہونے والی ہے۔'' سعد کہہ کر اٹھا کھڑا ہوا، باقی سب نے بھی اس کی تقلید کی۔

''یار کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اسائنمنٹ کی ڈیٹ آگے بڑھ جائے۔ میرا پورا نہیں ہوا۔'' ولید نے اپنے خاص ٹینشن بھرے لہجے میں کہا۔

''ابے کتابی کیڑے اسائنمنٹ تو تیرا بنا ہوا تھا، عسرہ والے میں سے بھی پتہ نہیں کونسی کہانیاں دیکھ کر لکھی، اب بس بھی کردے۔'' سعد باقاعدہ چڑ گیا۔

''سر نہیں آئے آج، اسائنمنٹ کل لیں گے۔ میسج فرام زینب۔'' عسرہ نے موبائل دیکھتے ہوئے نیوز نشر کی۔

''اللہ تیرا شکر!''

''ابے یار۔''

ولید اور سعد کی مختلف آوازیں گونجیں۔

''ولید تو بڑا نیک بندہ ثابت ہوا ہے، فوراً دعا قبول ہوئی ہے اس کی۔'' اسلم دھپ کر کے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ابے ہاں! چل جلدی سے دعا کر میرے لیے کہ ٹانیہ سیٹ ہو جائے، ایک مہینہ ہو گیا کوشش کرتے ہوئے۔'' سعد حسرت سے بولا۔

''ایسی ناجائز دعائیں قبول نہیں ہوتی۔'' ولید نے گردن اکڑائی۔

''میں آتی ہوں۔ سر عبید کے پاس کام ہے۔'' بریزہ کہتی اٹھ گئی۔

''میں بھی ساتھ چلتی ہوں، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کینٹین سے کچھ لوں گی۔'' عسرہ بھی ساتھ اٹھ گئی۔

''بریزہ! ایک بات پوچھوں؟'' چلتے چلتے عسرہ جھجک کر بولی۔

''کیا؟ مجھ سے بات کر رہی ہو؟ اتنی فارملی؟'' وہ یکدم ہنسی۔

''یار اچھا بتاؤ کہ تمہاری ڈریسنگ چینج ہو گئی ہے اب؟ کیوں؟''

''کیا مطلب؟ وہی تو پہنتی ہوں۔'' وہ الجھی۔

''نہیں مطلب یہ دوپٹہ وغیرہ۔۔'' وہ اٹک کر بولی۔

''ہاں کیونکہ مجھے اس چیز کا اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ ہمارا لباس ہی ہوتا ہے جو ہمیں دوسروں کی نظر میں احترام کے قابل بناتا ہے، کھلے ڈلے لباس کی وجہ سے مردوں کی نظروں میں احترام قائم نہیں رہتا پھر ہم کمپلین کرتے ہیں کہ مرد ہمیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ عبایا یا حجاب کرو، کچھ لوگ مجھ جیسے ہوتے ہیں جن کو یہ مشکل لگتا ہے۔ اس لیے بہتر کہ ڈریسنگ ہی کمپلیٹ کرلو۔ پوری آستین، پورا گلا اور دوپٹہ۔ یہ اتنا مشکل تو نہیں ہے۔'' وہ رسان سے بولی۔

Digitized by Google

''تم نے تو پورا درس ہی دے دیا۔ خیر اب یہ تو نہیں ہے کہ ان مردوں کی وجہ سے ہم اپنی مرضی کی ڈریسنگ ہی نہ کریں۔'' وہ قائل نظر نہیں آرہی تھی۔

بریزہ چپ چاپ چلنے لگی، نظریات بدلنے میں وقت لگتا ہے۔

☆.....☆.....☆

''کیسی ہو بریزہ؟'' وہ اپنا ہینڈ بیگ کہنی پر ڈالے سڑھیاں چڑھتی جارہی تھی جب اس نے پیچھے مردانہ آواز سنی، وہ پلٹی تو سامنے ایک خوبصورت اور ہینڈسم لڑکا کھڑا تھا، اگر وہ اس لڑکے کی فطرت سے واقف نہ ہوتی تو یقیناً دوسروں کی طرح اس کی مردانہ وجاہت کی شیدائی ہوتی۔

''ٹھیک ہوں ابراہیم۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''ویسے عجیب بات ہی کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے تم نظر ہی نہیں آتی، ہاں اب تمہیں اس پٹدل کلاس حُنید سے فرصت ملتی ہی کب ہے۔'' وہ تمسخر سے بول رہا تھا۔

اس کے منہ سے حُنید کا نام سن کر وہ چونکی نہیں تھی۔

''لوگ تو بلندی کی طرف جاتے ہیں، اور تم پستی کی طرف جارہی ہو۔''

''یہ تو تمہارے ذہن کی پستی ہے کہ تم لوگوں کو پیسے کے پیمانے پر تولتے ہو۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''پیسہ دنیا کی حقیقت ہے۔''

''ہاں اور پیسوں کی ہوس میں دوسروں کے مال پر قبضہ جمانا بھی اسی دنیا ہی کی حقیقت ہے۔'' اس نے سینے پر بازو لپیٹے کہا۔

''یہ سب میرا حق ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''ایک کمرے کا گھر میں ہی رہتے تھے نا تم اور تمہارے ڈیڈ؟ کسی بدبودار علاقے میں؟ کیسا لگتا ہوگا تمہیں اب اچانک سے اتنا سارا پیسہ اور اتنا ساری آسائشیں۔ میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری اس ذہنی بیماری کو کہ یہ سب دیکھنے کے بعد تمہاری نیت خراب ہونا۔ آفٹر آل لوئر کلاس لوگوں کا یہی۔۔۔''

''تم۔۔'' اس نے درشتی سے بریزہ کا بازو پکڑا۔

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی حُنید نے بیچ میں آکر جھٹکے سے بریزہ کا بازو چھڑایا۔

''ہمت کیسے ہوئی تمہاری اسے ہاتھ لگانے کی؟ ہاں؟'' حُنید نے ایک مکا اس کے منہ پر جڑا۔

''ہادی نہیں!'' حُنید کے اس غیر متوقع ردعمل پر بریزہ بے ساختہ چیخی۔

''چھوڑو۔'' ابراہیم نے غصے سے بے قابو ہوتے حنید کو دھکا دیا۔

حنید پیچھے دیوار سے جا ٹکرایا اس نے فوراً سنبھل کر سیدھا ہونا چاہا مگر ہاتھ میں تکلیف کی ایک لہر دوڑی، اس نے جھک کر دیکھا تو اس کی کہنی دیوار سے ابھری کسی کیل میں گھس چکی تھی۔ اس نے بنا پروا کیے کہنی کو کھینچ کر کیل سے نکالا، خون ایک فوارے کی صورت نکل کر بہنے لگا۔

بریزہ سمیت وہاں کھڑی ایک دو لڑکیوں کے منہ سے چیخ سی نکلی۔ اردگرد اسٹوڈنٹ جمع ہو کر دیکھنے لگے اور ایک دو بیچ بچاؤ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔

حُنید کے مارنے سے پہلے ہی ابراہیم نے مکا اس کا منہ پر لگایا۔ سب کے کھینچنے کے باوجود بھی حُنید نے پلٹ کر مارنا چاہا۔

''اگر تمہارے نزدیک میری بات کی ذرا بھی اہمیت ہے تو خدا کے لیے رک جاؤ، حُنید!'' بریزہ چلائی۔ ہوا میں اٹھا حُنید کا ہاتھ ساکت سا ہو گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ابراہیم کو چھوڑا۔ بریزہ تیزی سے

Digitized by

آگے آئی اور لپک کر حُنید کو ہاتھ سے پکڑ کر وہاں سے تقریباً کھینچتے ہوئے لے گئی۔

☆.....☆.....☆

''امی! ناشتہ بن گیا؟'' جنید جلدی جلدی شرٹ کے بٹن لگاتا کمرے سے باہر آیا۔

اس سے پہلے کہ کوئی اس کی بات کا جواب دیتا، اس کا فون گنگنایا۔ نمبر انجان تھا مگر اس نے اٹھالیا۔

''آپ حُنید امین کے بھائی جنید بات کر رہے ہیں؟'' دوری طرف کوئی انجان لڑکی تھی۔

''جی؟ آپ کون؟'' وہ ٹھٹکا۔

''میں سلیم انڈ کمپنی سے بات کر رہی ہوں، مسٹر حُنید کو کل انٹرویو کے لیے گیارہ بجے آنا تھا مگر وہ نہیں آئے۔ کیا وہ اس جاب کے لیے انٹرسٹڈ نہیں ہیں؟'' وہ پروفیشنل انداز میں پوچھ رہی تھی۔

حُنید کی جاب؟ میں اس بارے میں کیوں نہیں جانتا تھا۔ شاید وہ ہم سب کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں دکھ سا بھر گیا۔

''سوری وہ نہیں آسکے گا۔'' اس نے آزردگی سے کہا۔

''ہم اس جاب کے لیے کسی اور کو سیلکٹ کرلیں؟''

''جی کرلیں۔'' اس نے بے دلی سے کہہ کر فون بند کردیا۔

''آپ آفس جارہے ہیں؟'' طوبیٰ اپنے اور نعیمہ کے مشترکہ کمرے سے نکل کر آئی۔

''ہاں! ایک ہفتے سے چھٹی کر رہا تھا۔'' وہ اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولا۔ ''آپا چلی گئیں؟''

''جی!''

''تم کالج کیوں نہیں جارہی؟'' اس نے جلدی میں پوچھا۔ مگر کوئی خیال آنے پر بولا۔ ''حُنید کے ساتھ جاتی تھی؟''

''ہماری زندگی میں کچھ لوگوں سے چیزیں اس طرح وابستہ ہوجاتی ہیں کہ وہ نہ ہوں تو دل ہی نہیں جاتا وہ کرنے کا۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

تیز تیز فائل سمیٹتے جنید کے ہاتھ دو سیکنڈ کے لیے ٹھہر گئے، ایک درد تھا جو محسوس ہوا تھا۔

''مجھے اٹھا دینا کل۔ میں چھوڑ آؤں گا۔'' وہ پلٹا اور اپنے سارے تاثرات چھپاتا نرمی سے بولا۔

''امی نہیں اٹھیں؟''

''نہیں وہ فجر پر ہی سوئی تھی اس لیے میں نے انہیں نہیں اٹھایا۔'' وہ کہہ کر کچن میں آگئی۔

''اور تم؟ تم بھی نہیں سوئی ٹھیک سے؟'' وہ اس کے حلقوں کو دیکھتے بولا۔

''رات میں جب میں نیند میں ہوتی تھی تو حُنید بار بار اٹھاتا تھا مجھے کچھ نہ کچھ بنانے کے لیے، اور میں اتنا چڑتی تھی۔ اب کوئی تنگ کرنے کے لیے نہیں پھر بھی نیند ہی نہیں آتی۔'' کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

اس نے بازو پھیلا کر اپنی چھوٹی بہن کو سینے سے لگایا۔

''وہ ہمیشہ کے لیے نہیں گیا، واپس آئے گا۔ اسے آنا پڑے گا۔ قدرت کسی بھی انسان کو ایسی سزا نہیں دیتی جسکا وہ حقدار نہ ہو، وہ صرف آزمائش ڈالتی ہے۔ اور آزمائش جلد ختم ہوجاتی ہے، صبر سے، ہمت و حوصلے سے۔'' جنید مضبوط لہجے میں بولا۔

☆.....☆.....☆

''میں نہیں جاؤں گا۔'' وہ اسے ساتھ لیے تیز تیز چلتی یونیورسٹی کے بنے کلینک کی جانب آرہی تھی جب حُنید بولا۔

''ہادی تمہارے خون نکل رہا ہے۔'' اس نے اسے تکلیف کا احساس دلانا چاہا۔

''میں نے کہا نا کہ نہیں جانا، اتنا کچھ نہیں ہوا

Digitized by Google

جیسے تم پریشان ہو رہی ہو۔'' اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''اچھا بیٹھو دو منٹ یہیں۔'' اس نے بحث کیے بنا اسے بینچ پر بٹھایا اور آگے بڑھ گئی۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ بینڈیج اور کاٹن لیے وہاں موجود تھی۔

''فار گاڈ سیک یار! اتنا بڑا زخم نہیں ہے، ایک ٹشو سے صاف کرنا کافی تھا۔''

بریزہ برہمی کا تاثر لیے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کا زخم صاف کرنے لگی۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی لڑائی کرنے کی؟ جانتے ہو وہ ڈین آف سائنس پروفیسر داؤد کا جاننے والا ہے، اگر اس لڑائی کی خبر اپر مینجمنٹ تک پہنچ گئی تو اسے کوئی کچھ نہیں کہے گا البتہ تمہیں یونیورسٹی سے ضرور نکال دیا جائے گا۔ کیا تم زندگی کے اس نئے مرحلے پر یوں ناکام ہو کر پلٹنا چاہتے ہو؟'' وہ شکوہ کناں انداز میں کہتی دوائی لگا رہی تھی۔

''نئے مرحلے؟'' حُدید چونکا۔ کیا وہ اس کے دل میں پنپتی محبت کے مرحلے کے بارے میں بات کر رہی تھی؟ کیا وہ جان چکی تھی؟

''یونیورسٹی کی بات کر رہی ہوں۔''

''وہ تمہیں کیسے جانتا ہے؟'' اس نے وہ سوال پوچھا جو بہت دیر سے اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

''وہ میرے اسٹیپ فادر کا بیٹا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''تمہیں روکنا نہیں چاہیے تھا مجھے۔'' وہ اس لڑائی کے ہونے کے بجائے، لڑائی کے ختم ہو جانے سے ناخوش تھا۔

''تمہارے دل میں میری اتنی اہمیت ہے کہ تم ہمیشہ اس طرح ہی میری بات مانو گے۔'' وہ پوچھ نہیں رہی تھی، بتا رہی تھی۔ کوئی وعدہ تھا جو وہ لینا چاہ رہی تھی۔

''میں تمہارا کوئی غلام تھوڑی ہوں جو ہمیشہ تمہاری بات مانوں گا۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔

وہ مسکرا کر بینڈیج باندھنے لگی۔

''اوہ ارسل کی اتنی مسڈ کالز!'' حُدید نے موبائل نکال کر دیکھا۔

''ارسل تمہارا بچپن کا دوست ہے؟'' بریزہ نے سر اٹھا کر پوچھا۔

''ہاں! میری اس سے اسکول میں دوستی ہوئی تھی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ماضی کا کوئی عکس اس کی آنکھوں میں لہرایا تھا۔

''شروع شروع میں اتنا نروس اور کم گو سا تھا، اس کے امی ابو کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی پھوپھو بے اولاد تھیں تو اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ مگر کچھ عرصے بعد پھوپھو کے جڑواں بچے ہوئے تو ان کی توجہ ارسل پر سے کم ہو گئی اور یہ بات ارسل کو بہت محسوس ہوتی تھی۔ اس دوران ہی میری ارسل سے دوستی ہوئی۔ بس پھر ہمارا آپس میں بھائیوں سے بھی زیادہ گہرا رشتہ بن گیا۔''

''وہ ابھی پھوپھو کے ساتھ رہتا ہے؟'' بریزہ کو ارسل سے ہمدردی سی ہوئی۔ وہ اٹھ کر حُدید کے برابر میں بیٹھی۔

''نہیں میٹرک کے بعد اس نے ٹیوشن پڑھائی، ڈفرنٹ چھوٹی موٹی جابز کی اور جب اس کے پاس تھوڑی سیونگ ہو گئی تو اس نے فلیٹ کرائے پر لیا اور وہاں شفٹ ہو گیا۔ مگر اس کے فلیٹ پر اس سے زیادہ میں وہاں پایا جاتا ہوں۔ یونیورسٹی سے واپسی پر، کبھی رات میں پڑھنے کے لیے، کبھی گھر والوں سے ناراض ہو کر۔'' وہ دھیما سا ہنسا۔

''حُدید!'' ارسل ان دونوں کے سر پر کھڑا تھا۔

''تمہیں آنے کی ضرورت نہیں تھی، ٹھیک ہوں میں۔'' وہ جانتا تھا کہ ارسل کیا کہنے والا ہے۔

Digitized by

''میں تمہاری وجہ سے نہیں آیا ہوں، اپنے گلٹ کی وجہ سے آیا ہوں۔ تمہارے جھگڑے کا سننے کے بعد اگر ملے بغیر ہی گھر چلا جاتا تو گلٹ رہتا مجھے، پھر میں ٹھیک نہیں رہ پاتا۔''

حُنید اس کی بات پر پُرسکون سا مسکرایا، وہ واقعی بہت خوش قسمت تھا کہ اتنے خیال کرنے والے اس کی زندگی میں تھے۔

''حُنید؟ بیٹا کیا ہوا؟'' سر عبید جو پاس سے گزر رہے تھے وہ حُنید کے ہینڈ بیج بندھی دیکھ کر ٹھہر گئے۔

''وہ۔۔۔ کچھ نہیں سر۔ بس زرا سی چوٹ لگ گئی تھی۔'' حُنید دھیمے لہجے میں بولا۔

''سر آپ نے جو کل مارکس کی لسٹ لگائی تھی اس میں میرا نام اور نمبر نہیں تھے۔'' ارسل نے پوچھا۔

''کیا آپ میرے اسٹوڈنٹ ہیں؟'' وہ اچنبھے سے پوچھ رہے تھے۔

''جی سر! میں ٹیل کام ڈپارٹمنٹ فرسٹ ائیر کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ آپ ہمیں اکنامکس پڑھاتے ہیں۔'' ارسل مجمل سا کان کھجاتے ہوئے بولا۔

اچھا ہاں! آپ کے نمبر سب سے زیادہ تھے۔ اس لیے میں الگ سے کلاس میں اناؤنس کرنا چاہتا تھا۔'' انہوں نے عام سے لہجے میں اسے اطلاع دی۔

''حُنید بیٹا آپ اپنا خیال رکھیں۔ آپ جیسے پر اعتماد اور ممتاز اسٹوڈنٹ ہماری یونیورسٹی کا سرمایہ ہیں، ہمیں آپ سے بہت امیدیں ہیں۔'' وہ اس کا کندھا تھپک کر چلے گئے۔

ارسل خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

''مام!'' رات کا دوسرا پہر تھا جب بریزہ ثمینہ کے روم میں آئی۔ پشت سے دیکھنے پر ڈھیلے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس شال لپیٹے وہ پرسکون سی لگ رہی تھی مگر سامنے سے انگلیاں مڑوڑتی وہ واضح بے چین نظر آتی تھی۔

''آؤ ڈیئر!'' نیم اندھیرے کمرے میں لیپ ٹاپ پر مصروف ثمینہ نے اس کی جانب نرمی سے دیکھ کر کہا۔

بریزہ دھیمی چال چلتی ان کے بیڈ کے سامنے چیئر پر آن بیٹھی۔ وہ آج ابراہیم کے باعث ہونے والے جھگڑے کے بارے میں بات کرنے کے مصمم ارادے سے آئی تھی۔

''مام آپ نے اپنی اولاد سے پوچھے بنا شادی کرلی مگر میں نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ اولاد ہونے کے ناطے مجھے یہ حق نہیں تھا۔ مگر شاید آپ نے بھی خود کو سارے فرائض سے بری الذمہ کردیا ہے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ پچھلے دو سال میں آپ نے کبھی مجھے سے بات کی ہو یا ساتھ چائے بھی پی ہو۔'' اس کی لہجے میں محرومی بول رہی تھی۔

''اوہ ڈیئر۔ میری مصروفیت کا تعلق حسان سے نہیں ہے، تم جانتی تو ہو۔ میری پاس ہمیشہ سے اتنی دولت نہیں تھی۔ میں نے بہت محنت کی ہے یہاں تک پہنچنے میں۔ چھوٹے سے کوچنگ سینٹر کو اسکول میں بدلا، اس کی برانچز بنائی۔ اس لیے یہ سب مینٹین کرنے کے کی وجہ سے تمہارے لیے وقت نہیں نکال پاتی میں۔ اور تم تو میری بیٹی ہو، تمہیں وقت دوں یا نہ دوں، تم ہمیشہ میری بیٹی رہو گی مگر یہ بزنس جو ہوتا ہے۔ اس کو اگر وقت نہ دوں تو یہ میرا نہیں رہے گا۔'' وہ اپنے بالوں کی لٹوں کو انگلی پر لپیٹے ہوئے اطمینان سے بولیں۔

''مام! کچھ چیزیں وقت مانگتی ہیں، تو انسان اور رشتے بھی وقت مانگتے ہیں۔ بے شک میں آپکی بیٹی ہوں اور رہوں گی مگر میں اس بے توجہی کے باعث

Digitized by Google

آپ کے قریب نہیں رہوں گی۔"

"تم بڑی ہوگئی بریزہ اب، کب تک میری انگلی پکڑ کر چلو گی؟" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔

"میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ سائے کی طرح میرے ساتھ رہیں، مگر کم از کم خبر تو رکھیں کہ آپ کے ڈیئر ہزبینڈ اور ان کا بیٹا اس گھر میں کیا کرتے پھر رہیں ہیں، آپکی بیٹی کی ساتھ کیا کر رہے ہیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوگئی۔

"ثمینہ! کہاں ہو تم؟ مسز ہمدانی کی کال آرہی ہے تمہارے موبائل پر۔ کوئی پارٹی تھی شاید ان کے گھر، تم گئی نہیں۔" حسان صاحب موبائل لیے کمرے میں داخل ہوئے، نیم اندھیرے میں ان کی نظر سامنے بیٹھی بریزہ پر نہیں پڑی۔

بریزہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے باہر آگئی۔ روم کے دروزے تک پہنچ کر وہ رک سی گئی اور ایک موہوم سی امید کے تحت اندر کمرے کی آوازیں سننا چاہیں کہ شاید ثمینہ نے اسے آواز دی ہو، اسے روکا ہو۔ اندر سے آوازیں تو آرہی تھی، مگر ثمینہ کی مسز ہمدانی سے کال پر بات کرنے کی۔

اپنے کمرے تک جاتے ہوئے بہت سا نمکین پانی تھا جو بریزہ کی آنکھوں میں جمع ہوگیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جنید آفس سے تھکا ہارا گھر آیا تو سامنے لاؤنج میں عزیز ماموں کو نعیمہ کے ساتھ براجمان پایا۔ ناگواری کی ایک لہری دوڑ گئی۔ وہ ایک سرد نگاہ ان پر ڈالتا کمرے کی جانب بڑھنے لگا جب عزیز ماموں کی طنزیہ آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"تم نے بھی خوب تربیت کی ہے اپنی اولاد کی نعیمہ، تمیز نام کی کوئی شے تمہارے گھر میں موجود نہیں۔ نہ تمہارے بیٹے کو سلام کرنے کی تمیز ہے نہ اس کے سسرال والوں کو رشتہ داری نبھانے کا سلیقہ۔"

وہ ٹھٹک کر پلٹا۔ اس کے سسرال والوں کا اس وقت بھلا کیا ذکر۔

"عروج کی بھابھی کا فون آیا تھا، وہ لوگ ڈیٹ فکس کرنے کے لیے آج آنا چاہ رہے تھے۔ مگر ابھی بیس منٹ پہلے ان لوگوں نے کال کر کے منع کر دیا۔"

"ایسے لوگ خاندانی لوگ نہیں ہوتے جو یوں دوسروں کو پریشان کرتے ہیں۔ میں اپنے اتنے ضروری کام چھوڑ کر آیا تھا، ثمینہ میکے چھوڑنے کا کہہ رہی تھی مگر میں نے سوچا کہ پہلے بھانجے کا معاملہ دیکھ لوں مگر فائدہ ہی نہیں ہوا۔" عزیز ماموں جلے بھنے بیٹھے تھے۔

"ماموں تو آپ مت آتے یہاں، پہلے اپنا ضروری کام "مامی" کو چھوڑ کر آتے۔" اس نے مامی کے لفظ پر زور دیا۔

"تمہاری ماں نے ہی اصرار کر کے بلایا تھا، ورنہ مجھے کوئی شوق نہیں تھا تم جیسے احسان فراموشوں کے پاس آنے کا۔" وہ آگ بگولہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دوبارہ نہیں آؤں گا۔" وہ کہہ کر نکل گئے۔

"بھائی صاحب! رکیں۔۔" نعیمہ گھبرا کر ان کے پیچھے لپکیں۔

"چھوڑ دیں انہیں امی۔" اس نے نرمی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"وہ ہمارے اپنے ہیں۔ خیال کرنا پڑتا ہے۔"

"بہت برے لگتے ہیں مجھے وہ اپنے، جو جان بوجھ کر ہماری زندگی کو مشکل بناتے ہیں۔" وہ تنک کر کہتا کمرے میں آگیا۔

"میں کھانا لگا رہی ہوں۔ آجاؤ!" پیچھے سے نعیمہ کی آواز آئی۔

بیڈ پر سامنے اس کے کپڑے پریس ہوئے رکھے تھے۔ وہ حیران سا ہوا کیونکہ ایسا پہلی دفعہ تھا۔

Digitized by Google

''امی کپڑے آپ نے نکالے ہیں؟'' اس نے وہیں کمرے سے آواز لگا کر پوچھا۔

''میں نے نکالے ہیں۔'' طوبیٰ نے دروازے پر آ کر کہا۔ ''اب بس ایک ہی تو بھائی ہیں، آپ کا خیال تو رکھ سکتی ہوں۔'' وہ آزردگی سے بولی۔

جنید کے دل پر ایک گھونسہ سا پڑا۔ وہ کتنی حساس تھی اس کا اسے اندازہ ہو رہا تھا۔

''طوبیٰ! تمہارے دو بھائی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔'' اس نے آگے بڑھ کر طوبیٰ کو سینے سے لگایا۔ ''تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''رشتے ایسے ہی بنتے ہیں بھائی۔ خیال کرنے سے، پروا کرنے سے، برداشت کرنے سے۔ صرف اس دنیا میں قائم ہونے والے رشتے نہیں، بلکہ ازل سے جڑے خونی رشتے بھی۔ اور جہاں یہ احساس کھو جاتا ہے، وہ رشتہ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔'' وہ سمجھداری سے کہتی باہر چلی گئی۔

جنید ٹھنڈی سانس لے کر پلٹا تو اس کا فون گنگنایا۔ عروج کی کال دیکھ کر اس نے ریسیو کیا۔

''آج جو بھی ہوا اس کے لیے بہت سوری۔'' اس کی آواز شرمندہ شرمندی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے بے دلی سے کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ حُنید کو گمشدہ ہوئے تین ہفتے ہی ہوئے ہیں اور یہ بالکل صحیح موقع نہیں ہے شادی وغیرہ کی ڈسکشن کے لیے۔ مگر بھابھی کو تو تم جانتے ہوں، انہوں نے مجھے بنا بتائے کال کر دی۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے انکار کروا دیا۔'' اس نے وضاحت دی۔ وہ جنید کو جانتی تھی کہ وہ کبھی اس سے سوال یا شکوہ نہیں کرے گا۔ مگر خاموشی کی چادر اوڑھ کر ناراض ہو جائے گا۔

''تھینک یو! میں واقعی اس وقت ایسی کسی ڈسکشن کے لیے تیار نہیں تھا۔'' بے دلی لمحوں میں چھٹ گئی۔ ''تم خوش ہو؟''

وہ اس کے ایسے اچانک سوال پر ہنس پڑی۔ ''کس چیز سے؟ لوگوں سے یا زندگی سے؟''

''دونوں سے؟''

''پتہ نہیں کوشش کر رہی ہوں ہر مشکل کو خوشی خوشی فیس کرنے کی مگر بھابھی اور ان کا بھائی۔ تم سے شادی فکس ہونے کے بعد بھی بھابھی کے بھائی کا یہاں بار بار آنا قائم ہے۔ کبھی دل میں آتا ہے کہ برداشت کر لوں کبھی دل کرتا ہے کہ کھری کھری سنا دوں۔''

بظاہر خوش باش رہنے والی وہ لڑکی کتنی پریشانی اور مصیبتوں میں زندگی گزار رہی تھی، اس بات کا جنید کو اچھی طرح سے اندازہ تھا۔

''تمہیں جو ٹھیک لگے وہی کیا کرو۔''

''کیسی نصیحت ہے؟''

''پہلے سے پڑھائے گئے سارے سبق اور نصیحتیں ہمیشہ بے کار جاتی ہیں۔ ہم ہمیشہ وہی کرتے ہیں جو ہمیں اس وقت ٹھیک لگتا ہے یا یوں کہہ لو کہ جو اللہ ہمارے دل میں اس وقت ڈالتا ہے۔ اس لیے میں ہمیشہ تمہارے لیے سب اچھا ہونے کی دعا کرتا ہوں۔''

''تھینک یو!'' وہ مسکرا دی۔

''حُنید کے ملنے کے بعد میں مزید ہماری شادی کو ملتوی نہیں کروں گا۔'' اس نے نرمی سے کہا تھا۔

''اگر تم یہ نا بھی کہتے تو بھی میں حُنید کے مل جانے کی دعا کرتی رہتی۔'' وہ سادگی سے بولی۔ اور اس کی یہی سادگی ہی جو تھی جنید کے دل میں اس کے مقام کو مضبوط بنا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

(جاری ہے)

Digitized by Google

کراچی سے ارسال کردہ دکھی تحریر

خالی گود کا دکھ

عورت ہر دکھ سہہ جاتی ہے مگر وہی عورت جب ماں بنتی ہے
تو اولاد کی ذرا سی تکلیف بھی اُس کو پہروں رُلاتی ہے.....

جمیل میتلو

چھ.....چھن.....سے کپ دو ٹکڑے ہو گیا۔

''اری کمبخت پھر کیا توڑ دیا تو نے ہاتھوں میں تو جیسے دم ہی نہیں ہے کمینی کے.....'' رضیہ بیگم دہاڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

'' ہائے اتنی قیمتی سیٹ کا کپ توڑ دیا..... ذلیل.....!'' شمع سہم کر دیوار سے لگ گئی۔

'' یہ ..... یہ کپ شاہد نے توڑا ہے چچی جان.....''

'' جھوٹی بولتی ہے کمبخت میرے بچے پر الزام لگاتی ہے' تڑ.....تڑ.....'' رضیہ بیگم نے شمع کو بالوں سے پکڑ کر دو تھپڑ لگائے۔

''ممی یہ کپ شاہد بھائی نے توڑا ہے۔'' زاہد نے شمع کو مار کھاتے دیکھ کر کہا۔ پھر رضیہ بیگم نے ایک جھٹکا دے کر حقارت سے اس کے بال چھوڑ دیے اور بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

''میری بات نہیں مانوں گی تو اسی طرح پٹواتا رہوں گا۔'' شاہد شمع کو روتا دیکھ کر بولا۔

''اگر کل تم کیریاں توڑنے میرے ساتھ چلتی تو آج مار بھی نہ کھاتیں آج چلو گی نا۔'' اس نے رعب ڈالا۔ اور شمع نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

''نہیں چچی جان ماریں گی۔''

''کیا.....'' شاہد نے زور سے ایک مکا اس کی پیٹھ پر مارا۔

''چلوں گی۔'' وہ بلبلاتے ہوئے بولی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ شاہد ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

سخت گرمی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان سے آگ برس رہی ہے پنکھے کی ہوا بھی گرم ہو گئی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا گرمی عروج پر تھی رضیہ بیگم نے کروٹ بدلی بچوں کے بستر کی طرف دیکھا جہاں زاہد اور ثوبیہ سو رہے تھے اور شاہد نہیں تھا۔ فرش پر دیکھا جہاں شمع کا بستر تھا۔ وہ بھی نہیں تھی وہ غصے سے اٹھیں اور چھڑی لے کر لان میں آئیں جہاں شاہد درخت پر چڑھا کیریاں توڑ رہا تھا اور نیچے پھینک رہا تھا اور شمع سمیٹ رہی تھی۔ رضیہ بیگم نے تڑ سے شمع کو چھڑی رسید کی۔

Digitized by Google

"منحوس اتنی دوپہر کو بھی آرام نہیں تجھے کمبخت..... شاہد نیچے اترو۔" انہوں نے ڈانٹتے ہوئے اسے کہا۔ شاہد چھلانگ مار کر نیچے کود پڑا۔

"تم کیوں کمرے سے باہر آئے بدتمیز....." رضیہ بیگم نے شاہد کو ڈانٹا۔

"ممی میں تھوڑی آیا تھا یہ شمع مجھے لے کر آئی تھی۔" شاہد نے جھوٹ بولا۔

"اس منحوس نے تو مجھے تنگ کر دیا ہے نہ جانے کب یہ بلا سر سے ٹلے گی۔" وہ شمع کو گھورتی ہوئی شاہد کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلی گئیں۔

شمع کے والدین پچھلے سال کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے اور یہ معجزانہ طور پر بچ گئی تھی اسے ایک خراش تک نہیں آئی تھی۔ اپنے بھائی اور بھابی کے انتقال کے بعد جاوید صاحب اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔

جاوید صاحب کے تین بچے تھے سب سے بڑا شاہد جو کہ دس سال کا تھا پھر آٹھ سالہ زاہد اور پھر تین سالہ ثوبیہ تھی۔ شمع چار سال شاہد سے چھوٹی تھی۔ جاوید صاحب صبح جاتے اور رات گئے واپس آتے تب شمع بچوں کے ساتھ سو رہی ہوتی۔ وہ بیوی کو بھی ہدایت کرتے کہ شمع کا زیادہ خیال رکھا کرو۔ رضیہ بیگم اس وقت تو کچھ نہ کہتیں لیکن ان کے جانے کے بعد شمع سے پوری کسر نکال لیتیں زاہد اور ثوبیہ اپنے بابا کی طرح شمع سے محبت کرتے تھے۔ شاہد اور رضیہ بیگم اس کے دشمن تھے۔ شاید تو نا معلوم کون سے جنم کا بدلہ اس سے چکا رہا تھا نقصانات اور شرارتیں شاہد کرتا

Digitized by Google

اور مار شمع کو پڑتی۔ رضیہ بیگم تو موقع کی تاک میں رہتی تھیں کہ بس موقع ملے اور وہ شمع کو پیٹیں۔

''چچا جان.....'' شمع نے ناشتے کی میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جی بیٹی.....'' انہوں نے پیار سے شمع کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ میری کاپی ختم ہو رہی ہے دوسری کاپی چاہیے۔''

''اچھا ہم واپسی پر اپنے بیٹے کے لیے کاپی لیتے آئیں گے، ٹھیک ہے نہ.....'' انہوں نے محبت سے شمع کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شمع نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

اسی طرح دن گزرتے رہے شمع فرسٹ ایئر میں آ گئی شاہد حیدر آباد میں وکالت پڑھ رہا تھا۔ زاہد نے میڈیکل جوائن کیا تھا، ثوبیہ آٹھویں میں تھی زاہد اور ثوبیہ تو شمع کے دوست تھے۔

رضیہ بیگم کا رویہ بھی شمع کے ساتھ کافی بدل گیا تھا۔ زاہد اور ثوبیہ شمع کا خیال رکھتے تھے اور اس کی حمایت بھی کرتے تھے لیکن شاہد وہ شمع کا صدا کا دشمن تھا۔ وہ ذرا بھی نہ بدلا تھا جب بھی آتا تھا اس پر خوب طنز کرتا اور ذرا سی بات پر ڈانٹ ڈانٹ کر شمع کا خون خشک کر دیتا اور اپنا ہر کام ملازمہ کے بجائے اس سے لیتا۔

شمع سیکنڈ ایئر کا آخری پرچہ دے کر اطمینان سے گھر میں داخل ہوئی۔ وہ بہت خوش تھی پیپر اس کی امید سے زیادہ اچھے ہوئے تھے۔

''میری اچھی پوزیشن آئے گی پھر میں میڈیکل جوائن کروں گی۔ اور اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں گی انشاء اللہ.....'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تب وہ اچانک کسی سے ٹکرا گئی۔

اس نے خوفزدہ ہو کر سامنے دیکھا شاہد تیوریاں چڑھائے سامنے کھڑا تھا۔

''نہ معلوم یہ کب آ گیا کمبخت.....'' شمع نے دل میں کہا اور جلدی سے اپنے کمرے میں بھاگی۔ کہیں وہ پھر کچھ نہ کہہ دے۔

''تمہیں تو سلام کرنے کی بھی تمیز نہیں۔'' شاہد نے کاٹ کھانے کے انداز میں کہا۔ وہ سنی اَن سنی کر کے اپنے کمرے میں گھس گئی۔

''ہر وقت میری انسلٹ کرے اور میں اس کو سلام کروں۔'' شمع کمرے میں آتے سوچ رہی تھی۔

شمع کو شاہد سے نفرت تھی وہ اپنا سر جھٹک کر تولیہ لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ شمع کھانے کی میز پر نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن ثوبیہ اسے زبردستی لے گئی وہ بڑی خاموشی کے ساتھ میز کے گرد اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

رضیہ بیگم اور شاہد پہلے ہی میز پر بیٹھے تھے ابھی اس نے دو تین لقمے ہی کھائے ہوں گے کہ شاہد نے رضیہ بیگم کو مخاطب کیا۔

''ممی..... میں اگلے ماہ یہاں آ کر پریکٹس شروع کروں گا۔ اس لیے آپ اسے تو کہیں ٹھکانے لگائیں۔'' اس نے شمع کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا مطلب.....'' رضیہ نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ اس کی کہیں شادی وادی کر دیں۔'' وہ طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ شمع خاموشی سے آہستہ آہستہ لقمے اٹھا رہی تھی۔ رضیہ بیگم کے کچھ بولنے سے پہلے ثوبیہ بول پڑی۔

''ارے واہ باجی تو ڈاکٹر بنیں گی۔''

''پھر تو مریض اس کی صورت دیکھ کر بے موت مر جائیں گے۔'' شاہد معنی خیز انداز سے بولا۔

''کیوں کیا ہوا صورت کو آپ سے تو خوبصورت ہیں باجی۔'' ثوبیہ بولی۔ رضیہ بیگم خاموش تھیں۔

''خوبصورت ہونہہ..... مجھے تو اس کی شکل دیکھ

Digitized by

کر ڈر لگتا ہے۔'' شمع کے لیے اب کھانا کھانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''شاہد..... تم گھاس تو نہیں کھا گئے ہو۔'' رضیہ بیگم نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

کچھ دنوں سے شاہد اپنے دل میں شمع کے لیے کچھ الگ قسم کے جذبات محسوس کر رہا تھا اب وہ اُسے پیاری لگنے لگی تھی مگر فطری ہٹ دھرمی یہ بات ماننے کو تیار نہ تھی۔

''باجی..... باجی.....'' ثوبیہ نے پکارا مگر وہ نہیں رکی۔

''بھائی جان آپ کو باجی سے کیا دشمنی ہے انہیں کھانے سے اٹھا دیا۔'' ثوبیہ نے شکایت کی۔

''اچھا ہوا..... چلی گئی میرے سامنے بیٹھی تھی تو مجھ سے کھایا نہیں جا رہا تھا۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''اچھا تو آپ بیٹھ کر کھانا کھائیں میں جا رہی ہوں۔''

''اچھا تو پھر شوق سے جاؤ تم بھی بھوکی مرو شمع کے ساتھ.....'' شاہد نے بے پرواہی سے جواب دیا اور ثوبیہ ہاتھ جھٹک کر اٹھ گئی۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے شاہد.....'' رضیہ بیگم نے اسے ڈانٹا۔ لیکن شاہد پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اطمینان سے کھانا کھاتا رہا۔ رضیہ بیگم بیٹے کی خودسری سے واقف تھی۔ اسی لیے خاموش ہو گئی شاہد آٹھ دن رہنے کے بعد واپس چلا گیا۔ تب شمع کو کچھ سکون محسوس ہوا۔ لیکن جب اسے خیال آتا کہ اگلے ماہ وہ واپس آ جائے گا۔ ہمیشہ کے لیے تو وہ پریشان ہو جاتی تھی پھر وہی ذلت آمیز سلوک وہی بار بار کی تذلیل نہ معلوم شاہد کو مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ سب کے ساتھ اس کا رویہ اچھا تھا ثوبیہ اور زاہد کے ساتھ وہ ہنستا بولتا ان تینوں کی رات بھر محفل سجی رہتی۔ شاہد ان دونوں کے لیے تحفے لاتا دونوں سے محبت بھی کرتا ثوبیہ تو لاڈلی بہن تھی اس کی ہر فرمائش پوری کی جاتی۔ وہ روٹھ جاتی تو اسے فوراً منا لیتے بس ضدی لاابلی خودسر تھا اگر موڈ ہوتا تو ہر بات مان لیتا اگر موڈ نہ ہوتا تو چاہے کچھ بھی ہو جائے پروانہ کرتا کبھی کبھی شمع سے بھی غلطی سے سیدھے منہ بات کر لیتا لیکن اکثر اس کا ازلی دشمن بنا رہتا تھا یہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے۔ شمع پریشان ہوتی جا رہی تھی۔

''ہونہہ کوئی بات نہیں چچا جان سے شکایت کروں گی۔ اگر یونہی مجھے ذلیل کیا تو.....'' شمع نے سوچا۔ آج تک شمع نے کبھی بھی جاوید صاحب سے شکایت نہ کی تھی انہیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ شاہد کا کیسا رویہ ہے ان کے سامنے تو شاہد اپنے پر سنجیدگی کا خول چڑھائے رکھتا اور شمع سے زیادہ گفتگو ہی نہ کرتا اور شمع تو ویسے ہی اس سے کتراتی پھرتی تھی۔ اس لیے جاوید صاحب کو آج تک صحیح حقیقت کا علم ہی نہ ہو سکا۔

آخر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دن آ گیا جس دن شاہد کو آنا تھا اور شاہد آ گیا مع سامان کے وہ سارا دن اپنے کمرے سے نہ نکلی رات کے کھانے کے وقت وہ کمرے سے نکلی کیونکہ حسبِ معمول جاوید صاحب موجود تھے ورنہ وہ فکرمند ہو جاتے۔ اس لیے اسے جانا پڑا۔

میز پر بیٹھے ہوئے شمع نے ایک نظر شاہد کو دیکھا جو معصوم صورت بنائے جاوید صاحب کو اپنی پریکٹس شروع ہونے کے بارے میں بتا رہا تھا مسٹر ڈکلر کی شلوار قمیض میں وہ بے حد اسمارٹ لگ رہے تھے۔ شمع کو اپنی طرف دیکھتا پا کر شاہد کے ماتھے پر بل آ گیا شمع خاموشی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور ثوبیہ سے باتیں کرنے لگی۔

Digitized by Google

جاوید صاحب نے شمع سے پوچھا۔
''کیسی ہو بیٹی۔''
''ٹھیک ہوں چچا جان.....'' وہ شاہد کو دیکھ کر مسکرا کر بولی۔ جو ماتھے پر بل ڈالے پلیٹ کو اپنی طرف گھسیٹ رہا تھا۔
''اب کھانا بھی شروع کیجیے۔'' رضیہ بیگم نے شوہر سے کہا۔ پھر سب کھانے میں لگ گئے ساتھ گفتگو بھی جاری تھی۔
شمع حسب معمول بریک فاسٹ اور ڈنر سب کے ساتھ لیتی لیکن لنچ اپنے کمرے میں لیتی تھی اس طرح چار دن خیریت سے گزر گئے تھے۔ شمع خوش تھی لیکن شاہد پیچ و تاب کھا رہا تھا جب روانہ رات کے کھانے پر شمع مسکرا کر شاہد کی طرف دیکھتی تو اس کا جی چاہتا کہ اسے کچا ہی کھا جائے لیکن وہ جاوید صاحب کی وجہ سے خاموش رہتا اور کھانا اس طرح تیزی سے کھاتا جیسے وہ سچ مچ شمع کو دکھا رہا تھا اور شمع کی مسکراہٹ اور گہری ہو جاتی آخر ایک روز شاہد کو موقع مل ہی گیا وہ سیدھا شمع کے کمرے میں آئے۔
شمع بیڈ پر آڑھی ترچھی آنکھیں بند کیے لیٹی تھی اس کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ تھی شاہد کے دل میں کچھ کچھ ہوا لیکن خود پر کنٹرول کرتے دہاڑنے کے انداز میں پکارا۔
''شمع..... شمع.....'' اور شمع نے اس طرح ڈر کر آنکھیں کھولیں جیسے کسی خوفناک خواب سے آنکھ کھل گئی ہو وہ دم بخود شاہد کو دیکھتی رہی۔
''تم نے سنا نہیں.....'' شاہد نے غضبناک ہو کر کہا۔
''جی.....'' شمع ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔
''چلو میرے کمرے کی صفائی کرو.....'' وہ کٹیلے پن سے بولا۔
''کریمن سے کرائیں جا کر.....'' شمع نے بھی ہمت جمع کرتے ہوئے کہا۔
''کیوں تم کس لیے ہو سارا دن پلنگ توڑتی رہتی ہو۔'' شاہد نے سرخ ہو کر غصے سے کہا۔
''میں کوئی نوکر ہوں کیا آپ کی.....'' شمع تیزی سے بولی۔
''جواب دیتی ہو بدتمیز.....'' شاہد خونخوار نظروں سے آگے بڑھا دوسرے ہی لمحے اُس کا ہاتھ لہرایا لیکن ہوا میں ہی جھول کر رہ گیا۔ کیونکہ شمع وہاں سے بھاگ چکی تھی۔ شاہد کو اپنے رویے کا احساس ہوا اور اس کے اس طرح بھاگنے پر ہنسی بھی آ گئی۔
کتابی چہرہ' گلابی رنگ' ستواں ناک' بڑی بڑی کالی بھنور سی خوبصورت آنکھیں' خوبصورت ہونٹ' لانبی میں گلاب کو بھی شرما دے' کالے بالوں کی لمبی سی چوٹی جو ہر وقت کمر پر جھولتی رہتی مقناطیسیت سیڈول جسم وہ حسین ہی نہیں بلکہ بہت حسین تھی شاہد نے نہ جانے کب سے کتابوں کے شیلف کو ترتیب دیتی شمع کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک شمع کی نظر شاہد پر پڑی جو دروازہ تھامے اسے دیکھ رہا تھا آخری کتاب رکھتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس کی آنکھیں سرخ تھیں شاید وہ روئی تھی کتابیں رکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔
''صفائی کر لی.....'' شاہد ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے قرینے سے سجے ہوئے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
''جی.....'' شمع کی آواز میں لرزش تھی۔
''اچھا تو پھر جاؤ.....'' شمع برا سا منہ بنا کر باہر چلی گئی اور شاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شمع نہا کر تولیے سے بال خشک کرتی ہوئی لان میں آ گئی جہاں ثوبیہ پھول چن رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا سے لطف لینے لگی ثوبیہ پھول لے کر اس کی طرف آئی اور دو قدم کے فاصلے پر رک کر بولی۔

Digitized by

''اُف کتنی اچھی لگ رہی ہیں آپ.....!''

''اچھا.....'' شمع ہنس پڑی پھر رک کر بولی۔

''بھئی پیاری ثوبیہ خواہ مخواہ کی تعریف مت کیا کرو۔''

''اچھا آپ یہ پھول پکڑیں میں ابھی آئینہ لاتی ہوں اور سوئی بھی تاکہ گجرہ بنا کر آپ کے بالوں میں لگاؤں گی۔'' وہ اندر کی طرف بھاگتی ہوئی بولی۔

شمع ہاتھوں میں پھول لیے پیلے سوٹ میں کالی کالی زلفیں کھولے قیامت لگ رہی تھی۔ شاہد برآمدے سے آتے ہوئے اُسے دیکھ کر دل میں اس کے حسن کا قائل ہوگیا مگر پھر ویسا ہی کھٹور بن کر بولا۔

''یہ کیا چڑیلوں کی طرح بال کھولے بیٹھی ہو۔''

''جی.....'' شمع کی آواز مدہم تھی۔

''تم کیا سمجھتی ہو تمہیں اس طرح کوئی دیکھ کر تمہاری زلفوں کا اسیر ہوجائے گا۔'' شاہد کا اس طرح گھٹیا جملہ سن کر شمع کا جی چاہا آگے بڑھ کر اس کا منہ نوچ لے لیکن اسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا اور وہ آنکھوں میں آنسو لیے اندر آ گئی۔

''آج تو چچا جان سے ضرور شکایت کروں گی۔'' شمع نے تہیہ کرلیا تھا لیکن شام کو جاوید صاحب جلدی گھر آ گئے اور اُن کا زرد اور تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر سب پریشان ہوگئے تب شرفو نے بتایا۔

''آج ان کی آفس میں طبیعت بگڑ گئی تھی۔'' وہ دل کے مریض تو تھے پہلے بھی انہیں دل کا ایک دورہ پڑ چکا تھا اور شمع پریشانی میں شکایت کرنا بھول ہی گئی۔

شاہد نے مستقل پریکٹس شروع کردی تھی اس لیے وہ آفس میں مصروف رہتا تھا شمع تو رات دن شکرانے ادا کرتی تھی۔ کیونکہ اب اُس سے سامنا نہ ہوتا تھا۔ آخر ایک دن اس کا یہ سکون درہم برہم ہوگیا جب اس نے سنا کہ شاہد شمع سے شادی کرنا چاہتا ہے

کمسر پھسر تو جب سے شاہد گھر میں آیا تھا تب سے ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ رات دن انتظار میں تھی کہ رزلٹ آئے اور وہ میڈیکل میں داخلہ لے چچا جان رشتہ تو رد کرسکتے تھے لیکن اس کی خواہش رد نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن اب یہ سن کر اس کے ہوش گم ہوگئے تھے کہ شاہد کے ساتھ شادی زندگی بھر کا ساتھ لمحہ بھر کے ساتھ میں اس قدر ذلت توہین ہوتی ہے۔ پھر..... پھر..... کیا..... ہوگا۔ اس کے آگے وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔

''نہیں..... نہیں..... یہ کیسے ہوسکتا ہے' میں چچا جان کو سب کچھ بتادوں گی اگر وہ نہ مانے تو اُن کے پیر پکڑ کر التجا کروں گی۔ وہ اتنے سنگ دل نہیں ہیں وہ تو ثوبیہ سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں۔'' دیوار میں لگے کلاک نے دس بجائے تو وہ اسٹڈی روم کی طرف چلی گئی جہاں حسب معمول لائٹ آن تھی۔ جس کا مطلب تھا چچا جان کمرے میں موجود ہیں۔ شمع نے جونہی پردہ ہٹا کر اندر جانا چاہا اندر سے رضیہ بیگم کی آواز ابھری۔

''آپ نے کچھ سنا ہے شاہد کیا کہتا ہے۔'' لہجہ تیز تھا لیکن آواز دھیمی تھی۔

''کیا.....'' جاوید صاحب نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''کہتا ہے شمع سے شادی کروں گا۔'' آواز میں ناگواری تھی۔

''اچھا..... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔

''لیکن.....'' رضیہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں شمع کے لیے ہمیں شاید سے بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں ملے گا۔ یہ میری برسوں کی آرزو ہے کہ شمع میری بہو بنے اس طرح وہ میری نظروں کے سامنے بھی رہے گی اور میری طبیعت اب

Digitized by Google

ویسے بھی بہت اچھی نہیں رہتی پھر دو دو بچوں کی ذمہ داری ہے اگر میں مر بھی گیا تو مجھے یہ تسلی رہے گی کہ شمع اپنے گھر میں پُرمسرت زندگی گزار رہی ہے۔'' وہ دھیرے سے بولے۔

''یہ کیا بدفال منہ سے نکال رہے ہیں۔'' رضیہ بیگم نے بات کاٹی۔

''یہ تو حقیقت ہے رضیہ زندگی کا کیا بھروسہ.....'' جاوید صاحب نے بات دوبارہ شروع کی۔

''مجھے فکر ہی شمع کی ہے اور شمع مجھے ثوبیہ سے زیادہ پیاری ہے۔'' انہوں نے اپنا پرانا جملہ دہرایا۔

''اور میں اپنی زندگی میں شمع کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

''میں شاہد سے خود بات کروں گا۔'' شمع آگے کچھ نہ سن سکی تیزی سے اپنے کمرے میں آ کر ٹوٹے ہوئے شہ تیر کی طرح بیڈ پر گر گئی۔

''اُف میرے خدا پتہ نہیں میری زندگی کا بھی کیا انجام ہوگا۔ شاہد سے تو بہتر ہے چچا جان آپ مجھے آگ میں جھونک دیں' شاہد کے ساتھ زندگی گزارنا موت سے کم نہیں آپ کو معلوم نہیں ہے شاہد کا آج تک میرے ساتھ کیا سلوک رہا ہے۔ نہ معلوم شاہد مجھ سے شادی کر کے کون سے جنم کا بدلہ لے رہا ہے۔'' وہ خیالوں ہی خیالوں میں جاوید صاحب سے مخاطب تھی۔ جب بے چینی حد سے سوا ہوگئی تو بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی۔ سامنے آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔

''کتنی خوبصورت ہیں آپ.....'' اس کے کانوں میں ثوبیہ کا جملہ گونجا۔

''اوہ ثوبی کاش میری صورت کے ساتھ میری قسمت بھی خوبصورت ہوتی۔'' اس کے گالوں سے آنسو تیزی سے بہنے لگے اس نے بے دم ہو کر سر تکیے پر رکھ دیا۔ ثوبی آج کل سیالکوٹ گئی ہوئی تھی اپنی چھوٹی خالہ کے یہاں ثوبی شمع کو تقریباً روز ہی فون کرتی اور اپنی تفریحات اور مشاغل کے بارے میں بتاتی پھر گھر میں اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں اور وہ گونگی بہری بن گئی وہ کہتی تو کس سے کہتی ثوبی تھی نہ زاہد تھا وہ تھی اور ایک تلخ تصور.....

اس نے کھانے کی میز پر بھی جانا چھوڑ دیا تھا۔ اور جاوید صاحب نے اس بات کو اس کی شرم سمجھا تھا۔ ثوبیہ واپس آئی تو اس نے شاہد اور شمع کی شادی کی خبر سنی اور ایک دم کھڑی ہوئی اور شمع کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''باجی..... باجی میں نے یہ سنا ہے کہ آپ بھائی جان سے شادی کرنے پر رضامند ہیں۔''

''ہاں.....'' شمع نے سکون سے جواب دیا۔

''یہ فیصلہ یقیناً ممی نے کیا ہوگا۔'' ثوبی تلخی سے بولی۔

''نہیں یہ فیصلہ چچا جان نے کیا ہے۔'' شمع نے جواب دیا۔

''ابو نے.....'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''ہاں.....'' شمع نے کہا۔

''اور آپ نے سر جھکا لیا..... میں ابھی ابو سے پوچھتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی لیکن شمع نے ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے بٹھا کر کل رات والی تمام گفتگو اسے سنا دی۔

''لیکن انہیں آپ یہ تو بتا دیں کہ شاہد بھائی صدا کے آپ کے دشمن ہیں ممی تو ہمیشہ سے تماشا دیکھتی ہیں۔''

شمع نے ثوبیہ کو خاموش رہنے کو کہا اور بولی۔

''جو میری قسمت میں ہوگا سو ہوگا میں چچا جان کو دکھی کرنا نہیں چاہتی اللہ مالک ہے اور ویسے بھی مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' ثوبیہ چند منٹ

URDU TUBE

Digitized by Google

تو اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے خاموش ہوگئی۔

''یا اللہ میری باجی کو سکھی رکھنا۔'' ثوبی نے دل سے دعا کی۔ مایوں بیٹھنے سے ایک روز پہلے زاہد بھی آ گیا اس نے شمع کو دیکھا جو بالکل سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ اس کی نسبت شاید بہت خوش تھا اس کے ہر انداز سے خوشی چھلک رہی تھی نہ معلوم وہ اتنا خوش کیوں تھا شاید اس لیے کہ شمع اب مکمل طور پر اُس کی ہو رہی تھی۔ بھائی اب دل کھول کر انہیں تنگ کرے گا زاہد سوچ رہا تھا۔ اس کے دل میں شمع کے لیے ہمدردی تھی۔ لیکن وہ بڑوں کے فیصلے کے سامنے نہیں بول سکتا تھا۔ دوسرے دن شمع کو مایوں بٹھا دیا گیا۔

محلے کی لڑکیاں گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں گھر میں خوب ہنگامہ تھا۔ خاص کر اس وجہ سے بھی کہ دولہا دلہن دونوں ایک ہی گھر میں تھے گھر کے سب افراد کو حیرت تھی کہ شاہد شمع سے کیسے شادی کر رہا ہے۔ جبکہ بقول اس کے مجھے شمع کی صورت سے نفرت ہے۔

سب اپنی اپنی جگہ یہی بات سوچ رہے تھے سوائے جاوید صاحب کے بس وہ مطمئن اور خوش تھے۔

''شمع.....'' زاہد نے آہستہ سے شمع کو پکارا۔ شام کو مہندی تھی اس لیے سب اسی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔

''شمع.....'' زاہد نے پھر پکارا جو اخبار پکڑے کھڑا تھا۔

''جی.....جی.....'' وہ زور سے چونکی۔ ملگجا لباس جس میں سے اُبٹن کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی چہرہ لباس کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ ہونٹ خشک اور آنکھیں روئی روئی صاف محسوس ہو رہی تھیں زاہد کو اپنی پیاری سی کزن پر بہت ترس آیا۔

''جی زاہد بھائی.....'' شمع اداس آواز میں بولی۔

''شمع.....!'' وہ شگفتگی سے بولے۔

''ایک خوش خبری سناؤں۔''

''خوش.....خبری.....'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی آنکھوں میں اداسی اور کرب تھا۔

''تمہارا رزلٹ آ گیا ہے تم نے پورے کالج میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔''

''جی..... پہلی..... پوزیشن.....'' اس کی آنکھوں میں کرب اور ویرانی بڑھ گئی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے ایک جانب جھک گئی۔ زاہد گھبرا کر تیزی سے آگے بڑھا۔

''شمع..... شمع.....شمع.....'' وہ زور سے پکارے۔

''کیا ہوا.....'' ثوبی جلدی سے آتے ہوئے بولی۔ سب لڑکیاں متوجہ ہوگئیں۔

''ارے ارے یہ تو بے ہوش ہوگئی ہے۔'' کوئی لڑکی گھبرا کر بولی۔

''یہ لو پانی۔'' کسی لڑکی نے ثوبی کو پانی تھمایا وہ جلدی جلدی شمع کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی سب لڑکیاں گھیرا ڈالے کھڑی تھیں، پھر اُسے ہوش آ گیا۔

''بھئی لڑکیوں دلہن کے کھانے کا بھی خیال رکھو دیکھو بچی کیسی پیلی ہو رہی ہے۔'' رضیہ بیگم کی بڑی بہن جو سیالکوٹ سے شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں شمع کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔

☆.....☆.....☆

''شمع.....'' شاہد نے گھونٹ اٹکتے ہوئے دھیرے سے اُسے پکارا لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

''ماشاء اللہ.....'' شاہد کے منہ سے گھونگھٹ پلٹتے ہی بے اختیار نکلا اور وہ سحر زدہ سا ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔ آج وہ شمع کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر اس کے حسن کا قائل تو ہو گیا تھا۔ مگر گھائل بھی ہوگئے

Digitized by Google

اور شمع گومگوں کی حالت میں حیران سی پٹ آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی جس نے زندگی میں کبھی سیدھے منہ بات نہ کی تھی۔ جس کے لیے وہ سوچ رہی تھی کہ آج سے اس کی قیامت کے دن شروع ہوں گے لیکن اس کے برعکس جب شاہد کے پیار میں سرشار لہجہ سنا تو حیرت تو یقینی تھی۔

''تم مجھ سے خفا نہ ہو شمع جان.....'' شاہد اُسے خاموش دیکھتا بولا۔

''ہاں تم ناراض ہونے میں حق بجانب ہو شمع میں نے آج تک تم سے بہت برا سلوک کیا ہے۔'' وہ جواب نہ پا کر خود ہی بولا۔

''تم میرا دل چیر کے دیکھو جس میں تمہارے لیے پیار ہی پیار ہے۔ آؤ آج ہم مل کے ایک نئی زندگی کی شروعات کریں۔'' وہ بانہیں پھیلا کر مخمور آواز میں بولا۔ اور جنم جنم کی پیار کی ترسی ہوئی شمع ان کے چوڑے سینے سے جا لگی اور دو ستارے ٹوٹ کر اس کی پلکوں سے شاہد کے سینے میں جذب ہو گئے۔

''میری شمع.....'' شاہد نے تھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے پیار بھری سرگوشی کی تب شمع نے شاہد کی آنکھوں میں وارفتگی دیکھی تو اُسے ڈھیروں شرم آ گئی اور لبوں پر شرمگیں تبسم پھیل گیا۔

پھر شاہد نے دوسری خوشی لے لی جو جاوید صاحب کے گھر سے کافی دور تھی لیکن ثوبی کے اسکول کے قریب تھی وہی شاہد جو شمع سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اب تو جاں نثار کرنے کو تیار رہتا۔ رات دن اس کی ناز برداریاں اٹھانے کے علاوہ اور کوئی کام ہی جیسے تھا ہی نہیں۔ شمع کی ذرا سی تکلیف و بیماری پر کھانا پینا چھوٹ جاتا تھا کبھی وہ حیران سی ہو جاتی اور پوچھ بیٹھتی۔

''کیا آپ وہی شاہد ہیں۔'' تو شاہد ہنس کر اُسے بانہوں میں بھر لیتا۔

ثوبیہ بھی روزانہ اسکول سے واپسی پر شمع کے پاس آ جاتی اور شام کو جاوید صاحب دفتر سے واپسی پر اسے اپنے ساتھ لے جاتے وہ شمع کو خوش دیکھ کر اپنے فیصلے پر مطمئن تھے۔ شمع تو جیسے خوشیوں سے سرشار تھی۔ خوشیوں نے تو گویا اب جنم لیا تھا اس کی زندگی میں اور اکثر وہ اسی سرشاری میں بولتی۔

''ثوبی میری قسمت تو اب مجھ پر مہربان ہوئی ہے۔'' اور ثوبیہ بے ساختہ بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے کہتی۔

''واقعی بھائی آپ نے تو پتھر کو موم بنا دیا۔'' اور تینوں کا بھرپور قہقہہ فضا میں بکھر جاتا۔ اسی ہنسی خوشی اور مسرت میں ایک سال گزر گیا۔ اور ان کی شادی کی سالگرہ آ گئی۔ اس ایک سال میں شمع کو شاہد نے اپنی ہتھیلیوں پر رکھا سالگرہ کے موقع پر رضیہ بیگم نے شمع کو احساس دلایا کہ اس کی گود خالی ہے۔ لیکن شاہد نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ ابھی تو ایک سال ہوا ہے ساری عمر پڑی ہے بچوں کے لیے ممی.....''

اور سالگرہ بھی خاموشی سے گزر گئی اور شمع کی گود سونی ہی رہی تب شمع اداس اور خاموش رہنے لگی رضیہ بیگم جب بھی آتیں یہ احساس اور بڑھ جاتا کیونکہ وہ گھنٹہ بھر ایک ہی بات اسی موضوع پر کرتی رہتیں کہ نہ جانے میں کب پوتے پوتیاں گود میں کھلاؤں گی یہ ارمان میری زندگی میں پورا بھی ہوگا کہ نہیں تب شمع اور اُداس اور رنجیدہ ہو جاتی وہ ہمیشہ یہی سوچتی کہ کیا میں ماں کبھی نہیں بن سکوں گی۔ کیا..... کیا..... مجھ میں کوئی کمی ہے یا پھر..... شاہد.....'' اس سے آگے اس کا ذہن سوچ ہی نہیں سکتا۔

دل میں ایک عجیب کسک اٹھتی وہ بے چین ہو جاتی اور پھر ان لوگوں کو دیکھتی جن کی شادی بعد میں ہوئی تھی اور ان کے گھر میں اولاد بھی ایک وہ تھی جس کا آنگن بالکل سُونا تھا۔ جس کی گود ابھی تک

Digitized by

ویران تھی وہ دن بھر انہی سوچوں میں گھری رہتی ذرا ذرا سی بات پر آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ وہ عجیب سی ہوگئی تھی۔ رو رو کر سجدے کرتی اور خدا سے ہر وقت دعائیں مانگتی یا اللہ ایک بچہ مجھ کو بھی دے دے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے وہ گڑگڑ آنے لگتی سجدے میں.....

اس کی سجدے میں ہی آنکھ لگ گئی اور وہ کیا دیکھتی ہے کہ وہ ایک خوبصورت باغ میں بیٹھی ہے جس میں جگہ جگہ آم اور جامن کے درخت ہرے بھرے سر اٹھائے کھڑے تھے اور ہر طرف پھول لگے تھے جن کی بھینی بھینی مسحور کن خوشبو ہر طرف بکھری ہوئی تھی سامنے ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جو سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی سبزے میں قطار در قطار پھول لگے ہوئے تھے۔

رات کی رانی اور دن کا راجہ موتیے کے پودے کہیں باڑ اور پیڑ کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے۔ تاحد نگاہ پھولوں اور سبزے کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ دل کو موہ لینے والا منظر تھا۔ پرندے چہچہا رہے تھے شمع نے اپنی گود میں لیٹے ہوئے ننھے سے بچے پر ایک ممتا بھری نگاہ ڈالی اور پیار سے جھک کر اس کا ننھا سا پیارا ماتھا چوم لیا۔ بچہ بالکل شاہد کی کاپی تھا۔ شمع نے اسے سینے سے لگایا اور کچھ سوچ کر وہ بچے کو سینے سے لگائے مخملی گھاس پر چلتے ہوئے پہاڑی پر چڑھنے لگی۔

خراماں خراماں اوپر پہنچ کر اس نے دوسری جانب نگاہ ڈالی اور اتنی گہری کھائی دیکھ کر اس کا دل دہل گیا وہ دو قدم پیچھے ہٹنا چاہتی تھی کہ اچانک پیر پھسلا اور اس کے ہاتھوں سے بچہ چھوٹ گیا اور تیزی سے بھیانک کھائی کی جانب جانے لگا وہ دیوانہ وار بچے کی جانب بھاگنے لگی کہ اچانک اسے کسی نے مضبوط گرفت میں لے لیا اس کی دل چیرنے والی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں نہ جانے کس طرف سے ایک بڑا سا پتھر ٹوٹا اور بچے کے اوپر جا گرا اور شمع کی آنکھوں کے سامنے خون ہی خون بکھر گیا اور وہ بری طرح مچلنے لگی آزاد ہونے کے لیے اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی وہ وہیں جائے نماز پر لیٹی تھی اور پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات سب کھانے پر بیٹھے تھے جب شمع کو اپنی طبیعت بہت بوجھل سی محسوس ہوئی۔ اور کھانے کو دیکھ کر اس کو ابکائی آنے لگی اس کی اس کیفیت پر شاہد پریشان ہوگیا مگر رضیہ بیگم اصل بات بھانپ گئیں اور شگفتہ انداز سے بولیں۔

''بھئی کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیوں.....'' جاوید صاحب نے اُلجھے انداز میں بیوی کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

''اب اس گھر میں بھی بچوں کی قلقاریاں گونجنے والی ہیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ شاہد نے شوخی سے شمع کو دیکھا اور شمع کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی۔ اسے اپنے آنگن میں بے شمار ننھے منے پھول کھلتے نظر آنے لگے۔

''خدا وہ دن جلد لائے۔'' رضیہ بیگم نے دل سے دعا مانگی۔

''آمین.....'' شاہد نے زور سے اور شمع نے دل میں کہا۔ شاہد نے کھلونوں کے گھر میں ڈھیر لگا دیے تھے اور رضیہ بیگم اب زیادہ وقت شمع کے ساتھ ہی گزارتی تھیں ہر وقت ایسے نہ چلو ایسے نہ بیٹھو اس دوران بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور شمع خوشی خوشی آنے والے مہمان کے تصور میں مگن ہر بات پر عمل کرتی جاتی تھی اور بار بار شاہد سے کہتی۔

''کسی اچھی سی آیا کے لیے اشتہار دے دو ایسا

Digitized by Google

کرو ویسا کرو۔'' غرض ہر کوئی آنے والے مہمان کے استقبال کے لیے تیاریوں میں مصروف تھا۔ شمع نے بے شمار ننھے منے کپڑے بنا لیے تھے ایک ایک کر کے گن گن کر دن گزارنے لگے کہ جلد وہ دن آئے اس کی گود میں ایک ننھا منا چمکدار آنکھوں والا خوبصورت بچہ ہو اس طرح سات ماہ بیت گئے آٹھواں شروع تھا۔

''ہوں..... آہ..... اللہ.....'' شمع کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہ نکلی اور آنکھ کھل گئی رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا اس کے منہ سے پھر کراہ نکلی۔

''کیا بات ہے شمع.....'' شاہد بھی اٹھ گئے اور شمع کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

''شاہد درد کے مارے میری جان نکل رہی ہے۔'' شمع نے اُسے بتایا تو شاہد جھٹ سے گاڑی نکال کر اسے لے کر اسپتال پہنچا۔ اور پھر ٹھیک سات بجے نرس نے بے قراری سے ٹہلتے ہوئے شاہد کو اطلاع دی۔

''آپ کی بیگم کو لڑکی پیدا ہوئی ہے۔'' پھر وہ رک کر شاہد کو دیکھنے لگی جس کی آنکھوں میں ایک چمک آ گئی تھی۔

''لیکن وہ زندہ نہیں تھی۔'' نرس نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا.....'' شاہد کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔

''شمع کیسی ہے سسٹر.....'' شاہد نے آہستہ سے پوچھا۔

''مریضہ بالکل ٹھیک ہے آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔'' پھر اسپتال سے ڈسچارج ہو کر شمع گھر آئی تو وہی خالی خالی صحن وہی تنہائی دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''ارے ارے پگلی خدا بہت مہربان ہے اس کی رحمت سے مایوسی ٹھیک نہیں ہے۔'' شاہد نے شمع کے آنسو صاف کیے اب شمع بالکل تنہا تھی۔ کیس کی زیادتی کی وجہ سے شام گئے لوٹتے تو بیہ بھی ہاسٹل میں رہنے میں لگی تھی رضیہ بیگم اختلاج قلب کی وجہ سے زیادہ نہیں آتی تھیں البتہ جاوید صاحب حسب معمول رات کو روز آتے تھے اور شمع کو اداس اور رنجیدہ دیکھ کر تسلی دیتے تھے کبھی کبھی شمع ان کی شفقت محسوس کر کے سسک پڑتی تب وہ رنجیدہ ہو جاتے اور بے شمار دعائیں دیتے۔ شمع نے باقاعدگی سے نماز شروع کر دی تھی۔ جس سے دل کو بہت تسکین اور سکون ہوتا تھا۔

ایک بار پھر امید جاگی اور اسی امید کے سہارے دن گزر گئے اب کے شمع پہلے سے زیادہ احتیاط کر رہی تھی ذرا سی بات پر وہ ڈاکٹر سے مشورہ کرتی اور ڈاکٹر اُسے مطمئن کر دیتی وہ شمع کی بے قراری سمجھتی تھی۔ شمع مطمئن تو ہو جاتی لیکن ایک خوف تھا جو اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ شمع نے بہت سے بچوں کے پوسٹرز کمرے میں چسپاں کر لیے تھے اور شاہد شمع کو بہلانے کی خاطر وہ جو کہتی لے آتا وہ تو شمع کو خوش دیکھ کر جیتا تھا شمع نے گھر سے باہر نکلنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ سیر و تفریح اس کے نزدیک بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ زیادہ وقت عبادت میں گزارتی تھی۔ سات ماہ خیریت سے گزر گئے۔ آٹھوں شروع ہوا تو شمع نے مزید احتیاطی تدابیر اپنا لیں وہ اس بار کوئی نقصان نہیں چاہتی تھی۔ ہر لمحے دعا کرتی کہ یہ ماہ جلدی سے گزر جائے اور اس نے دعائیں اور دوائیں دونوں جاری رکھی تھیں۔

شاہد نے کل وقتی ملازمہ کا بھی بندوبست کر دیا تھا جو گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر اس کے پاس بیٹھ جاتی اور خوب ہاتھوں' پیروں اور سر کی مالش کرتی۔ رشیدہ اپنے چھوٹے بچے کو بھی ہمراہ لاتی

Digitized by Google

تھی۔اس کی رونے کی آواز سن کر شمع نے کہا۔

''رشیدہ گڈو جاگ گیا ہے پہلے اسے دودھ پلادو۔''

''جی باجی.....'' یہ کہہ کر رشیدہ پھرتی سے اٹھی اور گڈو کو گود میں لیے شمع کے کمرے میں چلی آئی اور دروازے پر بیٹھ کر اس کو دودھ پلانے لگی۔شمع اس لمحے رشیدہ کے چہرے پر پھیلے ممتا کے انوکھے روپ میں جیسے کھوسی گئی۔

''ارے میرا بچہ میرا چاند جو جو پیے گا' بھوک لگی ہے میری جان کو۔'' رشیدہ نے گڈو کے ننھے سے چہرے پر بے شمار بوسے دیے اور اپنی ممتا کا خزانہ لٹایا گڈو روتے روتے ہنس پڑا تب رشیدہ نے محبت سے مجبور ہو کر گڈو کو سینے سے لگالیا۔

شمع مسحور ہو کر ماں بیٹے کا پیار دیکھ رہی تھی اسے ایک حسرت سی ہوئی لیکن یہ احساس لمحے کو تھا شمع نے اپنے بڑھتے پیٹ کو دیکھا اور اسے ایسا لگا جیسے اس کے سینے میں بھی ممتا کے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔

''بس بیگم صاحبہ آپ آرام کریں۔'' رشیدہ نے گڈو کو ایک جانب بٹھا کر اسے پلاسٹک کے معمولی کھلونے دیتے ہوئے کہا اور گڈو ان کھلونوں کو ہاتھ مار مار کر کھیلنے لگا۔گورا چٹا چمکی آنکھیں اور سنہری بالوں والا گڈو واقعی گڑے جیسا تھا۔اور رشیدہ اکثر ہنس کر کہتی۔

''بیگم صاحبہ یہ اپنے ابا جیسا ہے اس کا ابا اسی کے لیے کمانے ملک سے باہر گیا ہے اللہ کرے اسے اچھی سی نوکری مل جائے۔''

رشیدہ ایک ہنس مکھ لڑکی تھی اور تقریباً شمع کی ہم عمر تھی۔شمع حاجت کے لیے اٹھ کر جیسے ہی کھڑی ہوئی تو اس کو چکر آ گئے اور اسی دوران اس نے رشیدہ کی گھٹی گھٹی چیخ کی آواز سنی شمع نے گھبرا کر جو نیچے دیکھا تو وہاں خون ہی خون تھا۔

اسی شام شمع کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن مردہ شمع صدمے سے نڈھال ہو گئی تھی۔شاہد نے بچے کو دیکھا تو آنسو اس کی آنکھوں سے جاری ہو گئے۔

اب وہ خاموش خاموش سی رہنے لگی اس بار بھی اس کی گود خالی تھی اس کا بچہ ایک اندھیری کوٹھڑی سے نکل کر دوسری میں جا سویا تھا۔شمع اب گڈو کے ساتھ کھیلتی رہتی اُسے اپنی گود میں لے کر اپنی ممتا کی تسکین کر لیتی۔رشیدہ جو اب ان کے گھر کا فرد بن گئی تھی۔وہ دن رات شمع کو تسلیاں دیتی اور گڈو کو زیادہ وقت اسے ہی دے دیتی۔گڈو ایک ہنس مکھ اور خوبصورت بچہ تھا۔وہ ہر ایک کے ساتھ فری تھا شاہد' شمع' شرفو' چوکیدار سب اُسے پیار کرتے تھے۔شمع تو اُسے اتنا پیار کرتی تھی کہ کبھی کبھی رشیدہ کہتی تھی۔

''بیگم صاحبہ آپ تو بالکل اسی کی ماں بنتی جا رہی ہیں گڈو کو سارے کپڑے کھلونے سب کچھ لے کر دیتی ہیں وہ بالکل امیروں کے بچوں کی طرح رہتا ہے۔'' رشیدہ یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔

''رشیدہ.....'' شمع نے رشیدہ کو مخاطب کیا۔جو گڈو کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔اس کے چہرے پر ممتا کا نور تھا۔

''جی بیگم صاحبہ.....'' رشیدہ نے شمع کی طرف دیکھا جو نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

''رشیدہ ہم.....ہم.....تم سے کچھ مانگنا چاہتے ہیں۔''

''میں غریب آپ کو کیا دے سکوں گی۔'' رشیدہ نے شمع کے اداس چہرے کی طرف دیکھا اور بڑے دکھی لہجے میں بولی۔

''رشیدہ.....ہمیں.....ہمیں گڈو دے دو۔''

شمع نے رُکتے رُکتے آخر اپنی بات کہہ ہی دی رشیدہ بے چاری خلاف توقع سوال سن کر گڑبڑا سی گئی چند لمحے خالی خالی نظروں سے شمع کو دیکھتی رہی پھر بولی۔

Digitized by Google

''بیگم صاحبہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''رشیدہ ہم میاں بیوی گڈو کو اپنا بیٹا بنائیں گے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے زندگی کی تمام آسائشیں مہیا کریں گے۔'' شمع امید بھری نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''بیگم صاحبہ میں تو ماں ہوں ایک باپ بھی اپنی اولاد کسی کو دے نہیں سکتا۔'' رشیدہ نے سنجیدگی سے صاف جواب دیا۔

''ہم گڈو کو خوش رکھیں گے بلکہ جب یہ جوان ہوجائے گا تو اپنی ساری جائیداد اس کے نام کردیں گے۔'' شمع کو اب بھی امید تھی۔

''بیگم صاحبہ ہماری تو تمام دولت ہماری اولاد ہوتی ہے۔ جب پیٹ میں بھوک تن پر پورا کپڑا نہ ہو تو اولاد کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر سب غم ختم ہوجاتے ہیں' اس کی معصوم ہنسی سن کر۔'' رشیدہ گڈو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''رشیدہ تمہارے پاس بڑا بچہ بھی تو ہے اور ویسے بھی تم گڈو کے قریب ہی تو رہو گی۔'' شمع نے آس بھرے لہجے میں کہا۔

''یہاں..... بیگم صاحبہ میں اگر یہاں رہتی تو ایسا ضرور کرتی مگر آپ کو تو پتہ ہے نہ کہ گڈو کا ابا باہر گیا ہوا ہے اور اس کی اچھی سی نوکری بھی لگ گئی ہے اور اس نے خط میں لکھا ہے وہ کچھ دن میں آکر مجھے لے جائے گا اور بچوں کو بھی تب ہم گڈو کو چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں۔

وہ کمانے ہی ان کے لیے گیا ہے تاکہ یہ پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جائیں۔'' رشیدہ نے شمع کو سمجھاتے ہوئے ٹکا سا جواب دیا اور شمع کو گم صم دیکھ کر گڈو کو لے کر اپنے کوارٹر میں آگئی شمع گڈو کو حسرت سے دیکھتی رہی۔

اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اس نے نڈھال ہوکر کرسی سے سر ٹیک دیا موٹے موٹے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

''ٹر..... ٹر..... فون کی گھنٹی بجتی.....

''صبح ہی صبح کس کا فون ہے۔'' شمع نے ریسیور اٹھایا دوسری طرف عجیب شور سا تھا جیسے رونے کی آواز آرہی ہو۔

''ہیلو..... ہیلو.....'' کریم بابا کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''بیٹا..... وہ جلدی سے چھوٹے صاحب کو لے کر یہاں آیئے بڑے صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔''

''کیا.....؟'' شمع کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور ریسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''شمع..... شمع کیا ہوا..... کیا ہوا..... شمع.....'' شاہد چیخ سن کر تولیہ لیے باتھ روم سے باہر آیا۔ شمع تو بت بنی کھڑی تھی۔ شاہد کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے ریسیور اُٹھا کر ہیلو ہیلو کہا۔

''چھوٹے صاحب جلدی سے گھر آجائیں بڑے صاحب کا دل بند ہونے کی وجہ سے انتقال ہوگیا ہے۔''

کریم نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''کیا.....؟'' شاہد کو کمرا گھومتا ہوا محسوس ہوا لیکن دوسری طرف سے کریم ریسیور رکھ چکا تھا چند لمحے شاہد یونہی کھڑا رہا خود کو سنبھالنے کے بعد شمع کی طرف متوجہ ہوا جو ساکت کھڑی تھی شاہد نے شمع کو کاندھوں سے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔

''شمع..... شمع..... شمع ابا جان چلے گئے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے' تمہیں ثوبی سے بڑھ کر چاہنے والے چچا جان تمہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں تم روتی کیوں نہیں ہو شمع..... شمع.....'' شاہد نے شمع کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا لیکن وہ گم صم سی اسے دیکھتی رہی نہ منہ سے کچھ

Digitized by Google

بولی اور نہ آنکھوں سے کوئی آنسو گرا تب شاہد اس کی گود میں سر رکھ کر سسک پڑا مگر وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔

شاہد اسے اپنے ہمراہ لیے جاوید منزل آ گیا جہاں اس کی ماں کی حالت بھی ابتر تھی اور انہیں بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ماں کی خالی کلائیاں دیکھ کر شاہد کا دل دکھ سے بھر گیا ثوبیہ کے ہوش و حواس کھو چکے تھے شمع کو دیکھ کر ثوبیہ آگے آئی اور اس سے لپٹ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

لاش کو غسل دے دیا گیا اور آخری دیدار کے لیے لانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

لیکن شمع ایسے بیٹھی تھی جیسے نہ وہ کچھ سن رہی ہو نہ دیکھ رہی ہو کچھ دیر بعد آخری دیدار کے لیے شاہد شمع کو لاش کے قریب لایا شمع اپنے چاچا کے منہ کو دیکھنے لگی۔

''بھابی جان ابا ہم سے آخری بار ملنے آئے ہیں..... بھابی..... کچھ..... تو بولیے..... دیکھیے بھابی جان ابا ہم سے روٹھ گئے..... ہیں..... یہ جا رہے ہیں..... ہم..... سب کو..... سب کو..... چھوڑ کر.....'' ثوبی یہ کہتے کہتے نڈھال ہو گئی۔ شمع کے ہونٹوں پر لرزش ہوئی۔

''نہیں..... نہیں..... میرے پیارے ابو..... مجھ سے بات تو کیجیے..... میں صدقے ابو مجھ سے بات تو کیجیے مجھ کو تسلی تو دیجیے۔'' شمع روئی ایسا روئی کہ نارو نے والوں کو بھی رلا دیا۔ جنازہ اٹھانے کے وقت مشکل سے شمع کو جنازے سے الگ کیا گیا وہ تھی کہ بس روئی جا رہی تھی بہت سارے دن یونہی گزر گئے اب سب ہی اپنی جگہ سنبھل گئے تھے لیکن شمع ذرا بھی نہ سنبھلی تھی جاوید صاحب کی چیزوں سے لپٹ لپٹ کر روتی' نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ ذرا سا رونے پر بھی بیہوش ہو جاتی

اسی بات کے پیش نظر شاہد نے شمع کو منع کر دیا۔

''تم کچھ دن گھر پر آرام کرو امی کی طرف مت جاؤ۔'' وہ شمع کی ذہنی حالت سے پریشان تھا۔

دوسرے روز شمع جب برآمدے میں چیئر پر بیٹھی تھی۔ رشیدہ کو اکیلا دیکھ کر بولی۔

''رشیدہ.....''

''جی بیگم صاحبہ۔'' وہ بہت خوش معلوم ہو رہی تھی اور اس نے کپڑے بھی نئے پہنے ہوئے تھے۔

''تم آج گڈو کو نہیں لائیں۔'' شمع بولی۔

''نہیں جی..... وہ گڈو کا ابا آ گیا ہے نہ اس کے پاس ہے کل لے کر آؤں گی۔''

''اچھا..... تو تمہارا شوہر کب آیا۔'' شمع اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''وہ جی تین روز ہوئے ہیں اسے آئے ہوئے وہ ہمیں لینے آیا ہے۔''

شمع کو خاموش دیکھ کر رشیدہ کچن میں چلی گئی۔

دوسرے دن شمع گڈو کو دیکھ کر کھل سی گئی جو نئے کپڑوں میں بالکل گڈے جیسا لگ رہا تھا۔ ان دو تین دنوں میں وہ جیسے اور بھی پیارا ہو گیا تھا۔ شاید اسے ماں باپ دونوں کی محبت ملی تھی اس لیے گڈو شمع کو معصوم چمکدار آنکھوں سے دیکھ کر مسکرایا۔ شمع کے لبوں پر بھی بے اختیار ہنسی آ گئی اور گڈو کو اس نے سینے سے لگا لیا جیسے وہ اس کا اپنا بچہ ہو اور لان میں پھولوں کے کنج میں کھڑے ہوئے شاہد نے اتنے عرصے بعد شمع کو ہنستا دیکھ کر ایک اطمینان کا سانس لیا۔

شمع کا زیادہ وقت اب گڈو کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہنستی اور مسکراتی رہتی۔ رشیدہ بھی آتے ہی گڈو شمع کو دے دیتی جو کہ منتظر ہوتی گڈو کی کبھی کبھی گڈو شمع کے کپڑے بھی خراب کر دیتا تو وہ ذرا بھی برا نہ مانتی اور اس کے کپڑے چینج کرواتی اور

Digitized by Google

شاہد جہاں خوش تھے وہاں دل ہی دل میں پریشان بھی رہتا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ رشیدہ دو چار دنوں میں چلی جائے گی اور گڈو بھی ساتھ لے جائے گی۔ پھر کیا ہوگا کہیں شمع بھی بیمار نہ ہو جائے اور بس وہ یہی سوچ کر رہ جاتا۔

''بیگم صاحبہ کل سے میں کام پر نہیں آؤں گی۔'' رشیدہ مخاطب ہوئی۔

''کیوں.....'' شمع نے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

''وہ جی گڈو کے ابا کے ساتھ ہم لوگ جا رہے ہیں۔''

رشیدہ نے جواب دیا شمع خاموش رہی اور گڈو کی طرف دیکھنے لگی جو کہ اس کی گود میں بیٹھا اس کے دوپٹے سے کھیل رہا تھا۔

''ابھی جا کر تیاری بھی کرنی ہے گڈو کا ابا انتظار کر رہا ہے' لائیے گڈو مجھے دے دیجیے۔'' وہ ہاتھ پھیلائے آگے بڑھی۔

''گڈو یہ میرا گڈو ہے تم کو کیوں دوں؟ وہ ہذیانی انداز میں چیخ کر بولی۔

''ہٹ جاؤ میرے قریب مت آؤ۔'' شمع کی آنکھوں میں عجیب سی سختی تھی۔ رشیدہ کا دل دہل سا گیا۔

''بیگم صاحبہ..... مذاق مت کیجیے لائیے میرا بچہ مجھے دے دیجیے۔'' رشیدہ بے زاری سے بولی۔

''خبردار جو میرے بچے کو ہاتھ لگایا۔'' شمع نے زور سے رشیدہ کو دھکا دیا کہ وہ فرش پر جا گری اور شمع جلدی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''صاحب جی..... صاحب جی..... بیگم صاحبہ کو روکیے۔'' رشیدہ چیخنے لگی۔ شور سن کر شاہد دوڑتا ہوا آیا۔

''کیا بات ہے رشیدہ؟'' وہ شمع کو دیکھنے لگی جو گڈو کو گود میں لیے اوپر جا رہی تھی۔

''صاحب جی میرا بچہ گر جائے گا..... میرا بچہ مجھے لا دیں..... میرا بچہ.....'' رشیدہ حواس باختہ ہو رہی تھی۔

''شمع..... شمع.....'' شاہد پکارتا ہوا اس کے پیچھے جانے لگا۔

''خبردار میرے قریب مت آنا ورنہ میں یہاں سے چھلانگ لگا دوں گی۔'' اتنا سرد اور بیگانہ لہجہ شاہد وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا بال بکھرے..... چہرے پر دہشت آنکھوں میں بیگانگی شاہد اندر ہی اندر لرز گیا اتنے میں مالی اور شرفو بھی بھاگتے ہوئے آئے رشیدہ کی آواز سن کر.....

''کیا ہوا کیا بات ہے۔'' دونوں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

''بیگم صاحبہ..... میرا بچہ اوپر لے گئی ہیں اور مجھے دے نہیں رہیں' شاہد وہ پاگل ہو گئی ہیں۔''

''پاگل.....'' دونوں کے منہ سے نکلا اور وہ جنگلے کے قریب کھڑی شمع کو دیکھنے لگے جو گڈو کو اپنے سینے سے لگائے تھپک رہی تھی۔ شاہد نے پھر جونہی آگے بڑھنے کی کوشش کی شمع پھر چیخی۔

''میرے قریب مت آنا..... تم لوگ دشمن ہو..... میرے اور میرے بچے کے..... میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' اور ساتھ ہی قریب رکھا گلدان نیچے دے مارا جو کہ مالی کے پیر پر گرا۔

''صاحب جی..... آپ زینے سے اوپر جا کر پیچھے سے بیگم صاحبہ کو پکڑ لیں رشیدہ بچہ چھین لے گی۔ میں اور مالی یہاں کھڑے ہیں۔'' شرفو نے آہستہ سے شاہد کو کہا۔

اور شاہد رشیدہ کو دیکھ کر پچھلی جانب چلے گئے۔ جونہی شاہد نے اچانک پیچھے سے شمع کو کھینچا مالی اور شرفو دوڑ کر اوپر آ گئے۔ بڑی مشکل سے گڈو کو اس کی

Digitized by Google

گود سے لیا جو ہراساں ہوکر رو رہا تھا۔ رشیدہ گڈو کو لیے بھاگتی ہوئی گیٹ سے باہر چلی گئی اور شمع بری طرح شاہد کی گرفت میں مچل رہی تھی اور چلا کر کہہ رہی تھی۔

''مجھے چھوڑو مجھے..... چھوڑو مجھے..... میرا بچہ..... میرا بچہ.....'' اور شاہد کی گرفت سے آزادی پا کر تیزی سے زینہ اترنے لگی اس کا پیر پھسل گیا اور ہاتھ گملوں پر جا لگا اور نیچے لڑھکتی ہوئی آئی اور گملے بھی اس کے اوپر گرنے لگے شاہد اس کو پکڑنے کے لیے بھاگا۔

آخری زینے پر آ کر وہ خود ہی رک گیا اس کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا اس کے بال بری طرح سے بکھر گئے تھے اور وہ مسلسل رو رہی تھی اور بین کر رہی تھی۔

''میرا بچہ..... میرا بچہ.....'' آس پاس کے سب لوگ کھڑکیوں اور دیواروں سے جھانکنے لگے۔

پھر وہ بے ہوش ہو کر وہیں لڑھک گئی۔ شاہد نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کو اپنی بانہوں میں اٹھایا اور اندر لا کر بستر پر لٹا دیا۔ پھر وہ ڈاکٹر کو فون کرنے لگا۔ گھر والے سب شمع کی حالت کو لے کر پریشان تھے۔

ڈاکٹر نے آخر جب شمع کا معائنہ کیا تو اُس نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ شمع کے دل کی دھڑکن بند ہو چکی ہے' یہ خبر سن کر تمام افراد گنگ رہ گئے۔ شاہد کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ شمع بہت حساس تھی مگر وہ اپنے دو بچوں کی وفات پر اتنی دل برداشتہ اور مایوس تھی نہیں جانتا تھا۔

یوں ایک ہنستا بستا گھر حسرت اور یاس کی تصویر بن گیا۔ وہ لڑکی جو زندگی کی ہر تکلیف سے لڑتی رہی اپنی خالی گود کا دکھ نہ سہ سکی اور منوں مٹی تلے جا سوئی۔

☆☆.....☆☆

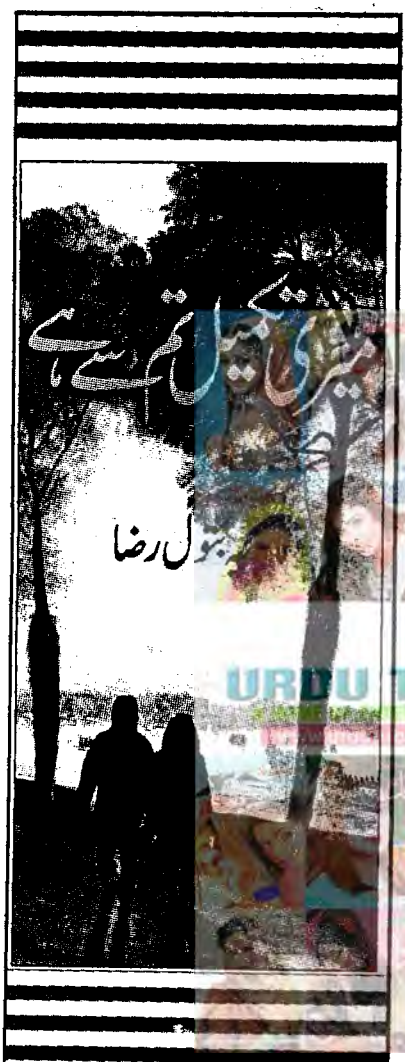

نازیہ بتول رضا کی شاعری کی کتاب 'میری تکمیل تم سے ہے' شائع ہو گئی ہے۔

قیمت=/200

URDU TUBE
Digitized by Google

رحیم یار خان سے ارسال کردہ سبق آموز تحریر

متاع حیات

وہ لڑکے بہت شیطان تھے مگر جلد انہیں احساس ہو گیا کہ وقت ضائع کرنے والی شے نہیں.....

فدا شاہین بھٹی

''ماجد تجھے کتنی بار منع کیا ہے اتنا شور شرابہ نہ کیا کر پڑوس والے کیا کہیں گے۔'' ماں جی نے ناشتہ بناتے ہوئے ماجد کو تاکید کی جو اپنے بھائی واجد سے زور و شور سے بحث کر رہا تھا۔

''پتر دھیرے بولا کر تو بالکل اجڈ لوگوں کی طرح بات کرتا ہے واجد کو دیکھ کیسا سمجھدار ہے پر تجھے پتہ نہیں کب سمجھ آئے گی۔''

''ماں جی میں تو بس اس کو بتا رہا تھا کہ ایک دن میں جیپ خریدوں گا اور خوب تیز چلاؤں گا۔ آپ دونوں کو بھی ساتھ بٹھاؤں گا۔''

''نہ بھئی نہ میں تو تمہارے ساتھ نہیں بیٹھوں گا تمہیں کون سا گاڑی چلانی آتی ہے۔'' واجد نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''ناشتہ تیار ہے دونوں بھائی ناشتہ کر لو ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' ماں نے باورچی خانے سے آواز دی۔

''پیاری ماں آپ کی نافرمانی کر کے دوزخ میں نہیں جانا چاہتا چھوٹے کو لے کر آ رہا ہوں ناشتہ چارپائی پر رکھ دیں۔'' ماجد نے باہر سے جواب دیا۔

دونوں بھائی ناشتہ بھی کر رہے تھے اور ساتھ مہ میں کچھ بڑبڑا بھی رہے تھے۔

''ابو سے کہیں ہم دونوں کو موٹر سائیکل خرید کر دیں ہمارے دوستوں کے پاس بھی موٹر سائیکل ہے۔'' ماجد نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان کی سفارش مت کرنا مجھے موٹر سائیکل کا شوق نہیں میرے لیے سائیکل ہی بہتر ہے۔'' واجد نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں سفارش نہیں کر سکتی کیونکہ ابھی تمہاری عمر لکھنے پڑھنے کی ہے اور اچھے بچے ضد نہیں کرتے اور دیکھ واجد کتنا سمجھدار ہو گیا ہے۔'' ماں نے چارپائی سے برتن اٹھاتے کہا۔

''اس کی باتوں پر امی دھیان مت دو بس سفارش کر دیں ورنہ شوروم سے قسطوں والا موٹر سائیکل لے کر آ جاؤں گا۔ پھر قسطیں ابو خود دیتے رہیں گے۔'' ماجد نے چائے کا کپ ماں کو دیتے ہوئے کہا۔

''ماجد اوئے واجد یار ذرا باہر آؤ۔'' ماجد کے دوست حاکم نے باہر سے آواز دی اور باقی دوست شاہ

Digitized by Google

نواز، لقمان اور شعبان بھی ان کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار تھے۔

''امی یہ پھر دوستوں کے ساتھ گھومنے جا رہا ہے۔'' واجد نے کہا۔

''مت جاؤ گھومنے تمہیں پڑھنے کی اتنی فکر نہیں جتنی گھومنے پھرنے کی ہے اور مجھے تمہارے دوست پسند نہیں۔'' ماں نے باورچی خانے سے جواب دیا۔

''وہ نکل گیا ہے آپ کس کو ہدایت کر رہی ہیں۔'' واجد نے باہر جاتے کہا۔

''نہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے نہ پڑھنے کی فکر نہ کام کی فکر صرف فکر ہے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اللہ پاک انہیں ہدایات دے کہ تعلیم کی طرف توجہ دیں۔'' ماجد کی ماں گھر کا کام بھی کرتی رہی بولتی بھی رہی۔ حاکم ماجد دونوں الگ اور وہ تینوں ایک موٹر سائیکل پر زوں زوں ڈر ڈر کرتی موٹر سائیکلیں اپنے سفر کی جانب رواں دواں تھیں کہ اچانک رُک گئیں۔ ماجد نے کہا۔

''کیا بات ہے ایکدم بریک کیوں لگ گئے؟''

''یار میانوالی کا دوست مشیر یاد آ گیا ہے۔'' حاکم نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار مجھے بھی..... اُس نے کہا تھا جب فرصت ملے اپنے دوستوں کو لے آنا۔'' ماجد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یارو میں نے رات کو ہر حال میں روجھان واپس جانا ہے ورنہ گھر والے مجھے کہیں نہیں جانے دیں گے۔'' لقمان نے منہ بگاڑ کر کہا۔

''ہم دونوں ضرور واپس آئیں گے۔'' حاکم اور شاہ نواز بولے۔

''ہمارا کام ہے گھومنا پھرنا کون سا پڑھ لکھ کر آفیسر بنیں گے جو تعلیم کے بارے میں سوچیں چلو اسٹارٹ کرو موٹر سائیکل ورنہ دیر ہو جائے گی اور کشتی دریا پر نہیں ملے گی۔'' ماجد نے قہقہہ لگاتے ہوئے

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

Digitized by Google

کہا۔ پھر سب دوست مثیر کے گھر پہنچ گئے۔

مثیر کے گھر سے کچھ فاصلے پر دو کمروں پر ایک خوبصورت ڈیرہ تھا پکی اینٹوں سے کمرے بنے تھے کمروں کے آگے بہت بڑا باغ تھا اور باغ کے درمیان میں نیم کے گھنے سایہ دار درخت اور کناروں پر رنگ برنگے پھول ڈیرے کی خوبصورتی میں اضافہ کررہے تھے۔

خیر خیریت پوچھنے کے بعد مثیر اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ تو لقمان نے کہا۔

''ہم کھانا گھر جا کر کھائیں گے۔'' مثیر نے موٹر سائیکل کی چابی نکالتے ہوئے کہا۔

''دوستوں سالن تیار ہے لیکن صرف روٹیاں پکانی ہیں اور تم سب پہلی بار آئے ہوئے میرے ڈیرے پر کھانا کھائے بغیر نہیں جاسکتے۔ اللہ پاک کا خاص کرم ہے یہ نصیب کی بات ہے سیانے کہتے ہیں دانے دانے پر لکھا ہے کھانے والے کا نام۔'' مثیر نے گھر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد کھانا کھانے کے بعد سب دوست کشتی پر پہنچ گئے۔ شاہ نواز اجازت لیتے ہوئے بولا۔

''بھائی جان مہربانی کر کے کبھی ہماری طرف بھی آئیں تاکہ دوستی کا سلسلہ شروع ہوسکے اور سلسلے جو چل پڑے ہیں اب انہیں ٹوٹنے نہیں دیں گے اور سلسلے قسمت والوں کے بنتے ہیں۔'' پھر دوستوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆.....☆.....☆

گھر پر واجد بار بار ماں کو تنگ کررہا تھا۔

''امی آپ بھائی کو باہر جانے سے روکتی کیوں نہیں دوسروں کی موٹر سائیکل پر سوار ہوکر چلا جاتا ہے۔ اندھیری راتیں ہیں ابھی تک واپس نہیں آیا ہے رات کو جن بھوت حملہ کرتے ہیں۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جنات سے محفوظ رہنے کے لیے اس کے گلے میں صورۃ یٰسین کا تعویذ ہے دوسرا جن بھوت چڑیلیں اکیلے آدمی پر حملہ کرتے ہیں یہ پانچ لڑکے ہیں اور وہ بھی موٹر سائیکل پر تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اللہ پاک حفاظت کرے گا۔'' ماجد کی ماں نے کھانا پکاتے کہا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا یہ دونوں راستہ بھول گئے میدان ریتیلا تھا اور موٹر سائکل خراب نہ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہورہی تھی اور نہ ہی ہیڈ لائٹ جل رہی تھی۔ راستہ اندھیری رات میں نظر نہیں آرہا تھا گھپ اندھیری رات سنسان ویران جگہ پر انہیں ہوا کی سرسراتی آوازیں خوف زدہ کررہی تھیں۔

''یار میں نے کہا تھا جلدی مت کر دوستوں کے ساتھ چلیں گے لیکن تو نے ضد کی اب ہمارے ساتھ کیا ہوگا جنات حملہ کریں گے یا ڈاکو حملہ کریں گے اور وہ گھر پہنچ گئے ہوں گے ہم دونوں اِدھر چڑیلوں کی خوراک بنیں گے۔'' ماجد نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''خود تو ڈر رہا ہے مجھے مت ڈرا ورنہ ہمیں اندھیری رات کو جنات سے بچانے کون آئے گا۔'' حاکم نے چوکنے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ باقی تینوں دوست روجھان کے قریب جاکر رکے تو حاکم اور ماجد دونوں اس جگہ موجود نہ تھے۔ تینوں پریشان ہوگئے۔

''ہم گھر والوں کو کیا جواب دیں گے۔'' شاہ نواز بولا۔

''یار وایسا کرتے ہیں روجھان شہر سے دو ٹارچ خرید لیتے ہیں پھر ان دونوں کا پیچھا کرتے ہیں جس طرف موٹر سائیکل کے نشان جائیں گے ہم اُسی طرف ہی جائیں گے۔'' شعبان نے دونوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''بھائی آپ کی تجویز درست ہے موٹر سائیکل بھی روجھان کسی دوست کے گھر کھڑی کرتے ہیں اور انہیں پیدل ٹارچ کے ذریعے تلاش کرتے ہیں اور

Digitized by Google

ٹارچ کی لائٹ کی وجہ سے وہ جلدی مل جائیں گے۔"
لقمان نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"یارو جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو ورنہ وہ کسی بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے۔" شاہ نواز نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ پھر تینوں نے موٹر سائیکل دوست کی دکان پر کھڑی کی اور ٹارچ خرید کر چل پڑے وہ دونوں رات کو آسمان کے تاروں کو دیکھتے رہے اور خوفناک آوازوں سے ڈرتے رہے صرف کلمہ شریف کا ورد ان کی زبان سے جاری تھا۔ تینوں نے کافی سفر کرنے کے بعد ان کے موٹر سائیکل کے ٹائر کے نشان تلاش کیے اور ٹارچ کی لائٹ میں ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ اب تینوں اللہ پاک سے دعا مانگتے جارہے تھے۔

"اے میرے اللہ پاک سب کی حفاظت کرنے والے ان کی حفاظت کرنا ہم نہ سمجھ ہیں آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے جس سے ہمارے بزرگ ناراض ہوں گے۔"

"یارو ایسا کرتے ہیں باری باری انہیں آواز دیتے ہیں تاکہ ہماری آواز سن کر جواب دیں۔" شعبان نے ڈرنے والے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے ایسا ہی کرتے ہیں۔" لقمان نے دونوں کو تسلی دی۔ پھر تینوں نے باری باری بلند آواز میں نام لے کر پکارنا شروع کردیا۔ حاکم ماجد نے اپنے نام کی صدائیں گونجتے سنی تو ڈر کے مارے حلق خشک ہوگئے اور جواب نہ دے سکے۔ ماجد نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارے دوست نہیں ہیں یہ جنات ہیں اُن کی آواز میں ہمیں بلا رہے ہیں دیکھ نہیں رہا کتنی خوفناک آوازیں آرہی ہیں۔"

"تُو تو ڈرپوک ہے اور ساتھ مجھے بھی ڈرا رہے ہو ضرور وہ لوگ ہمیں تلاش کررہے ہوں گے کیونکہ وہ ہمارے بچپن کے دوست ہیں اور وہ کبھی بے وفا نہیں ہوسکتے۔" لقمان نے گرجدار آواز میں کہا۔

"ہم یہاں ہیں ان گھنے درختوں کے درمیان....." کچھ دیر بعد وہ تینوں نے انہیں تلاش کرلیا۔ انہیں دیکھ کر وہ دونوں خوشی سے کودنے لگے اور لڑتے جھگڑتے رات کو دیر سے گھر پہنچ گئے صبح ہوئی تو پانچوں دوستوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ آوارہ گردی نہیں کریں گے۔ شاہ نواز نے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہم تو کاغذوں میں خوشبو تلاش کرتے رہے لیکن خوشبو تو پھولوں سے آتی ہے۔ ہم آوارہ سڑکوں پر موٹر سائیکلوں پر وقت برباد کررہے ہیں ماں باپ جو کہتے ہیں وہی سچ ہے آج عہد کرتے ہیں کہ اسکول پڑھنے جانا ہے۔" شعبان نے ٹھنڈی آہیں بھرتے کہا۔

"جس کو اسکول پڑھنا ہے وہ شوق سے پڑھے لیکن میں نہیں پڑھ سکتا۔" ماجد نے کہا۔

"وہ کیوں بھائی جان جنات سے انتقام لینا ہے۔" شاہ نواز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے پڑھنے کا شوق ہوتا تو تم لوگوں کے ساتھ کبھی بھی آوارہ نہ گھومتا بلکہ اسکول پڑھ رہا ہوتا اور دوسرے بچوں کو بھی اسکول جانے کی ہدایت کرتا لیکن مجھے باورچی بننے کا شوق ہے اور باورچی بن کر دکھاؤں گا اور اچھے کھانے بنانے کا تجربہ کروں گا۔" ماجد نے کہا۔

"میرے بھائی تم اگر پڑھ لکھ جاؤ گے تو پھر شیف کہلاؤ گے' سفید وردی اور بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کرو گے کام کوئی برا نہیں لیکن اگر تعلیم کے ساتھ ہو تو اور نکھر جاتا ہے۔"

پھر سب نے شوق سے پڑھنا شروع کردیا اور دوسروں کو بھی ہدایت کرنے لگے بچوں اسکول پڑھو گے تو آفیسر بنو گے ورنہ سڑکوں پر گاڑیوں کے شیشے صاف کرتے پھرو گے یا ہوٹلوں میں بیرا گیری کرو گے۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

میاں چنوں سے ارسال کردہ تحریر

ٹھگوں کا شکار

انسان کو لالچ ہی لے ڈوبتی ہے اور

ایسا ہی ڈیرے والوں کے ساتھ ہوا.....

مہر پرویز احمد دولو

پورا ٹبر فراڈیوں پر مشتمل تھا۔ دھوکہ دہی اور لوٹ مار دھڑلے سے کرتے تھے جرم کرتے وقت یوں بے خوف ہو جاتے جیسے تہی دامن رات کو نڈر ہو کر سفر کرتے ہیں۔ ان کی دیدہ دلیری اس وقت بڑھی جب ان کا امیدوار وزارت کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ جس جگہ ہر چیز برائے فروخت ہو وہاں مالدار بیوپاری اگر خالی ہاتھ لوٹے تو اس جیسا بدقسمت کوئی نہیں۔

جو شخص لوگوں کی رائے فکر' سوچ' عقیدت بریانی کی پلیٹ اور چند ٹکوں کے عوض خریدنے کا ہنر جانتا ہو وہ بھلا پاکستان میں الیکشن کیسے ہار سکتا ہے۔

برائے فروخت کا ریٹ اس کی منشا کے مطابق ہو تو وہ خود بیوپاری کے پاس چل کر جاتا ہے۔

جس ملک کے ایم پی اے سینیٹ کے الیکشن میں کروڑوں کے عوض بک جائیں' وہاں کے شہری ہزاروں کے عوض بک جائیں تو کوئی اچنبھے والی بات نہیں یہ لوگ ایک دوسرے کو تلاش ایسے کر لیتے ہیں جیسے..... کبوتر باز کبوتر باز' نشئی منشیات فروش کو' چور مال کو' جواری جوئے کے اڈے کو' پولیس ڈاکوؤں کو' خانہ بدوش خالی پلاٹ کو' سواری بس کو اور کراچی میں نامعلوم سمت سے آنے والی گولی معصوم جیتے جاگتے شہری کو.....

ان کے چہیتے کروڑ پتی سیاستدان کے وزیر بنتے ہی اس ٹبر کے ہاتھ پاؤں اور سر گھی میں یوں ڈبکیاں لینے لگے جیسے جلیبی گرم گھی میں' گلاب جامن اور رس گلے چینی کے شیرے میں ڈوب کر منہ اور جسم پر مٹھاس کی تہہ چڑھا لیتے ہیں۔ اس سنہری دور کو مفاد کے لیے استعمال کرنے کے لیے یہ لوگ نیزے سے لکڑی کا 'کلا' اکھاڑنے والے شاہ سوار کی طرح سرپٹ دوڑنے والے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر دونوں ہاتھوں سے معصوم لوگوں کو لوٹنے لگے۔

کبھی نوکری دلوانے کا جھانسہ' کبھی تھانے سے ایف آئی آر خارج کروانے کا دعویٰ' کبھی

Digitized by Google

بے نظیر انکم سپورٹ کارڈ بنوا کر دینے کا جھانسہ' عدالتوں سے ریلیف سے لے کر گیس' پیٹرول اور تیزاب بیچنے کا لائسنس بنوا کر دینے کا وعدہ تک کرتے' اسلحہ لائسنس' ممنوعہ اشیا بیچنے کے پرمٹ' بیرون ملک کے ویزے' غرض ہر کام کرنے کا دعویٰ یوں کرتے جیسے اے سی بس کا ٹکٹ خریدنا ہو۔ اپنے شکار کو اس کی حیثیت کے مطابق نشانہ بناتے۔

چھوٹی موٹی نوکری سے لے کر ویزوں تک لوگوں کو پھانس رکھا تھا اگر کوئی بے چارہ کام نہ ہونے کی صورت میں رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتا تو تھانے والوں سے میل ملاپ کر کے چھترول کرواتے اور کچھ بے چارے تو جیل تک پہنچ جاتے اُلٹا ان کی منت سماجت اور مزید کچھ دے کر فلاح پاتے۔

☆.....☆.....☆

باپ بیٹے نے نئی کرولا کرائے پر لی' گھر کی دو خواتین کو ساتھ لیا اور شکار کی تلاش میں ایک منصوبے کے تحت دور کے علاقے میں جا پہنچے۔

شہر سے دور کچی سڑک پر گاڑی موڑی اور انجانی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ راستے میں برلب سڑک خوبصورت کوٹھی نما مکان دیکھا ساتھ ہی مہمانوں کے لیے ڈیرہ بنایا گیا تھا گائے اور بھینسوں کا باڑہ جانوروں سے بھرا ہوا تھا باڑے کے اندر ہی چارے کی کولیاں بنی ہوئی تھیں پانی پلانے کے لیے بجلی والی موٹر لگی ہوئی تھی اتنا خوشحال گھرانہ دیکھ کر ان لوگوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ فوراً ہی اُن کو ٹھگنے کا پروگرام بنایا۔

گاڑی کو سڑک کنارے بند کیا ڈیرے پر پہنچ کر یوں عرض گزار ہوئے۔

''ہم لوگوں کے دریا پار عزیز رہتے ہیں ان کو ملنے جا رہے تھے کہ یہاں گاڑی خراب ہو گئی ہے

URDU TUBE

Digitized by Google

اپنی سی کوشش کی ہے لیکن گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہمارے ساتھ فیملی ہے اگر برا نہ مانیں تو آج رات قیام کرنے دیں کل سورج نکلتے ہی قریبی شہر سے مستری لائیں گے اگر ابھی کوئی مستری آپ کی نگاہ میں ہے تو ابھی بلوالیں ہم منہ مانگی اجرت دیں گے۔''

یہ من گھڑت کہانی سنا کر ڈیرے والے لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا خواتین کو دیکھ کر یہ سیدھے سادھے لوگ ترس کھا گئے۔

ایک آدمی قریبی اسٹاپ سے گاڑیوں کا مستری لینے چلا گیا جبکہ ان مہمانوں کی سیوا میں دیگر لوگ مصروف ہو گئے۔

کافی دیر بعد مستری آیا اور آتے ہی گاڑی کا بونٹ کھول کر نقص تلاش کرنے لگا مستری پکا اور سچا مسلمان حلال کی کمائی کھانے والا تھا۔ وائرنگ کی تاروں کو بیٹری سے الگ کر کے اِدھر اُدھر جوڑ دیا پھر پہلے والی حالت میں جوڑ کر اوپر سلوشن ٹیپ لگا دی۔

خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر دو کا لگوایا دو چار جھٹکوں کے بعد گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔

اپنے تئیں اس نے مالکوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دو ہزار کا بل بنا دیا جبکہ وہ باپ بیٹا کاریگر کی استادی پر دل ہی دل میں محظوظ ہوئے جس نے ٹھیک گاڑی کا دو ہزار روپے کا بونٹ کھولنے کا بل بنا دیا۔

حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے ان لوگوں نے دو ہزار بل اور ایک ہزار انعام دیا جبکہ مستری بلا کر لانے والے کو بھی ایک ہزار روپے دیا۔ اتنے بڑے سخی اور رحمدل دیکھ کر ڈیرے والوں کی آنکھیں عقیدت سے جھک گئیں خلوص کے اتنے معترف ہوئے کہ زبردستی رات کو قیام کرنے پر مجبور کر دیا ساری رات جی بھر کر ان کی خدمت کی۔

باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو ان لوگوں نے اپنا بنا ہوا جال ان سادہ لوگوں پر یوں پھینکا۔

''ہمارا ویزوں کا کاروبار ہے بیرون ملک لوگوں کو بھیجتے ہیں اب تو ہمارے خاندان دیار غیر اپنا کاروبار کرتے ہیں ہوٹلوں فیکٹریوں اور کمپنیوں کے مالک ہیں یہاں دریا پار ہمارے عزیز رہتے ہیں ان کے دو ویزے آئے تھے ہم نے سوچا ویزے دینے کے بہانے ان کو مل بھی آئیں گے رات کا کھانا آپ کے ہاں ہمارے مقدر میں لکھا تھا ورنہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔''

مرچ مصالحہ لگا کر لمبی چوڑی جائیداد کروڑوں کا بزنس اور ہر بڑے شہر میں ٹریول ایجنسی کے دفاتر بتائے۔

بیرون ملک کا نام سنتے ہی سادہ لوگوں کی آنکھوں کی پلکوں پر خوشیوں کے قطرے ٹمٹمانے لگے' خیالات کی رو میں ان کی طرح نوٹوں کی گڈیاں لاپرواہی سے خرچنے کے خواب دیکھنے لگے باتوں کے دوران ایک نوجوان دیار غیر جانے کے لیے منت سماجت کرنے لگا۔

''آپ نے ہم مسافروں پر مہربانی کی انتہا کر دی ہے ہم آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔'' اسے پاسپورٹ بنوانے کا کہا۔ اگلی صبح میزبانوں کی دعاؤں اور التجاؤں کو سمیٹتے کچھ دن بعد آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

احسان کے بوجھ تلے دبے یہ احسان مند لوگ قیمتی تحائف اور پھلوں کی پیٹیوں اور مٹھائی کے ڈبوں کے ساتھ ایک بار پھر اسی ڈیرے پر

Digitized by Google

آئے۔ میزبانوں نے دیکھا تو آنکھیں خوشی سے خیرہ ہوگئیں۔

ملنے اور احوال پوچھنے کے بعد پاسپورٹ لیا' تحائف میزبانوں کے حوالے کیے اور چلے گئے۔ اگلے ہی ہفتے ویزا لے کر ڈیرے پر پہنچے ایک دن مہمانی سے لطف اندوز ہوئے اور اگلے دن متعلقہ نوجوان کو ساتھ لیا اور ایئرپورٹ سے دیار غیر بھیج دیا۔

تھوڑے دنوں کے بعد اس نوجوان کا خط آ گیا وہ خیریت سے ملائیشیا پہنچ گیا تھا کام جاتے ہی مل گیا اور اب وہ بہت خوش تھا گھر والوں کو بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کا کہا خط پانے پر گھر والوں کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ دو ہفتے بعد وہ مہربان پانچ ویزے لے کر اسی ڈیرے پر پہنچ گئے۔ انتہائی کم پیسوں کے عوض مزید پانچ آدمی غیر ملک پہنچ گئے۔

ڈیرے والوں کا فخر دیدنی تھا ارد گرد علاقے کے لوگوں نے سنا تو ان کی منتیں ترلے کرنے لگے۔ منہ مانگے پیسوں کے عوض ویزے کے لیے منت سماجت کرنے لگے۔

''بیرون ممالک بھیجنے والے ہمارے قریبی عزیز ہیں اب کی بار آئے تو تمہارے لڑکوں کے بارے میں بات کریں گے۔ تم پاسپورٹ بنوا کر تیار رکھو تمہارا کام ہو جائے گا۔''

ڈیرے والے اب لوگوں کو اپنے طور پر مطمئن کرنے لگے ساتھ ہی ان کی دوستی پر فخر بھی کرنے لگے۔ فراڈیے بیرون ممالک نوجوانوں سے رابطے میں تھے۔ جونہی پہلی تنخواہ گھر پہنچی وہ پھر آ دھمکے اور آخری پتہ بادشاہ پھینک کر سب کچھ لوٹنے کا فیصلہ کیا۔

ڈیرے پر ان کی پذیرائی یوں کی گئی جیسے وہ ان نگری کے اَن داتا' مائی باپ اور لوگوں کی خوشیوں کے سپہ سالار ہوں۔ گاڑی سے اترتے ہی پلکوں پر بٹھا کر ڈیرے کے خصوصی کمرے میں بٹھایا گیا۔ ان کے سامنے قالین پر خواتین و حضرات کیڑوں مکوڑوں کی طرح بیٹھ گئے۔ آج تو وہ کوئی ماورائی مخلوق نظر آ رہے تھے جن کی دید زندگی کی خوشیوں کی ضمانت تھی۔

''اب کی بار کمپنی کو دو سو نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ پاکستانی تین لاکھ روپے تنخواہ ہے اضافی ٹائم کی تنخواہ الگ سے ملے گی دو سال بعد پہلی چھٹی ایک ماہ ملے گی پانچ سال تک کا معاہدہ ہے ویزا خود بخود تجدید ہو جائے گا۔ چونکہ مدت زیادہ ہے لیکن قیمت ویزا صرف تین لاکھ روپے ہے۔

آپ ہمارے اپنے اور بہت پیار کرنے والے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے آپ کو آفر پیش کر رہے ہیں ورنہ ہزاروں نوجوان بیرون ملک جانے کے لیے تیار ہیں۔''

پہلے سے گھڑی کہانی نہایت چمکدار اور قیمتی مستقبل کے سپنوں کی تہہ میں ان کو سنائی اتنی بڑی آفر سن کر ڈیرے والے تو آسمان کی وسعت میں کھو گئے زندگی کی تمام مایوسیوں خوشیوں میں تبدیل ہوتی نظر آئیں۔ ڈیرے پر گویا بھونچال آ گیا لمحوں میں خبر پورے علاقے میں پھیل گئی۔

دو ہفتے کا وقت دیا گیا لوگ پاسپورٹ اور رقم کے انتظام میں جت گئے۔

تیسرے ہفتے وہ فرشتہ سیرت انسان آئے چھ کروڑ کی ناقابل یقین رقم اور دو سو پاسپورٹ ہاتھوں میں تھامے گاڑی میں بیٹھے اور ایسے رفو چکر ہوئے کہ آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

ننکانہ صاحب سے ارسال کردہ پُرمزاح تحریر

حاجی میاں

ایسی کہانی جو آپ کے چاروں طرف پھلجھڑیاں بکھیر دے اور آپ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائیں' مگر پھر دھیرے سے کوئی کہے گا انسانوں سے محبت کرو.....اور فلاح پاؤ.....

عامر شہزاد

کافی عرصہ پہلے میں نے یہ گانا سنا تھا۔

''دنیا میں کتنا غم ہے میرا غم کتنا کم ہے لوگوں کے غم دیکھا تو میں اپنا غم بھول گیا۔'' تب تو میں اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا مگر اب معلوم ہوا کہ واقعی دنیا غموں سے بھری ہوئی ہے جب ہم دوسروں کا دکھ سنتے ہیں تو علم ہوتا ہے کہ ہمارا غم دوسروں کی نسبت بہت کم ہے کسی کو اولاد کسی کو محبت اور کسی کو دیگر غم' میرا یہ کہانی لکھنے کا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا یا مذاق اڑانا نہیں ہے بلکہ میں ایک ایسے شخص کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے دنیا میں شاید ہی کوئی خوشی دیکھی ہو ہزاروں غم ملنے کے باوجود نہ صرف خود ہمیشہ خوش رہا بلکہ دوسروں کو بھی خوش رکھا اپنی عجیب عادات سے لوگوں کو اس طرح خوش رکھا کہ 'شغلی میاں' اور حاجی میاں کے لقب سے بھی مشہور ہوئے۔

حاجی میاں کا اصل نام عاشق تھا وہ فیصل آباد کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے اُن کا پیشہ پھل فروشی اور محنت مزدوری تھا۔

نیز وہ ہمارے دور کے رشتہ دار تھے۔ کچھ لوگ ان کو میاں جی کے نام سے بھی پکارتے' ان کے بارے میں اکثر سنا تھا کہ وہ بہت اچھے' خوش خوراک اور خوش مزاج انسان ہیں کبھی ان کی بھی پوری فیملی ہوتی تھی مگر حوادث زمانہ نے ان سے سب کو انہیں دنیا میں اکیلا کر دیا۔ وہ جتنا کماتے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے گاؤں میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس پر حاجی میاں نے کوئی احسان نہ کیا ہو۔

میری ان سے پہلی ملاقات انکل عمران کے گھر ہوئی میں ان کی تعزیت کرنے کی غرض سے ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ حاجی میاں بھی اسی مقصد کے لیے وہاں آ گئے چھوٹا قد' صحت بہت بہتر' سر پر لمبی ٹوپی' توند باہر نکلی ہوئی اندر آتے ہی بلند اور رعب دار آواز میں اتنا لمبا سلام کہا جیسے کوئی سپاہی کسی بڑے آفیسر کو گارڈ آف آنر پیش کر رہا ہو۔

موصوف کے ہاتھ میں تقریباً چار سیب اور

Digitized by Google

درجن کیلے تھے سلام کرنے کے بعد وہ انکل کی طبیعت دریافت کرنے لگے جنہیں ٹائیفائڈ بخار تھا وہ نفسیاتی مریض بھی تھے اگر کبھی معمولی سا بخار بھی ہو جاتا تو خاندان بھر کو وصیت کی غرض سے اکٹھا کر لیتے۔ حاجی میاں نے آتے ہی ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے ذرا توقف کے بعد بولے۔

''ارے عمران کیا بتاؤں کہ تمہیں کیا مرض ہے ارے اسی مرض نے میرے بڑے بھائی کو اتنا تنگ کیا کہ قبر میں بھیج کر ہی دم لیا اور اس بات کو اتنے غمگین اور دردناک انداز سے بیان کیا کہ حاجی میاں اور عمران انکل دونوں کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

چاروں سیب اور سات کیلے نوش فرمانے کے بعد حاجی میاں بولے۔

''عمران بابو لگتا تو نہیں کہ یہ بیماری تمہیں جیتا چھوڑے' مگر پھر بھی میری دعا ہے کہ تم بھلے ہو جاؤ انکل پہلے ہی نفسیاتی دباؤ کا شکار تھے۔'' حاجی میاں کی باتیں سن کر وہ تو بے ہوش ہی ہو گئے البتہ کافی کوششوں کے بعد ہم انہیں ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔

کسی رشتہ دار کی شادی پر میری امی نے حاجی میاں کو بتایا کہ میرے بیٹے نوید کی شادی ہے لہٰذا آپ بھی ضرور تشریف لائیے گا پھر موصوف پندرہ دن قبل ہی حاضر ہو گئے اور بولے۔

''دراصل میں نے آنا تو وقت پر ہی تھا مگر پھر سوچا یتیم بچے کی شادی ہے تمام ضروری انتظامات کرنے ہیں اسی لیے جلد چلا آیا ان کا

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com

Digitized by Google

بستر میرے کمرے میں ہی لگا دیا گیا مجھے انہی سے معلوم ہوا کہ انہوں نے حج نہیں کیا بلکہ وہ حج کے دن پیدا ہوئے اسی نسبت سے ان کا نام حاجی پڑ گیا اور داڑھی رکھنے کی وجہ سے ساتھ میاں کا اضافہ بھی ہو گیا تقریباً رات کے ایک بجے حاجی میاں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اس انداز میں گفتگو کرنے لگے جیسے کسی سے لڑ رہے ہوں میں نے پریشانی کے عالم میں ان سے پوچھا۔

''خیریت تو ہے؟'' تو وہ غصے سے بولے۔

'' ارے بیٹا پریشانی کی کوئی بات نہیں دراصل میں تہجد گزار ہوں اور شیطان مجھے اٹھنے سے روکتا ہے اس لیے اس سے جھگڑ رہا تھا روزانہ اسی طرح اسے بھگاتا ہوں۔'' پھر میں تو سو گیا معلوم نہیں کہ وہ جاگے یا سو گئے البتہ فجر سے کچھ دیر پہلے اٹھ بیٹھے اور کسی کو سخت برا بھلا کہنے لگے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک فقیر کی اونچی صدا نے ان کی نیند خراب کر دی ہے وہ غصے سے بولے۔

'' ہندوستان میں جب کوئی فقیر مانگتا تھا تو انتہائی پست آواز میں رام بھلا کرے کچھ دے دو مگر یہاں تو فقیر اتنی اونچی آواز میں نعرہ لگاتا ہے کہ مردہ بھی اٹھ بیٹھے۔''

ان کی عجیب وغریب حرکات جاری رہیں اور شادی کا وقت آ گیا بارات کی روانگی کے وقت انہوں نے دلہا کے ساتھ کار میں بیٹھنے کی عجیب فرمائش کر دی اور زبردستی کار میں گھس گئے۔ نکاح کے بعد جب کھانے کا وقت آیا تو انہوں نے ایک ناقابل یقین اور نرالی بات کہہ ڈالی۔

''ہمارے ہاں رواج ہے کہ دولہا شادی کے دن کچھ بھی کھا پی نہیں سکتا جب تک کہ اپنے گھر واپس نہ پہنچ جائے۔'' یہ بات میرے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھی پسند کی شادی ہونے کی خوشی میں' میں گھر سے بھی کچھ کھا کر نہ گیا اور یہاں حاجی میاں نے میرا سب کچھ بند کروا دیا اور تو اور میرا رسمی دودھ بھی خود پی گئے اگر انہیں واش روم نہ جانا پڑتا تو میں شاید واقعی بھوکا رہ جاتا مجال ہے ذرا ایک لمحہ بھی میرے پاس والی کرسی سے اٹھے ہوں' میرے خاندان والے حیران تھے کہ آخر حاجی میاں یہ 'رسم بد' کہاں سے اٹھا لائے ہمارے ہاں تو ایسی کوئی رسم نہیں۔

واپسی پر تمام رسومات کے بعد جب میں حجلہ عروسی میں داخل ہونے لگا تو وہ فوراً نازل ہو کر بولے۔

''ارے نوید بیٹا ہمارے ہاں شادی کی پہلی رات 'سہاگ رات' نہیں ہوتی لہٰذا تمہیں آج باہر ہی سونا پڑے گا چلو ایک اور عذاب.....''

بقول حاجی میاں کہ ایک دن وہ کسی رشتہ دار کے ہاں گئے ہوئے تھے کہ انہیں ایسا لگا جیسے گلی میں کوئی جنازہ جا رہا ہے وہ فوراً کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو گئے اور کسی اجنبی سے کہنے لگے۔

''ارے بھائی بہت افسوس ہوا ویسے مرنے والے کو ہوا کیا تھا؟'' وہ حیرت اور غصے سے بولا۔

''او بھائی پاگل ہو گیا؟ یہ جنازہ نہیں برات جا رہی ہے۔'' اس سے پہلے کہ ان کی اچھی خاصی عزت افزائی ہوتی انہوں نے وہاں سے کھسکنا ہی غنیمت جانا۔

پھر وہ اکثر ہمارے گھر آتے جاتے رہتے ایک دن میں ٹی وی پر لتا اور رفیع کے گانے سن رہا تھا میاں جی بھی سنتے رہے تقریباً ایک گھنٹے بعد بولے۔

''نوید بند کر دو ٹی وی کو کیوں گناہِ عظیم میں

Digitized by

حصہ لے رہے ہو؟'' میں نے ان کی بات سنی اَن سنی کر دی اور کہا۔

''جلدی بند کر دیتا ہوں۔'' اور گانے سنتا رہا اسی وقت باہر ایک دوست مجھے ملنے آ گیا اور میں باہر نکل گیا ابھی میں دروازے پر اسے سلام ہی کہہ رہا تھا کہ اوپر میرے کمرے سے ایک خطرناک دھماکے کی آواز آئی میں دوڑ کر اپنے کمرے میں گیا کیا دیکھتا ہوں ٹی وی ٹوٹا پڑا ہے اور میاں جی کھڑے کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر توبہ کر رہے تھے میری بیوی' گھر والے حتیٰ کہ ہمسائے بھی آوارد ہوئے کہ اللہ خیر کرے یہ دھماکہ کس چیز کا ہوا ہے میں نے میاں جی کی طرف دیکھا تو وہ بڑے اطمینان سے بولے۔

''بیٹا میں نے تو تمہیں کہا تھا کہ اسے بند کر دو تم نہیں مانے تو میں نے توڑ ڈالا ارے میں تم لوگوں کو چھوڑ کر کیسے اکیلا جنت میں جا سکتا ہوں۔'' جہیز میں ملنے والا بالکل نیا سونی کا ٹی وی ٹوٹنے پر میری بیوی غصے میں تھی البتہ مہربانی کر کے خاموش ہی رہی۔

غصہ تو ہم سب کو بہت تھا ایک تو نقصان ہو گیا دوسرا محلے میں ہمارا مذاق بن گیا مگر صبر کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا میاں جی ہر کسی کی خوشی غمی پر ضرور شامل ہوتے دل کے بہت اچھے تھے ہر ایک کے لیے قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے بالخصوص یتیم بچوں کی خفیہ امداد کرتے جوان لڑکیوں کی شادی کے لیے ہر ممکن مدد کرتے مساجد میں پڑھنے کے لیے قرآن مجید رکھواتے قبرستانوں میں پانی کا انتظام کرواتے غرضیکہ وہ ہر طرح سے بندگان خدا سے محبت کرتے مگر جس رشتہ دار کے گھر جاتے مہینوں وہی جمے رہتے ان کی اس عادت سے سبھی خائف رہتے۔

ایک بار ہم زیارتوں پر پاکپتن شریف جا رہے تھے بس میں میاں جی بھی موجود تھے انہوں نے قوالی بند کروادی کیونکہ بقول ان کے اس میں شرکیہ الفاظ شامل تھے اور سارے مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کر کے انہیں فقہ اسلام کی تعلیمات دینے لگے پھر یکدم ہی موضوع بدل لیا کبھی کسی سے سوال پوچھتے دنیا میں سمندر کتنے ہیں؟ کسی سے سب سے بڑے پلیٹ فارم اور کسی سے عجیب و غریب سوالات کرتے ان کی آواز اتنی اونچی تھی کہ سب مسافر با آسانی سن سکتے تھے ان کی اگلی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر اماں جی بڑی دیر سے ان کی عجیب باتیں سن رہی تھیں جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو انتہائی حقارت اور غصے سے میاں جی سے کہنے لگیں۔

''کیسے نرالے انسان ہو منہ پر اتنی بڑی داڑھی رکھی ہوئی ہے کوئی اللہ رسول ﷺ کا نام لو تم کیا دریا' سمندر اور پلیٹ فارموں کی باتیں کر رہے ہو کم از کم آواز ہی کم کر لو کیا ہمارے کانوں کے پردے پھاڑنے کا ارادہ ہے۔''

میاں جی بھی بڑے غصے سے بولے۔

''ارے بی بی میں اسی طرف آ رہا ہوں جس طرف آپ کہہ رہی ہیں ویسے اللہ نے آپ کو بالکل ٹیڑھی پسلی سے بنایا ہے۔'' بڑی مشکل سے ہم نے اماں جی کا غصہ ٹھنڈا کروایا۔

ہمارے قافلے میں ایک دوست ندیم بھی تھے بوجہ حادثہ ان کو ایک ٹانگ مصنوعی لگی ہوئی تھی رات کو سب باہر صحن میں ہی سو گئے ندیم نے سونے سے پہلے اپنی مصنوعی ٹانگ اتار کر اپنے پاس رکھ لی صبح اٹھ کر معلوم ہوا کہ ان کی ٹانگ غائب ہے سارا صحن چھان مارا سب سے پوچھ لیا مگر وہ نہ ملی البتہ میاں جی آرام فرماتے رہے

Digitized by Google

جب سب تھک ہار کر بیٹھ گئے تب میاں جی اٹھے اور اپنے سرہانے سے ٹانگ اٹھا کر بولے۔

''ارے ندیم میاں مجھے رات کوئی تکیہ نما چیز نہیں ملی تو میں نے تمہاری ٹانگ استعمال کر لی البتہ اب فارغ ہے لے لو۔''

اگلے دن ہم سب ان کو اپنے سامان کی حفاظت پر بٹھا کر کسی اور مزار پر زیارت کرنے چلے گئے جب واپس آئے تو ایک کونے میں میاں جی آنکھیں بند کیے دعا مانگ رہے تھے اور ایک بڑا ہجوم ان کے پاس بیٹھ کر ان کی دعا پر آمین کہہ رہا تھا اور ساتھ ہی میاں جی کے پاس روپے بھی وافر مقدار میں جمع ہو رہے تھے میاں جی اونچی اور درد بھری آواز میں اور رو رو کر ایسے دعا مانگ رہے تھے جیسے کوئی پیرو مرشد اپنے مریدوں کے لیے دعا کرتے ہیں پھر ہم بھی لوگوں کے ہجوم میں بیٹھ گئے اور میاں جی کی دعا سننے لگے۔

میاں جی نے پونے گھنٹہ بعد دعا ختم کر کے آنکھیں کھولیں اور اپنے اردگرد بہت سے لوگ بیٹھے دیکھے وہ لوگ ان کو پیر سمجھ کر ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگانے اور پاؤں دبانے لگے پھر میاں جی غصے سے بولے۔

''ارے تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو میں تو نماز عصر کے بعد اپنے لیے دعا مانگ رہا تھا جاؤ سب اپنی اپنی نماز پڑھو اور اپنے لیے خود دعا کرو میں کوئی پیر فقیر نہیں مجھے کیوں گناہ گار کرتے ہو۔''

البتہ قریب پڑی ہوئی اچھی خاصی رقم اکٹھی کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے بولے۔

''یہ روپے واپس کرنا مناسب نہیں کسی غریب کے کام آئیں گے۔'' کچھ عرصہ بعد میں نے کچھ کزنز کی دعوت کی نا جانے میاں جی کو کہاں سے بھنک پڑ گئی وہ بھی آوارد ہوئے ہم پانچ لوگ کھانے کی میز پر موجود تھے میاں جی نے چاول پلیٹ میں ڈالنے کی بجائے ڈش ہی کھینچ لی اور سالن سے بھرا پورا برتن ہی چاولوں پر ڈال لیا تقریباً پانچ منٹ بعد ڈش ختم کر کے کوک کی بڑی بوتل کھول کر منہ سے لگائی اور بغیر سانس لیے اسے ختم کر کے ہی دم لیا۔

انتہائی خوش خوراک ہونے کی وجہ سے وہ جوڑوں کے درد اور موٹاپے کا شکار ہو گئے تھے کھانا ہمیشہ ضرورت سے زیادہ کھا لیتے ورزش سے محروم رہتے اس لیے انہوں نے کھانا ہضم کرنے کے لیے ایک نرالی ترکیب نکالی بیڈ پر بالکل سیدھا بیٹھ کر اتنے زور سے ہلتے معلوم ہوتا جیسے ابھی بیڈ ٹوٹ جائے گا اور ساتھ بیٹھے لوگوں کو زبردست زلزلے کی سی کیفیت محسوس ہوتی۔

وہ جیسے بھی تھے پورا خاندان ان سے محبت کرتا تھا 7 ستمبر 2018ء کو اچانک مجھے فون کال آئی کہ میاں جی کا انتقال ہو گیا ہے یہ واقعی ہمارے لیے بہت بری خبر تھی ان کے جنازے میں پورا گاؤں بلکہ ملحقہ علاقوں سے بھی بہت بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے جنازہ گاہ لوگوں سے بھر گئی۔

یہاں تک کہ لوگوں کی قطاریں دور دور تک پھیل گئیں ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس پر میاں جی کا کوئی احسان یا نیکی نہ ہو سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

جب دفنانے سے پہلے ان کا آخری دیدار کیا گیا تو چہرہ پُرسکون، مسکراتا ہوا اور پُرنور نظر آ رہا تھا واقعی ان جیسے لوگ لاکھوں میں ایک ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

کراچی سے ارسال کردہ تلخ سچائی

مقصد حیات

بیٹا اور بیٹی دونوں اللہ کی عطا کردہ بیش قیمت نعمتیں ہیں مگر کچھ کم نظر اور بے عقل لوگ ان میں بھی فرق کر لیتے ہیں.....

نازیہ بتول رضا

میں بہت بدبخت ہوں پھر بھی اماں نے میرا نام خوش بخت رکھا شاید یہ سوچ کر کہ میرا نصیب اچھا ہو کچھ نام کا اثر میری شخصیت پر پڑے لیکن اگر ایسا ہوتا تو ہر کوئی اپنی بیٹی کا نام خوش بخت یا شہزادی ہی رکھتا۔

خیر اس گھر میں شہزادی بن کر رہنا تو بہت مضحکہ خیز بات تھی کیونکہ اس ایک کمرے کے گھر میں زندگی جانوروں سے بدتر تھی کجا کہ شہزادیوں کی طرح رہنا.....

میں کوئی اکلوتی تو تھی نہیں میرے علاوہ چار بہنیں اور تھیں ہم کل چھ بہن بھائی تھے جس میں پانچ بہنیں اور ایک بھائی تھے ہم بہنیں بڑی تھیں بھائی چھوٹے تھے۔

دراصل بیٹے کی آس میں ہی ابا نے یہ لمبی لائن لگائی تھی نجانے لوگ بیٹوں کی اتنی چاہ کیوں کرتے ہیں کیا بیٹے ماں باپ کے لیے جنت کی بشارت ہیں' یا پھر ماں باپ کے سکھ چین کی ضمانت ہیں؟ میں جانتی ہوں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

بلکہ جہاں تک میں نے دیکھا ہے تو ماں باپ کے ہر دکھ سکھ میں بیٹیاں ہی ماں باپ کے ساتھ کھڑی ہوتی ہیں ان کی راز دار ہوتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیٹیاں تو پرائی ہوتی ہیں انہیں دوسرے گھر جا کر اسے آباد کرنا ہوتا ہے لیکن میں کہتی ہوں کہ یہ بیٹیاں ہی ہوتی ہیں کہ جو پرائی ہو کر بھی اپنی ہوتی ہیں جو دور ہو کر بھی ماں باپ کے دل کے قریب ہوتی ہیں۔

بیٹیاں کمزور ہو کر بھی بہت باہمت اور طاقتور ہوتی ہیں بڑی سے بڑی مشکل کا سامنا بڑی بہادری سے کرتی ہیں اور ماں باپ کو اپنی تکلیف کا احساس بھی نہیں ہونے دیتیں بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ پاک بیٹیوں سے نوازتا ہے لیکن اس خوش قسمتی کا ادارک ہر ایک کو نہیں ہوتا لوگ بیٹیوں کو بوجھ سمجھتے ہیں جبھی تو بیٹے کی آس لگاتے ہیں اور بیٹیوں کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

Digitized by

جبکہ اللہ پاک نے بیٹیوں کو رحمت قرار دیا ہے لوگ اللہ سے رحمت طلب تو کرتے ہیں لیکن جب اللہ پاک بیٹی کی صورت میں ان پر رحمت نازل فرماتا ہے تو اس سے خوش ہونے کے بجائے منہ پھیر لیتے ہیں کتنے ناشکرے ہوتے ہیں وہ لوگ جو بیٹیوں سے پیار نہیں کرتے ان کی قدر نہیں کرتے بلکہ انہیں نظر انداز کر کے اپنی ساری محبتیں' چاہتیں بیٹوں پر نچھاور کر دیتے ہیں وہ بیٹے جو بڑے ہو کر کسی قابل ہو کر ماں باپ کو پوچھتے بھی نہیں جو ماں باپ بڑے ارمانوں سے ان کے سر پر سہرا سجاتے ہیں یہ اپنے بیوی بچوں میں مگن ہو کر انہی ماں باپ کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ ماں باپ کو بوجھ سمجھ کر اولڈ ہاؤس کی زینت بنا دیتے ہیں اور پھر پلٹ کر خبر بھی نہیں لیتے کہ ہمیں زندگی بخشنے والے اس دنیا میں لانے والے بھی یہی ہیں یا زندگی کے دکھوں کو ڈھوتے ڈھوتے تھک کر خالقِ حقیقی سے جا ملے میں بھی کہاں سے کہاں بات لے گئی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی میری بدبختی کی' وہ اس لیے کہ بہنوں میں سب سے چھوٹی میں تھی یعنی پانچویں نمبر پر اور مجھ سے پہلے ہی چار بہنیں تھیں اس لیے جب میری آمد کا سلسلہ ہوا تو اماں ابا کو بیٹے کی قوی امید تھی بلکہ ابا تو ضد لگائے بیٹھے تھے کہ اب کی بار بیٹا ہی چاہیے ورنہ اماں کی خیر نہیں۔

Digitized by Google

اور اماں تو جیسے جلے پیر کی بلی بنی ہوئی تھیں ہر وقت بولائی بولائی پھرا کرتیں نجانے کتنی سوچیں ہزار اندیشے اور وسوسے ان کے ذہن میں منڈلا رہے تھے وہ جب پریشان ہوتیں تسبیح اور مصلہ سنبھال لیتیں اور رب سے لو لگا لیتیں اس کے حضور خوب گڑگڑاتیں' فریادیں کرتیں منتیں مانگتیں۔

''یا اللہ بس اس بار میری لاج رکھ لے مجھے ایک بیٹا دے دے پھر چاہے اس کے بعد بیٹی دے دینا میرے پاس پہلے ہی چار بیٹیاں ہیں میں غریب کیسے اتنا بوجھ اٹھاؤں گی اور اگر بیٹی کا منہ دیکھ کر میرے میاں نے مجھے طلاق دے دی تو میں اس عمر میں پانچ بیٹیوں کا بوجھ لے کر کہاں جاؤں گی' ماں باپ بھی سر پر نہیں ہیں' کون مجھے اور میری بیٹیوں کو سہارا دے گا الٰہی میرے حال پر رحم فرما۔ ماں کے آنسو بہنے لگتے تھے لیکن کہتے ہیں ناں کہ ہر کام میں اللہ پاک کی مصلحت ہوتی ہے اس میں انسان کی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے وہ اگر بہتر نہیں دیتا تو بہترین عطا فرماتا ہے بس ہم بندے ہی ناسمجھ ہیں جو اس کی مرضی اس کی رضا کو سمجھ نہیں پاتے اور ہر دم ناشکری ہی کرتے رہتے ہیں بس چاہتے ہیں کہ ہماری دعا لازمی پوری ہو جو چیز ہم چاہ رہے ہیں وہ لازمی ہمیں مل جائے کتنے ناشکرے ہیں ہم.....!

اماں کی ساری دعائیں' فریادیں اور منتیں بیکار گئیں اور میں اس دنیا میں آ گئی مجھے دیکھتے ہی اماں صدمے سے بے ہوش ہو گئیں ان کا بی پی ہائی ہو گیا اُن کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اور میں بدبخت اپنی بڑی بہن کی گود میں روتی رہی ابا نے مجھ سے منہ پھیر لیا مجھے گود میں لے کر پیار کرنا تو درکنار انہوں نے مجھے دیکھنا تک گوارا نہ کیا اور اللہ کی رحمت کی ناشکری کی۔

کہنے کو ابا پیش امام تھے ہر جمعہ کو لمبے لمبے خطبے دیا کرتے تھے لوگوں کو بڑی بڑی نصیحتیں کیا کرتے تھے لیکن خود اندر سے ان کا دل کالا تھا تبھی تو اماں کے ساتھ ظلم و ستم کیا کرتے تھے ہم بیٹیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے ابا نے کبھی ہمیں پیار نہیں کیا وہ کھل کر اپنی نفرت کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے لوگ ان پر تھوتھو کرتے میری بڑی بہنوں نے نجانے کیسے مجھے اس دن بہلایا اور سنبھالا اماں کی تو طبیعت ہی اتنی خراب تھی خیر اگلے دن اماں نے مامتا سے مجبور ہو کر مجھے گود میں لیا اور دودھ دیا وہ تو ماں تھی ناں اس لیے چپ چاپ میری پرورش کرنے لگی اس نے سارے شکوے شکایتیں اپنی ذات کے اندر دفنا دیں۔

اماں اور ابا میں سرد جنگ چھڑ چکی تھی ابا نے بالکل بات کرنا چھوڑ دیا تھا نجانے وہ نمازی پرہیزگار ہو کر بھی یہ بات سمجھ نہیں رہے تھے یا سمجھنا نہیں چاہ رہے تھے کہ اولاد دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ چاہے بیٹا دے یا بیٹی یہ اُسی کی عطا ہے بندہ اس کام میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا نہ ہی اپنی مرضی چلا سکتا ہے لیکن فی زمانہ یہ قصور عورت کا ہی سمجھا جاتا ہے جیسے بیٹی پیدا کر کے اس نے کوئی گناہ عظیم کر دیا ہو دوسری طرف یہ بات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے رزق اور اولاد بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے تو جب اللہ کے ہاتھ میں ہے تو قصوروار کوئی انسان کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کی سزا بندے کو کیوں دی جائے؟

لیکن یہ سب ابا کو کون سمجھاتا؟ وہ تو اماں کو ہر وقت پانچ بیٹیوں کا طعنہ مارتے کہ ان کی شادی کون کرے گا؟ ان کو کون کھلائے گا اماں لاکھ سمجھاتیں کہ اللہ نے انہیں دنیا میں بھیجا ہے تو ان کا

Digitized by

رزق بھی دے گا اور برکت بھی دے گا۔

مگر اماں زیادہ بولتیں تو مار کھاتیں اور ہم سب دیکھ جاتیں اماں اور بہنیں مجھے ابا سے چھپا کر رکھتی تھیں کیونکہ مجھے دیکھتے ہی ابا شدید غصے میں آجاتے تھے۔ اسی حبس زدہ نفرت بھرے ماحول میں' میں نے پرورش پائی اور میں دو سال کی ہوگئی اور پھر اللہ کو میری ماں پر رحم آ گیا اس کی آزمائش ختم ہوئی اور اماں نے ایک بیٹے کو جنم دیا شاید اس بار اماں نے بہت دل سے گڑگڑا کر دعا مانگی تھی اور کہتے ہیں کہ جب دعا دل سے اور یقین کے ساتھ مانگی جائے تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے یہی اماں کے ساتھ ہوا تھا جب اماں کو بیٹے کی پیدائش کا علم ہوا تو کچھ دیر تو وہ بے یقینی سے دائی کو دیکھتی رہیں پھر بے اختیار شکر الحمدللہ کہتے ہوئے ان کے آنسو چھلک پڑے ورنہ اس بار تو واقعی ابا اماں کو دھکے دے کر گھر سے ہی نکال دیتے مگر اللہ نے انہیں اس عمر میں ذلت و رسوائی سے بچالیا تھا۔

کمرے کے باہر میں اپنی بہنوں کے ساتھ سہمی ہوئی بیٹھی تھی سامنے ہی ابا بڑی بے چینی سے پورے صحن میں چکر لگا رہے تھے۔ تبھی دائی نے آکر بیٹا ابا کو تھما دیا اور مٹھائی مانگی ابا تو نہال ہوگئے فوراً جیب سے پیسے نکال کر دائی کو دیے اور بیٹے کو چومنے لگے ابا ایسے خوش تھے جیسے انہیں ہفتِ اقلیم مل گیا ہو میں بڑی حیرت و حسرت سے اپنے نومولود بھائی کو دیکھ رہی تھی جو ابھی ابھی اس دنیا میں آیا تھا اور ابا اپنی ساری محبتیں اس پر نچھاور کر رہے تھے جیسے لفظ باپ کا مفہوم بھی نہیں معلوم تھا اور ایک میں بدبخت تھی کہ دو سال سے اس گھر میں تھی لیکن کبھی باپ کا پیار نہ پا سکی تھی۔

بیٹے کے بعد اماں کے بھی نصیب جاگے ابا ان کا خیال رکھنے لگے ان کے لیے بہت سا میوہ اور پھل لے کر آئے اور میری بڑی بہنوں کو اماں کا خیال رکھنے کی تاکید کی اماں نے بھی ابا کو بدلتے دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔

نہیں بدلی تھی تو ہم بہنوں کی تقدیر نہیں بدلی تھی ہمارے نصیب کی دھوپ کبھی چھاؤں میں نہ بدل سکی ہمارے حصے کا سارا پیار بھائی پر نچھاور ہوجاتا بھائی اسی ناز و نعم میں پلنے لگا ابا کی تو آنکھ کا تارا تھا وہ.....وہ تھوڑا کھانے کے قابل ہوا تو ابا اسے گود میں لے جا کر ڈھیروں ڈھیر چیزیں دلاتے اور میں ترستی نظروں سے بس دیکھتی رہ جاتی۔

کبھی میرے سامنے آ کر اپنی جیب سے اس کے لیے ٹافیاں اور چاکلیٹ نکالے اور اسے دیتے میں بھی بڑی آس سے آگے بڑھتی کہ شاید آج ابا میرے لیے بھی کچھ لائے ہوں۔ لیکن ابا میری طرف دیکھے بنا ہی آگے بڑھ جاتے اور میں دل مسوس کر رہ جاتی کبھی کوئی بہن مجھے پیار سے گود میں اٹھا لیتی اور میرے غم کو دور کرنے کے لیے مجھے کپڑے سے بنی گڑیا سے بہلانے کی کوشش کرتی میں کبھی کبھی تو بہل جاتی لیکن کبھی کبھی ضد پر اڑ جاتی اور رونے لگتی اور اسی چیز کی فرمائش کرتی جو میرا بھائی کھا رہا ہوتا میری بہنیں میرا دکھ سمجھتی تھیں اس لیے اس جگہ سے ہٹا کر مجھے کھیل میں لگا لیتیں اور تھوڑی دیر رو کر میں وقتی طور پر سب بھول بھال جاتی لیکن کب تک.....!

یہ محرومیاں یہ جھڑکیاں میرے دل میں گرہیں لگانے لگیں میں ابا سے خود ہی دور دور رہنے لگی بڑی آپی مجھے اکثر جن اور دیو کی کہانی سنایا کرتی تھیں میں جب بھی وہ کہانی سنتی تو مجھے دیو کی شکل ابا سے مشابہ لگتی یا پھر ظالم جادوگر.....!

Digitized by Google

مجھے رفتہ رفتہ ابا سے چڑ ہونے لگی میں نے ان کے قریب جانا بھی چھوڑ دیا بس اپنے آپ میں اور اپنی گڑیا میں ہی مگن رہتی تھی اسی طرح ماہ و سال گزرتے رہے اور ایک ایک کر کے میری بہنیں اپنے اپنے گھر کی ہوگئیں میں ہر بہن کی شادی پر بہت روتی تھی کیونکہ میرا ایک ہمدرد کم ہو رہا تھا اور جس دن آخری بہن کی شادی تھی اس دن تو میں پورا دن اور پوری رات تکیے میں منہ گھسا کر بس روتی ہی رہی تھی میں نے اس دن کھانا بھی نہیں کھایا تھا رو رو کر میری آنکھیں سوج گئی تھیں اماں نے مجھ سے کھانے کا پوچھا میں نے منع کر دیا اس دن واقعی میں بہت اداس تھی لگتا تھا بھری دنیا میں' میں اکیلی رہ گئی ہوں اب میرا کوئی ہمدرد غمگسار نہیں رہا اب میں کس سے اپنے دل کی باتیں کروں گی؟ کس سے ابا کی شکایتیں کروں گی؟ کون میرے آنسو صاف کرے گا؟ کون میرے لاڈ اٹھائے گا؟ میں سچ مچ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

اور پھر میں نے خود کو کمرے تک ہی محدود کر لیا میں کسی سے فالتو بات نہیں کرتی تھی اور ویسے بھی اس گھر میں میری پرواہ کسے تھی بس تھوڑا سا اماں کو ہی میرا خیال آ جاتا تھا میں بھی ان کے کام میں ہاتھ بٹانے لگی تھی کیونکہ اماں کو کام کی عادت نہیں تھی سارا کام بڑی بہنیں ہی کرتی تھیں لیکن اب ان کی شادی کے بعد میں اور اماں مل کر کام کرتے تھے اسکول تو میں جاتی نہیں تھی ہاں مجھ سے چھوٹا بھائی انگلش میڈیم اسکول میں پڑھ رہا تھا بقول ابا کے اسے بڑے ہو کر افسر بننا تھا جبکہ میں لڑکی تھی اور مجھے پڑھانا ابا کے نزدیک پیسے کا زیاں تھا جو ابا کو کسی طور گوارہ نہ تھا۔

ابا جتنا چاہتے تھے کہ چھوٹا پڑھے اتنا ہی پڑھائی سے دور بھاگتا تھا ابا بڑی خوشامدیں اور منتیں کر کے اسے اسکول چھوڑنے جاتے اسے اس کی پسند کی بہت ساری چیزیں دلاتے تاکہ وہ خوشی خوشی اسکول جائے لیکن اس کے نخرے ہی نہیں ملتے تھے وہ بہت ضدی تھا اور یہ سب ابا کے بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ تھا ابا ہر خواہش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے بس اس کے منہ سے نکلنے کی دیر ہوتی تھی ابا بوتل کے جن کی طرح اس کی من پسند چیز اس کے روبرو کر دیتے اور ایک میں تھی میں بھی ان کی ہی اولاد تھی لیکن مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے بھی ابا اماں کا منہ دیکھنا پڑتا تھا کبھی کبھار اماں ہی ابا سے چھپ کر میری ضروریات پوری کر دیا کرتی تھیں ورنہ میں ترستی رہتی۔

پھر میں نے یہ احسان لینا بھی بند کر دیا میں نے گھر میں ہاتھ سے بنی چیزیں بنانا شروع کر دیں اماں سے کپڑے سینا سیکھ لیے اور سلائی کرنے لگی اس سے یہ ہوا کہ مجھے اپنی ضروریات کے لیے کسی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا تھا بلکہ کبھی کچھ پیسے اماں کو بھی دینے لگی تھی۔

دن ماہ و سال میں تبدیل ہوتے رہے اماں بیمار رہنے لگی تھیں میں اماں کا بے حد خیال رکھتی تھی لیکن اماں کو میری شادی کی فکر تھی اور ابا کو چھوٹے کی شادی کی' ایک دن اماں نے ابا سے اپنی یہ پریشانی بیان کر دی اور اگلے ہی دن ابا میرے لیے اپنے ہم عمر کا رشتہ لے آئے۔

عبدالغفار ابا سے عمر میں دو تین سال چھوٹا ہوگا اس کی بیوی ٹی بی کا شکار ہو کر مر چکی تھی جوان بچے تھے جو سب شادی شدہ تھے ابا نے ان سے میرے لیے رشتے کا کہا تو انہوں نے جھٹ سے خود کو پیش کر دیا اور ابا بنا سوچے سمجھے اس کو گھر تک

Digitized by

لے آئے اماں نے سنا تو فوراً منع کر دیا میں تو سکتے میں تھی کہ آخر ابا کو ہو کیا گیا ہے؟ کیا ان کی نظر میں میری کوئی حیثیت' وقعت نہیں کہ وہ ایک بوڑھے کا رشتہ میرے لیے لے کر آ گئے۔

لیکن میں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی کیونکہ ابھی اماں سلامت تھیں اور مجھے پکا یقین تھا کہ اماں یہ رشتہ کبھی نہیں ہونے دیں گی میں نے خود کو وقت کے دھارے پر بہنے دیا تھا۔

میں رات کو تکیہ آنسوؤں سے بھگوتی سوگئی تھی۔ وہ رات کا نجانے کون سا پہر تھا میری آنکھ شور سے کھلی تھی اماں اور ابا میں جھگڑا ہو رہا تھا وجہ ظاہر ہے کہ میں تھی۔ اماں کا احتجاجی لہجہ سنائی دیا۔

''آپ آخر سمجھتے کیوں نہیں ہیں؟ وہ بڈھا کسی طرح ہماری خوش بخت کے قابل نہیں عمر دیکھیں اس کی آپ کا ہی ہم عمر ہے' جوان بچے ہیں اس کے.....! ہماری خوش بخت سے بڑی بیٹی ہے اس کی' خود اس کو شرم نہیں آ رہی میری معصوم بچی کے لیے اپنا رشتہ دیتے ہوئے۔''

''کیوں اس میں بھلا شرم کی کیا بات ہے۔ بھئی وہ نکاح ہی کرنا چاہ رہا ہے ناں ہماری بیٹی کے ساتھ' کون سا بھگا کر لے جا رہا ہے وہ کہ تم اتنا واویلا مچا رہی ہو۔ اور میری مانو تو اس غربت میں اس رشتے کو غنیمت ہی جانو بھلا کون لڑکا ہے جو بغیر جہیز کے ہماری بیٹی کو لے جائے گا۔ یہ تو غفار صاحب کی نیکی ہے کہ وہ کسی قسم کا مطالبہ نہیں کر رہے بلکہ دو کپڑوں میں تمہاری لڑکی کو اپنے گھر کی عزت بنا رہے ہیں اور تم ہو کہ ناشکری اور کفرانِ نعمت کر رہی ہو۔''

ابا اس وقت مجھے بے حد خود غرض اور بے حس لگ رہے تھے انہیں بس اپنے سر سے بلا ٹالنی تھی کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی آئے چوکھا.....!

میرے دل میں ابا کے لیے نفرتوں کے سمندر بہنے لگے اور بے بسی کے دو آنسو بہہ کر میرے آنچل میں جذب ہو گئے۔ تبھی اماں کی تیز آواز مجھے واپس لے آئی۔

''آپ کچھ بھی کہیں چھوٹو کے ابا..... لیکن آج میں اپنی خوش بخت کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دوں گی میں اپنی بیٹی کی شادی کسی قیمت پر اس بڈھے سے نہیں کروں گی۔'' اماں ہٹ دھرمی سے بولیں آج وہ میرے لیے ابا کے سامنے ڈٹ گئی تھیں۔

مجھے آج احساس ہو رہا تھا کہ اماں بھی مجھ سے پیار کرتی ہیں اور بھلا کیوں نہ کرتیں آخر میں اولاد تھی اُن کی' میرا دل اماں کی محبت میں سرشار ہونے لگا۔ دل میں اماں کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

اماں کو مجھ سے کتنا پیار ہے وہ ابا سے میرے لیے لڑ رہی تھیں احتجاج کر رہی تھیں چلو کوئی تو ہے جس کو میرا احساس ہے' جسے میرے احساسات و جذبات کی پرواہ ہے' ورنہ پیدائش کے بعد سے اب تک میں نے جیسے ایک بوجھ کی مانند زندگی گزاری ہے ہر کوئی مجھے بے کار اور احساس سے عاری ہی سمجھتا تھا میں کبھی کسی کو بتا ہی نہیں سکی کہ میں بھی ایک گوشت پوست سے بنی ایک جیتی جاگتی لڑکی ہوں۔ میں بھی اپنے اندر کچھ احساسات و جذبات اور خواہشات رکھتی ہوں۔ مجھ میں بھی چاہے جانے کی خواہش مچلتی ہے۔ لیکن میں کبھی کسی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ سب کچھ چپ چاپ سہتی رہی۔ ساری زیادتیاں برداشت کرتی رہی یہاں تک کہ میری ذات کے اندر میری خواہشات ایک ملبے کی صورت اختیار کر گئیں۔

Digitized by Google

میرا وجود جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

اور اب یہ نئی مصیبت یا اللہ ابا کو عقل دے میری محبت ان کے دل میں ڈال دے ان کے ارادے کو بدل دے' میں دل ہی دل میں اپنے رب سے فریاد کر رہی تھی۔ اپنی تقدیر پر نوحہ کناں تھی لیکن شاید میری تقدیر بھی مجھ سے روٹھی ہوئی تھی اور قدرت.....! وہ نجانے کیوں میری حالتِ زار پر خاموش تھی۔ نجانے اب میری زندگی میں کیا ہونے والا تھا۔ تبھی ابا کی چنگھاڑتی آواز مجھے سوچوں کے گرداب سے نکال لائی۔ وہ اماں کی زبان درازی مزید برداشت نہیں کر پائے تھے اور ان کا ہاتھ ماں کے رخساروں پر سرخ نشانات چھوڑ گیا تھا۔

''بدتمیز..... زبان دراز میرے آگے زبان چلاتی ہے' تیری اتنی جرأت..... بس میں نے زبان دے دی ہے اب خوش بخت کی شادی غفار سے ہی ہوگی سمجھی تو..... ہونہہ بڑی آئی میرے آگے منہ کھولنے والی۔'' ابا نے اماں کی چٹیا کو جھٹکا دے کر اماں کو ایک لات رسید کی اور اماں دور جا گریں۔

میں دروازے کی جھری میں سے سب دیکھ رہی تھی۔ اماں گر کر چوٹ لگنے سے بری طرح کراہ رہی تھیں ان کے ماتھے سے خون جاری ہوگیا تھا بس اس سے آگے میں نہیں دیکھ سکی اور دوڑ کر اماں کو اٹھایا۔ ابا نخوت سے اماں کو دیکھ رہے تھے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''سمجھا لے اپنی ماں کو میرے آگے زبان نہ کھولا کرے ورنہ اس عمر میں میرے ہاتھوں مار کھائے گی اور تو بھی کان کھول کر سن لے تیری ایک نہیں چلے گی جہاں میری مرضی ہوگی وہیں تیری شادی ہوگی۔'' لہجہ بڑا کٹیلا اور نفرت انگیز تھا جس کی کڑواہٹ میں نے اپنے اندر تک اترتی محسوس کی۔

''ہونہہ شادی.....'' میں نخوت سے بولی۔

'' میرے ارمانوں کے جنازے کو میری خواہشات کی موت کو اگر تم شادی کہتے ہو ابا..... تو میں تیار ہوں ایسی شادی کے لیے..... اور ویسے بھی کیا فرق پڑتا ہے ایک بے بس اور مردہ انسان کو کسی کے بھی پلے باندھ دو۔'' ابھی الفاظ میرے منہ سے ادا ہوئے ہی تھے کہ اماں بول اٹھیں۔

''پاگل ہوگئی ہے کیا تو؟ وہ بڈھا تیرے باپ کی عمر کا ہے تو اس سے شادی کرے گی..... لوگ کیا کہیں اور پھر میں.....!'' میں نے اماں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''چھوڑ دو ناں اماں..... ساری زندگی میری کس خواہش یا خوشی کا احترام کیا گیا ہے جو اب مجھے دکھ ہوگا ویسے بھی دکھی رہ رہ کے اب میں عادی ہوگئی ہوں شاید اب کوئی خوشی مجھے راس نہ آسکے۔'' میرے گلے میں آنسوؤں کا پھندہ سا اٹکنے لگا تھا ابا چپ چاپ خشمگیں نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے جیسے کچا ہی چبا ڈالیں گے۔ میں نے آنسو اپنے اندر ہی اتار لیے اور ابا کی طرف مڑی۔

''ابا تم جس سے چاہو میری شادی کروا اپنا یہ ارمان بھی پورا کرلو میں تم سے رحم کی بھیک مانگ کر تم سے کوئی احسان نہیں چاہتی جہاں اتنی زیادتیاں وہاں ایک اور صحیح کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں کہہ کر آگے بڑھی ابا چپ رہے کچھ نہیں بولے بولتے بھی کیا میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔ میری رضامندی ہی ان کے لیے بڑی خوشی تھی اور کچھ بول کر وہ بات کو بڑھانا نہیں چاہتے تھے البتہ اماں مجھے روک رہی تھیں۔

Digitized by

''رک جا خوش بخت..... میری بات تو سن لے۔'' میں اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچ کر لحظہ بھر کو رکی دل میں ایک بات آ رہی تھی وہ کہنا تھی سو کہہ ڈالی۔

''ابا اگر تم کسی اچھے لڑکے سے میرا بیاہ کرتے تو شاید میرے دل میں تمہارے لیے کچھ پیار امڈ آتا لیکن افسوس.....!'' اپنی بات کہہ کر میں رُکی نہیں بلکہ تیزی سے کمرے میں جا کر کنڈی لگا لی ہاں جاتے جاتے میں نے ابا کے چہرے کا رنگ بدلتے ضرور دیکھا تھا۔ اور دل کی بھڑاس نکال کر اپنے دل میں ایک طمانیت اور ٹھنڈک کا احساس جاگتے محسوس کیا۔

اور اب..... اپنے کمرے کے بند دروازے سے ٹیک لگا کر مجھے اپنے مردہ جذبات کا ماتم کرنا تھا۔ میری رضامندی پر اماں نے بہت واویلا مچایا بہت احتجاج کیا اور میری خاطر مار بھی کھائی لیکن اماں کی ایک نہ چلی کیونکہ میں رضامندی دے چکی تھی۔ ابا مطمئن تھے بڑے خوش تھے کہ ان کے سر کی بلا ٹل رہی ہے۔ ان کے سر کا بوجھ کوئی اور مفت میں لے کر جا رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر خوشی کی بات بھلا ان کے لیے کیا ہو سکتی تھی۔ کیا ہوا جو وہ بوڑھا ہے' ان کی بیٹی تو بچپن ہی میں جوانی پھلانگ کر بوڑھی ہو چکی ہے اس کے جذبات اور احساسات تو کب کے روندے جا چکے ہیں۔ میں نے بالکل چپ سادھ لی تھی اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ صرف ایک اماں ہی میرا سہارا یقین ان کے دم سے مجھے بڑی ڈھارس تھی۔

لیکن شاید میری تقدیر کو میرا یہ سکون بھی نہ بھایا اور دو دن بعد ہی اماں دل کا شدید دورہ پڑنے سے مجھ سے جدا ہو گئیں اور میں ابا کے ظلم سہنے کو اکیلی رہ گئی۔ میں بہت روئی لیکن کب تک.....! شاید اب تو میری آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ بس ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ میری بہنیں بھی آئی تھیں تیسرے دن وہ بھی چلی گئیں۔ اور میں ایک بار پھر سے تنہا ہو گئی اماں کے بعد میں بالکل زندہ لاش بن چکی تھی ابا اور بھائی کو تو رتی بھر بھی میری پرواہ نہیں تھی۔

اور پھر ابا نے اماں کے چالیسویں کا بھی انتظار نہ کیا اور مجھ زندہ لاش کو دلہن بنا دیا گیا بلکہ نہیں میں دلہن کہاں بنی.....؟ دلہن ایسی ہوتی ہے کیا؟ پتھرائی ہوئی..... منجمد احساس والی..... ایک خالی مورتی..... ایک کھوکھلا وجود..... جو ہر احساس سے عاری ہو..... جس کے وجود میں خوشیوں کی پھلجھڑیوں کے بجائے اذیت کی چنگاریاں اڑ رہی ہوں جس کے دل میں جذبات کے سمندر کے بجائے نفرت کا لاوا ابل رہا ہو۔ جس کی خواہشات کی ارتھی دھڑا دھڑ جل رہی ہو۔ میری دونوں بہنوں نے مل کر مجھے سادگی سے تیار کر دیا غفار کا لایا ہوا سرخ جوڑا مجھے پہنا دیا گیا جس سے میرا تن من جھلس کر رہ گیا اور میں چپ چاپ ایک قید خانے سے اٹھ کر دوسرے قید خانے میں آ گئی۔

غفار ایک تنگ نظر اور شکی مزاج بڈھا تھا اس نے پہلی ہی رات مجھے تنبیہ کر دی کہ میں اس کے بیٹوں سے بھی حد میں رہ کر بات کروں جو سب بے انتہا زبان دراز اور بدتمیز تھے گو کہ سب کا اپنا اپنا پورشن تھا اس لیکن سامنا تو روزانہ ہی ہوا کرتا تھا۔

میں نے ہر حال میں سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا تھا اس لیے سب کے طنز' طعنے تشنے چپ چاپ سہ لیا کرتی تھی اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا ابا نے تو شادی کر کے جیسے اپنے سر سے بوجھ ہٹایا تھا تبھی تو

Digitized by Google

شادی کے بعد سے اب تک مجھے پوچھا تک نہ تھا کہ میں کس حال میں ہوں رہا بھائی تو اسے خود اپنی پرواہ نہیں ہوتی تھی نشہ کر کے اِدھر اُدھر پڑا رہتا تھا مجھے کیا پوچھتا.....! ایک دن غفار نے مجھے بتایا۔

''تمہارا بھائی تھانے میں بند ہے۔'' میرا چونکنا فطری تھا میں نے بے اختیار پوچھا۔

''کیوں خیریت تو ہے ناں؟ کیا کیا ہے اس نے؟'' وہ جیسا بھی تھا میرا ماں جایا تھا اور میری ماں اسے بہت چاہتی تھی اور ویسے بھی بھائی کیسے بھی ہوں بہنوں کا مان اور میکہ ان ہی کے دم سے ہوتا ہے۔ میرے پریشان ہونے پر غفار تیکھے پن سے بولے۔

''اوہو بڑی فکر ہو رہی ہے بھائی کی..... وہ تو تمہیں پوچھتا بھی نہیں تھا۔''

''وہ چاہے نہ پوچھے لیکن وہ میرا بھائی ہے میرے دل میں تو اس کے لیے نرم گوشہ ہمیشہ رہے گا۔'' میں متانت سے بولی تو غفار مجھے عجیبی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''اچھا اچھا بس..... زیادہ اپنے بھائی کی حمایت نہ بن..... چھرا مارا ہے اس نے ایک لڑکے کو جھگڑے میں اور لڑکے کی حالت بہت خراب ہے اگر اپنے بھائی سے محبت ہے تو دعا کر کہ وہ لڑکا بچ جائے ورنہ.....!''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ پھانسی ہوگی تیرے بھائی کو یا پھر عمر قید.....!'' غفار بے رحمی سے بولتے باہر نکل گئے اور میرے دل سے بے اختیار 'اللہ نہ کرے' کی صدا نکلی اور میں اس لڑکے کی زندگی کی نہیں درحقیقت اپنے بھائی کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

لیکن میری دعائیں اگر اتنی مستجاب ہوتیں تو کیا میرے حق میں قبول نہ ہوتیں دو دن بعد ہی غفار نے اس لڑکے کی موت کی خبر سنائی اور میں ایسے روئی جیسے میرا بھائی مرگیا ہو پھر حسب توقع میرے بھائی کو عمر قید ہوگئی اب ابا پورے گھر میں تنہا رہتے تھے۔

میں کبھی کبھار ملنے چلی جاتی وہ مجھ سے کوئی خاص محبت کا اظہار نہ کرتے انہیں تو اپنے بیٹے کا غم لگا ہوا تھا میں تھوڑی دیر بیٹھ کر انہیں تسلی دے کر واپس لوٹ آتی لیکن واپس آنے کے بعد میرے دل و دماغ پر مزید بوجھ ہوتا مجھے ابا کا یہ ناروا سلوک بہت کھلتا تھا۔ نجانے انہیں بچپن سے لڑکر آج تک مجھ سے محبت کیوں نہ ہوسکی۔ انہوں نے ہمیشہ ہی مجھے کیوں نظر انداز کیا؟ میں کیوں ہمیشہ ان کی نظروں میں کھٹکتی رہی۔ ان سوالوں کے جواب مجھے کبھی نہ مل سکے اور پھر..... میں نے ان سب باتوں کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا اور مزید بے حس اور ڈھیٹ بن گئی۔

آج کل غفار صاحب کی طبیعت گری گری رہنے لگی تھی انہیں دو ہارٹ اٹیک ہو چکے تھے اس لیے ڈاکٹرز نے بہت احتیاط کا کہا تھا میں ان کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی ڈاکٹر کے پاس جانا ہوتا تو ان کے بیٹے گاڑی میں لے جاتے میں انہیں وقت پر دوا دیتی ان کے لیے پرہیزی کھانا پکاتی اور اپنا ہر فرض پوری ایمانداری سے نبھاتی جو بھی تھا غفار میرے سر کا سائبان تھے میرے شوہر تھے ان کے علاوہ میرا اس دنیا میں تھا ہی کون؟ اب وہی میرا آخری سہارا تھے اور اس سہارے کو میں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بھی میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے بس تھوڑے سخت مزاج تھے تو وہ ان کی عمر کا تقاضہ تھا میں ان کی ہر

Digitized by

کڑوی کسیلی بات خندہ پیشانی سے سنتی تھی اور برداشت کرتی تھی شاید اسی لیے ہمارا نبھاہ ہو رہا تھا اور شاید یہی میری مجبوری بھی تھی۔

لیکن قدرت شاید مزید میرا امتحان لینا چاہتی تھی تبھی تو ایک رات غفار صاحب کو ایسا شدید دل کا دورہ پڑا کہ دو دن آئی سی یو میں رہ کر وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اور مجھ سے ایک بار پھر سائبان چھن گیا۔ غفار جیسے بھی تھے بہرحال میرے شوہر تھے ان کے دم سے میں اس گھر میں رہ رہی تھی۔ میرے سر پر چھت تھی اور دو وقت کی روٹی مجھے عزت سے مل جاتی تھی۔ ان کی موت پر مجھے رونا نہیں آیا نجانے کیوں..... ہاں ایک چپ ضرور لگ گئی تھی۔

سر پر سفید دوپٹہ اوڑھے میں دور کہیں خلاؤں میں دیکھ رہی تھی کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے مجھے کچھ خبر نہ تھی میری آنکھیں سوکھی پڑی تھیں شاید میرے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ یا شاید وقت نے مجھے اتنی بار توڑا تھا کہ اب مجھ میں سلامت کچھ بچا ہی نہ تھا۔ میری ذات ذرات کا ڈھیر تھی۔

چھوٹے چھوٹے ذرات' جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا..... جن کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے جن کو ظالم ہوا کہیں بھی لے جا کر پٹخ دیتی ہے اور وہ چپ چاپ ہوا کے دوش پر اڑے ہوئے کہیں بھی جا گرتے ہیں۔ کبھی پھول پر تو کبھی کیچڑ پر.....!

کیونکہ وہ بے بس ہوتے ہیں ان کی کوئی مرضی نہیں ہوتی وہ حالات' موسم اور ہوا کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں بالکل میری طرح..... مجھے بھی تو حالات نے ہمیشہ پٹخیاں دی ہیں..... اور اب یہ نیا ستم..... یا اللہ میری زندگی ٹھہر کیوں نہیں جاتی۔ آخر کب مجھے سکون ملے گا کب؟ میں نے کرب سے آنکھیں موند کر دیوار سے سر ٹکا دیا۔

اب مجھے نئے حالات کے لیے خود کو تیار کرنا تھا۔

☆.....☆.....☆

سوئم کے بعد ہی تینوں بیٹیاں اور بیٹے سر جوڑ کر بیٹھ گئے میں اپنے کمرے میں تھی لیکن ان کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو بخوبی سن سکتی تھی یا جان بوجھ کر شاید مجھے سنائی جا رہی تھی۔

''پھر کیا سوچا ہے تم لوگوں نے اس لڑکی کے بارے میں' ظاہر ہے اس کا رشتہ ابا سے تھا وہ تو اب رہے نہیں تو اس کا یہاں رہنا بے معنی ہے۔'' بڑی کی آواز آئی۔

''کرنا کیا ہے اس کو یہاں سے چلتا کریں اس کے ابا کے گھر۔'' بڑا بیٹا حقارت سے بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر اس نے اپنا حصہ طلب کر لیا تو ہم کیا کریں گے؟'' بڑے سے چھوٹا فکرمندی سے بولا۔

''کون سا حصہ؟ اور کیسا حصہ.....؟ اس کا کوئی حق نہیں ہے نہ ہی اس گھر پر اور نہ ابا کی جائیداد پر..... وہ صرف ابا کی مرضی سے اس گھر میں آئی تھی تو ہم ابا کی خاطر خاموش ہو گئے تھے اور خون کے گھونٹ پی کر اسے برداشت کر لیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم نے اسے اپنی ماں تسلیم کر لیا اور اب اسے ابا کی جائیداد میں سے حصہ بھی دیں گے۔'' یہ بڑا بیٹا تھا۔

''ندیم بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے اس لڑکی کا اس گھر سے یا اس گھر کی وراثت سے کوئی واسطہ نہیں ہے تم بیکار میں پریشان ہو رہے ہو میں آج ہی اس لڑکی کو اس گھر سے چلتا کرتی ہوں۔'' بڑی بیٹی بڑی نخوت سے کہتی اٹھی اور اب ظاہر ہے کہ وہ میرے کمرے میں آ رہی تھی میں لیٹی ہوئی تھی میں نے چپ چاپ آنکھیں موند لیں۔

اس عورت نے میرے کمرے کا دروازہ دھڑ

Digitized by Google

سے کھول دیا میں سٹپٹا کر اٹھ بیٹھی اور حیرت سے اسے دیکھنے لگی اس کے چہرے پر غصہ نفرت اور طنطنہ صاف دکھائی دے رہا تھا میں سمجھ گئی کہ وہ اب مجھے اس گھر میں ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

''اے لڑکی تم ابا کی بیوی تھیں تب تک ہمیں قبول تھیں یا یوں کہہ لو کہ ہم تمہیں ابا کی وجہ سے برداشت کر رہے تھے اب جبکہ ابا نہیں رہے تو تمہارا اس گھر میں رہنے کا جواز ہی بنتا اس لیے آج ہی اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے چلتی بنو۔'' وہ بغیر لحاظ و مروت کے شروع ہو گئی تھی۔

میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

''ابھی میں عدت پوری.....''

''کوئی عدت ودت نہیں ہوگی جو ڈرامہ کرنا ہے اپنے ابا کے گھر جا کر کر لینا یہاں نہیں۔'' وہ میری بات کاٹ کر نخوت سے بولی تھی اور فوراً کمرے سے نکل گئی تھی۔ اتنی بے عزتی اتنی بے وقعتی پر میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا اور میں زبان سے کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

لوگ اتنے بے حس کیوں ہوتے ہیں کہ الفاظ کے نشتر چلا کر دوسروں کی روح کو چھلنی کر دیتے ہیں کسی کے احساسات کو زخمی زخمی کر کے اس کے وجود کو لہولہان کر دیتے ہیں اور انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ ان کی باتوں نے کسی کو کس قدر چوٹ پہنچائی ہے۔

بولنے والا تو بول کر گزر جاتا ہے اور سننے والا انسان بے اپنی ذات کی کرچیاں ہی سمیٹتا رہ جاتا ہے۔

جیسے کہ ابھی اس عورت کی تلخ باتوں سے میں ٹوٹ کے رہ گئی تھی اور اب.....اب تو مجھے سمیٹنے والا بھی کوئی نہ تھا میری ماں.....آہ وہ بھی نہ رہی کہ اس مشکل گھڑی میں مجھے سہارا دیتی۔

اور باپ.....اس سے میں کیا امید رکھوں؟ اس نے تو تب بھی مجھے سہارا نہ دیا تھا جب مجھے سب سے زیادہ پیار' توجہ اور سہارے کی ضرورت تھی تو وہ اب مجھے کیوں سہارا دے گا؟

''یارب جب میں اتنی بے کار ہوں اتنی بے بس ہوں تو.....تو میں زندہ کیوں ہوں اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو کب کی کر لیتی۔

میں بے بس تھی بے اختیار میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے لڑھک گئے بہرحال آنسو میرے اپنے تھے اور اس غم میں میرے ساتھ تھے۔

میں نے چپ چاپ اٹھ کر اپنے چند جوڑی کپڑے رکھے اور چادر اوڑھ کر ایک الوداعی نظر اس کمرے پر ڈالی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ لاؤنج میں سب ہی موجود تھے شاید میرے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے رک کر ایک نظر سب کو دیکھا سب نے منہ پھیر لیا تو میں خدا حافظ کہتی باہر نکل گئی ایک ایک قدم اٹھانا میرے لیے کسی اذیت سے کم نہ تھا اس گھر سے ابا کے گھر تک کا فاصلہ زیادہ نہ تھا مگر مجھے لگا جیسے میں میلوں کا سفر کر کے آئی ہوں۔

اپنے گھر کے دروازے پر کچھ دیر رک کر میں نے سانس بحال کی یا شاید ابا کا سامنا کرنے کی ہمت مجتمع کی اور دروازے کو ہلکا سا دھکیلا دروازہ کھلا تھا' میں اندر داخل ہو گئی ابا مجھے سامنے ہی لیٹے نظر آ گئے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھے اور میرے ہاتھ میں کپڑوں کا بیگ دیکھ کر جیسے سب سمجھ گئے اس سے پہلے کہ وہ کوئی تلخ بات کہتے میں نے کہا۔

''غفار کے بچوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے اسی لیے یہاں آئی ہوں۔'' میرا لہجہ بالکل سپاٹ تھا ہر احساس سے عاری.....

''ہاں تو کیوں رکھتے وہ تجھ منحوس کو اپنے گھر

Digitized by

میں' غفار نے بھی تجھے کچھ نہ دیا؟''

''مجھے کسی سے کچھ نہیں چاہیے اور ہاں میں یہاں کسی پر بوجھ نہیں بنوں گی بلکہ لوگوں کے کپڑے سی کے محنت کر کے کھاؤں گی۔'' یہ کہہ کر میں رُکی نہیں سیدھی اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر کے اسی کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے آنسو جو میرے اپنے تھے میرا ساتھ دینے چلے آئے تھے۔

☆.....☆.....☆

اور پھر پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے میں نے لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرنے شروع کر دیے جس سے میری گزر اوقات ہونے لگی ابا کو مجھ سے ہمیشہ کی طرح کوئی سروکار نہ تھا میں اپنے کمرے میں تنہائی سے لڑتی رہتی اور ابا کبھی گھر میں تو کبھی باہر..... وہ مجھ سے کبھی کوئی بات نہ کرتے تھے پتہ نہیں کیوں ان کی مجھ سے نفرت آج تک ختم نہ ہو پائی تھی میں ایک اَن چاہا وجود تھی جو ہمیشہ ان کی نظروں میں کھٹکتی رہی۔

لیکن میں بھی شکر گزار تھی کہ کم از کم مجھے سر چھپانے کا آسرا تو مل گیا تھا ورنہ میں اکیلی کہاں جاتی؟

چاہے ابا مجھ سے بات نہیں کرتے تھے لیکن ان کا دم ہی غنیمت تھا میرے لیے..... کم از کم ان کے ہوتے میں محفوظ تھی ایک سائبان تھا میرے سر پر..... کبھی کبھی میں سوچتی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کیوں پیدا کیا' میرا اس دنیا میں کام ہی کیا ہے؟ میں تو ایک بے کار شے کی طرح اس گھر میں ایک طرف پڑی ہوں کوئی مجھ سے بات کرنے والا' مجھے پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔

میری بہنیں اپنی اپنی سسرال میں اپنی زندگی جی رہی تھیں پتہ نہیں کس حال میں تھیں ان کو بھی

تمہارا فون

ہوا نے یہ بتایا ہے
تمہاری (اوس میں بھیگے) ستاروں کی طرح
نمناک آنکھوں میں
دیے سے ٹمٹماتے ہیں
تو لگتا ہے
تہہ تالاب شاید چاند اترا ہے
ہوا حیران ہوتی ہے
یہ کیسے ہے' یہ کیونکر ہے؟
اسے کہہ دو
میرے سیل فون کو دیکھو
وہ کوئی خاص نمبر ہے
جب اس سے کال آتی ہے
یا پھر پیغام آتا ہے
تو اس کی اسکرین پر اک چاند ابھرتا ہے
اور اس کا عکس
میری (اوس میں بھیگے) ستاروں کی طرح
نمناک آنکھوں میں جھلکتا ہے
تو لگتا ہے
تہہ تالاب شاید چاند اترا ہے

طلعت اخلاق احمد

Digitized by Google

پوچھنے والا کوئی نہ تھا لیکن کم از کم وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ تھیں۔

اور ایک میں تھی کہ جس کے نصیب میں کسی کا پیار نہیں تھا بچوں کا اور شوہر کا سکھ نہیں تھا تو پھر میں بے کار ہی ہوئی ناں.....

ایسے میں صرف ایک چیز میرا سہارا تھی اور وہ تھے میرے آنسو..... جو کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔ انہیں بہا کر میں کچھ دیر کے لیے بہت پُرسکون ہو جایا کرتی تھی۔

وہ جنوری کی بہت سرد رات تھی لہو منجمد کر دینے والی ٹھنڈ پڑ رہی تھی انسان تو انسان پرندے بھی اپنے گھونسلوں میں دبکے ہوئے تھے ہر طرف ہو کا عالم تھا ابا تھوڑی دیر پہلے ہی مسجد سے فارغ ہو کر آئے تھے میں نے چپ چاپ کھانا گرم کر کے لے جا کر ان کے سامنے رکھ دیا ابا نے بغیر نظر اٹھائے شروع کر دیا میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔

ابا نے کھانا ختم کر کے برتن آگے سرکا دیے' میں نے خاموشی سے برتن اٹھائے اور کچن میں آ کر برتن دھونے لگی کام کر کے میں سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ بند کر کے سونے لیٹ گئی بستر پر لیٹتے ہی ہزاروں سوچیں میرے دماغ کا طواف کرنے لگیں کتنی تہی داماں ہوں میں..... کہ اپنے باپ کا پیار بھی نہ پا سکی۔

ہر عورت کے نصیب میں شوہر اور بچوں کا سکھ ہوتا ہے اور میں بد بخت اس سکھ سے بھی محروم رہی' آخر میرا مقصد کیا ہے اس دنیا میں آنے کا.....؟

میں بے وجہ ہوں' بے مقصد ہوں لیکن پھر اماں کی کہی ایک بات میرے ذہن میں گردش کرنے لگی جس نے باقی ساری سوچوں اور خیالات کو پیچھے دھکیل دیا۔ اماں کہتی تھیں۔

''اللہ نے کسی شے کو بے مقصد نہیں بنایا ہر ایک کا الگ الگ مقصد ہے ہم نا سمجھ ہیں اس رب کی مصلحت اور قدرت کو نہیں سمجھ سکتے لیکن ایک وقت آتا ہے جب ہمیں اپنا مقصد سمجھ آ جاتا ہے۔'' نجانے میرا اس دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟ میں تو اَن چاہا وجود ہوں' سب کے لیے قابل نفرت..... انہی منفی خیالات کے زیر اثر میں نجانے کب تک کروٹیں بدلتی رہی اور پھر نیند کی دیوی مہربان ہوئی اور میں سو گئی۔

حسب معمول فجر میں میری آنکھ کھلی سخت سردی تھی کمبل سے نکلنا دشوار لگ رہا تھا لیکن نماز کی عادت اور اللہ سے محبت نے مجھے گرم بستر سے نکلنے پر مجبور کر دیا میں کمبل پیچھے دھکیلتی بستر سے نکل آئی گرم شال اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔

لیکن باتھ روم کا منظر دیکھ کر میری بے اختیار چیخ نکل گئی سامنے ابا آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے ان کا منہ بھی ٹیڑھا ہو چکا تھا۔

ابا کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ ابا کو کیا ہوا ہے اور مجھے کیا کرنا چاہیے بس میں بے اختیار چیختی چلی گئی۔

پاس پڑوس سے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تب مجھے پتہ چلا کہ ابا کو فالج کا اٹیک آیا ہے کچھ لوگوں نے مل کر ابا کو اٹھا کر بستر پر لٹا دیا اور عورتوں نے مجھے تسلی دی اور پانی پلایا مجھے حوصلہ دیا کہ ابا ٹھیک ہو جائیں گے۔

اور پھر اگلی صبح میری بہنیں بھی ابا کو دیکھنے آئیں اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئیں ظاہر ہے کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر ابا کی تیمارداری نہیں کر سکتی تھیں انہیں جانا ہی تھا سو وہ چلی گئیں اب مجھے تنہا ہی ابا کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ اور تب مجھے اپنا مقصدِ حیات سمجھ آ گیا۔

Digitized by Google

شاید اللہ نے مجھے اسی مقصد سے پیدا کیا تھا تاکہ میں اپنے باپ کی خدمت کرسکوں کیونکہ اگر میں نہ ہوتی تو آج کون ابا کی خدمت و تیمارداری کرتا۔ بے شک ابا نے ساری زندگی مجھے نظر انداز کیا مجھ سے کبھی پیار نہ کیا لیکن پھر بھی وہ میرے باپ تھے کیا ہوا جو وہ مجھ سے نفرت کرتے تھے میں تو ان کی اولاد ہوں ناں میں ان کی خدمت کرکے ان کا دل جیت سکتی ہوں ان کی نفرت کو محبت میں بدل سکتی ہوں۔

اور پھر میں نے ساری باتیں بھلا کر جی جان سے ابا کی خدمت شروع کردی میں ان کا منہ صاف کرتی انہیں کھانا کھلاتی ان کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی ابا خاموش خاموش سے پڑے رہتے۔ ابا مکمل میرے رحم وکرم پر تھے۔

اب مجھے ابا کی آنکھوں میں شرمندگی اور ندامت نظر آتی تھی آنسو تیرتے دکھائی دیتے اور پھر ایک دن میں نے ابا کو روتے دیکھا جب میں انہیں سوپ پلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ ان کا منہ صاف کرتی جارہی تھی۔ ابا کے جسم کا سیدھا حصہ پوری طرح مفلوج تھا۔ ابا نے الٹے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا اور پکارے 'خوش بخت'

میں نے چونک کر ابا کی طرف دیکھا زندگی میں پہلی بار میں نے ابا کے منہ سے اپنا نام سنا تھا میری آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔

اور ابا کے آنسو رواں تھے یہ شاید ندامت کے آنسو تھے۔

ابا کو اس بے بسی سے روتے دیکھ کر ایکدم میرا دل دکھ سے بھر گیا کچھ بھی تھا وہ میرا باپ تھا میں نے بے اختیار ابا کے آنسو پونچھ ڈالے۔

''کیا ہوا ابا کیوں رو رہے ہو؟''

''مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے کیا؟'' میں ابا کے رونے سے پریشان ہوگئی تھی۔

''نن..... نہیں بیٹا غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے کہ میں ساری زندگی تجھے وہ پیار اور شفقت نہ دے سکا جس کی تو مستحق و حقدار تھی۔'' ابا ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولے آنسو رواں تھے۔

''تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دے مت خدمت کر میری۔''

''کیسی باتیں کررہے ہیں ابا..... آپ میرے باپ ہیں میں آپ کی اولاد ہوں میں آپ کی خدمت کرکے کوئی احسان نہیں کررہی اپنے دل میں پرانی کوئی بات نہیں لائیں بھول جائیں سب کچھ..... میں..... میں ٹھیک ہوں ابا.....''

اب میرے بھی آنسو رواں ہوگئے تھے۔

''میں نے تیرے ساتھ ہمیشہ برا سلوک کیا میں اپنی کس کس غلطی کی تجھ سے معافی مانگوں یہ شرمندگی اور ندامت مجھے جینے نہیں دیتی بیٹا..... شاید یہ اللہ کی طرف سے میرے لیے سزا ہے جو آج میں اس حال میں ہوں۔''

''مم..... مجھے معاف کردے بیٹی خوش بخت.....''

ابا بہتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے ان کے لہجے میں التجا ہی التجا تھی میں ٹوٹ کر رہ گئی۔ ساری شکایتیں اور شکوے دھل چکے تھے۔

اب مجھے ابا سے صرف محبت ہی محبت تھی۔

میں نے فرطِ محبت سے ابا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور بہتی آنکھوں سے لگالیا۔

''میں نے آپ کو دل سے معاف کیا ابا.....!''

میرے الفاظ سن کر ابا کے چہرے پر سکون ہی سکون پھیل گیا تھا اور مجھے اپنا مقصدِ حیات سمجھ آ گیا تھا۔

اب ابا کی خدمت ہی میرا مقصدِ حیات تھا جو میرے لیے باعث فخر تھا۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

اسلام آباد سے ارسال کردہ بالکل سچی کہانی

قرض کی واپسی

وہ بہت شیطان لڑکا تھا مگر یہ طے تھا کہ وہ بے انتہا ذہین ہے تبھی تو ایسے استاد تلاش کیے جنہوں نے بنا محنت ہی اُسے کامیاب کروادیا.....

رئیسہ خالد

یہ واقعہ پاکستان بننے سے بہت سال پہلے کا ہے۔ جب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ یہ واقعہ مجھے میری دادی نے سنایا تھا کیونکہ وہ بزرگ ہمارے دادا کے دوستوں میں سے تھے۔

ایک بہت نامی گرامی حکیم صاحب تھے۔ وہ گاؤں میں رہتے تھے آدھے سے زیادہ گاؤں ان کی ملکیت تھا۔ گاؤں میں ان کی بہت بڑی دو منزلہ حویلی تھی۔

مشہور تھا کہ اُن کی حویلی کے اوپر والے حصے میں جنات کا بسیرا ہے۔ لوگ رات تو کیا دن میں بھی اس حویلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ڈرتے' گاؤں میں نہ تو کوئی اسپتال تھا اور نہ ہی کوئی اسکول' بچے ایسے ہی کھیل کود میں وقت گزارتے۔

حکیم صاحب بچوں کو اس طرح کھیل میں وقت گزارتے دیکھ کر بہت مایوس ہوتے۔

ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا جسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر بھیج دیا تھا۔ ان کی بیوی بھی بیٹے کے ساتھ شہر میں رہتی تھیں۔

چھٹیوں میں بیوی اور بچہ گاؤں آجاتے ورنہ حکیم صاحب گاؤں میں زیادہ تر تنہا ہی رہتے تھے۔ حکیم صاحب کو بچوں کا اس قدر کھیل کود پسند نہ تھا۔

اس لیے محلے کے زیادہ تر بچوں کو اپنے پاس بلا لیتے اور انہیں قرآن کی تعلیم دیتے۔ گاؤں میں مشہور تھا کہ حکیم صاحب کے پاس جنات کے بچے بھی پڑھنے آتے ہیں اور یہ سچ بھی تھا۔ وہ صبح دو گھنٹے حکمت کرتے اور اس کے بعد بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے۔

ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو بہت ذہین تھا انہوں نے شہر میں ایک مکان خرید لیا تھا جہاں رہ کر ان کا بیٹا تعلیم حاصل کر رہا تھا جلد ہی اس نے اسکول کی تعلیم بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلی اور کالج میں پہنچ گیا۔

وہ بہت ہی سوہنا اور ذہین بچہ تھا یونیورسٹی کی

Digitized by Google

تعلیم سے فارغ ہو کر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلا گیا وہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس آ کر اسی شہر میں پریکٹس شروع کر دی۔

ماں باپ کی خواہش تھی کہ اب اُس کی شادی کر دی جائے۔ ان دنوں لڑکوں کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔

زیادہ سے زیادہ قرآن ناظرہ اور اردو کی تعلیم دی جاتی تھی وہ بھی صرف پڑھنے تک اب وہ شہر کا بہت کامیاب وکیل تھا۔

گاؤں کی ہی ایک اچھی لڑکی دیکھ کر اُن کی شادی کر دی گئی۔ حکیم صاحب کی بیگم گاؤں واپس جا چکی تھیں۔

کچھ سالوں بعد حکیم صاحب اور ان کی بیگم کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے گاؤں جانے کا تصور ہی ختم ہو چکا تھا حویلی بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ لیکن گاؤں سے رشتہ ٹوٹا نہ تھا گاؤں سے غلہ اور کھانے پینے کی ہر چیز آتی تھی۔

یہاں تک کہ ہفتہ وار سبزیاں بھی گاؤں سے آتی تھیں۔

حکیم صاحب کے بیٹے کی بھی صرف ایک اولاد نرینہ تھی۔ حکیم صاحب کا بیٹا جتنا ذہین اور فرماں بردار تھا۔ پوتا اتنا ہی شیطان تھا پڑھائی کی طرف اس کی بالکل توجہ نہ تھی۔ ماں کے لاڈ پیار نے اسے بالکل بگاڑ دیا۔

اُن کی وہ سنتا ہی نہیں تھا۔ وکیل صاحب اپنے پیشے کی وجہ سے بہت مصروف تھے۔ ماں بھی

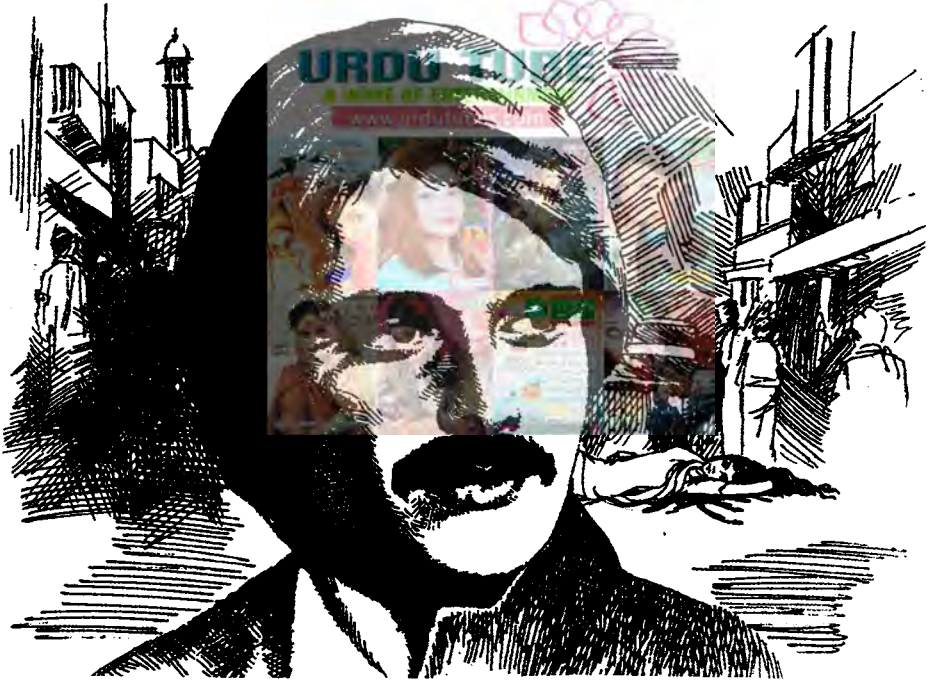

Digitized by Google

اس کی شکایت وکیل صاحب سے کرتے ڈرتی تھیں کہیں وہ اس پر زیادہ سختی نہ کریں۔

ماں کی وہ بالکل سنتا نہیں تھا گھر سے وہ اسکول کے لیے نکلتا اور اسکول جانے کی بجائے سارا دن بگڑے ہوئے دوستوں کے ساتھ گزارتا سارے دوستوں کا بھی یہی حال تھا۔ گھر میں پیسوں کی کمی نہ تھی۔ ہر سبجیکٹ کے لیے الگ الگ استاد آتے تھے۔

لیکن تعلیم پر اُس کی توجہ نہ تھی۔ کھینچ تان کر وہ نویں کلاس میں پہنچ گیا تھا اور اب امتحان میں کچھ ہفتے رہ گئے تھے اور تیاری کچھ بھی نہ تھی۔

اب دوست یار بھی والدین کی سختی کی وجہ سے پڑھائی میں جٹ گئے تھے۔ اب انہیں ڈر تھا کہ اگر پاس نہ ہوئے تو ابا میاں نہیں بخشیں گے۔ ان دنوں نویں اور دسویں کا امتحان ایک ساتھ ہوتا تھا۔

یکا یک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ گاؤں جا کر جنات سے مدد لی جائے۔ گاؤں اس شہر سے زیادہ دور نہ تھا چند گھنٹوں میں جا کر واپس آیا جا سکتا تھا۔ اپنا پروگرام گھر میں کسی کو بتائے بغیر وہ گاؤں پہنچ گیا اور ٹوٹی پھوٹی حویلی پہنچ کر خوب زور زور سے چلا کر بولا۔

''جناتوں میرے دادا نے تمہارے بچوں کو پڑھایا اس لیے اب تم لوگ مجھے پاس کراؤ اگر میں امتحان میں فیل ہوا تو میرے والدین میرا برا حشر کر دیں گے۔'' گھر والوں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ کب گاؤں گیا اور واپس بھی آ گیا۔

امتحان میں چند ہفتے رہ گئے تھے اب وہ تھوڑی بہت پڑھائی کر رہا تھا لیکن تیاری کچھ بھی نہ تھی۔

امتحان کے کمرے میں سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا تھا لیکن جب پیپر اُسے ملا تو وہ حیران رہ گیا کیونکہ سارے سوالوں کے جوابات اُسے بہت اچھی طرح آ رہے تھے۔ اس نے بہت اچھا پیپر کیا اس کی ہر سبجیکٹ میں تیاری نہ ہونے کے باوجود اسے سب کچھ آسان لگ رہا تھا۔ جب رزلٹ آیا تو سارے ٹیچر اور دوست حیران تھے کیونکہ اس نے پورے اسکول میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ میٹرک کے بعد اس نے آگے کی تعلیم ہمیشہ اچھی پوزیشن لے کر پاس کی اور زندگی میں بہت کامیابی حاصل کی اور بہت کامیاب وکیل بنا بعد میں اس نے سیاست جوائن کر لی اور کئی بار اپنے علاقے سے منسٹر کے عہدے تک پہنچا۔

اس علاقے کے لوگ آج تک حیران ہیں کہ ایسے شطان لڑکے کی کایا کیسے پلٹی..... مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ جنات بھی کسی کا احسان نہیں رکھتے۔

☆☆.....☆☆

محبت اور جنگ

دو محبت کرنے والوں کے درمیان معمولی نوعیت کی نوک جھونک بھی ہو جاتی ہے لیکن اِک ذرا سی بات پر عمر بھر کی محبت کو بھلا دینا دانشمندی نہیں۔ غیروں کی باتوں میں آ کر اپنوں کو خون نہیں رلایا جاتا۔

وہ وعدے، جو ساتھ جینے، ساتھ مرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ نبھانے چاہئیں۔ ایک پل کی لڑائی میں ساری عمر کے رشتے نہیں توڑنے چاہئیں۔ ایک دوسرے کی ساری خطائیں معاف کر دینی چاہئیں۔ آپس میں پیار کبھی نہیں بھولنا چاہیے کیونکہ یہ محبت کے جھگڑے تو آپس میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔

مرسلہ: نور جہاں شاہ۔ کراچی

Digitized by Google

کراچی سے ارسال کردہ پُراسرار کہانی

نادیدہ مخلوق

وہ ہاسٹل پہلے پاگل خانہ تھا.....اسی لیے ایک رات ایسی انہونی ہوئی کہ اب بھی سوچوں تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں.....

فرح انیس

یہ واقعہ مجھے ایک ڈاکٹر نے سنایا تھا۔ آئیں اُن کی زبانی سنیں۔

کچھ واقعے ہماری زندگی میں ایسے ہوتے ہیں کہ ہم چاہ کر بھی اُن کو اپنی یادداشت سے مٹا نہیں پاتے۔ میرے ساتھ بھی ایک واقعہ ایسا ہوا تھا جو اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

میرا نام شہریار ہے پیشے کے لحاظ سے میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں حیدرآباد کے ایک ہاسٹل میں پڑھائی کی غرض سے مقیم تھا۔

وہ ہاسٹل جو پہلے ایک پاگل خانہ رہ چکا ہے اور پھر بعد میں وہ ایک ہاسٹل بنا چار سو کمروں پر مشتمل وہ ہاسٹل جو اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک ویرانی کا احساس دیتا تھا۔ اس ہاسٹل کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے میں ان باتوں کو نہیں مانتا تھا مگر اس رات والے واقعے کے بعد یقین کرنا پڑا کہ ہاں ہمارے سوا اور بھی دوسری مخلوقات ہیں۔ اس دنیا میں اور ایسی ہی ایک مخلوق وہ ہوتی ہے جن کو نادیدہ مخلوق کہا جاتا ہے۔

جو بظاہر تو نظر نہیں آتیں مگر اپنی موجودگی کے احساس سے اچھے اچھوں کے اوسان خطا کر دیتی ہے۔ عید کے فوراً بعد میرے امتحان تھے اور عید کا کوئی چوتھا دن تھا میں گھر سے ہاسٹل کے لیے روانہ ہوا کیونکہ تین دن بعد میرا پیپر تھا۔ جب رات بارہ بجے میں ہاسٹل پہنچا تو ہاسٹل کا چوکیدار مجھے دیکھ کر چونکا کیونکہ ابھی ہاسٹل میں کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

میرے کہنے پر اس نے ہاسٹل کا دروازہ کھول دیا ہاسٹل میں اندر داخل ہوتے ہی میرے وجود میں عجیب سی سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

کوریڈور سے گزرتے ہوئے مجھے باقاعدہ محسوس ہوا جیسے کوئی میرے ساتھ چل رہا ہو میں نے پلٹ کر بھی دیکھا مگر کوئی نہ تھا میں گھبرا کر اپنے کمرے میں آ گیا اور بیڈ پر بیٹھ کر کتابیں کھول

Digitized by Google

لیں اور پڑھائی میں مشغول ہوگیا۔

پڑھتے پڑھتے مجھے بھوک کا احساس ہونے لگا گھڑی پر نگاہ گئی تو رات کے چار بجا رہی تھی۔ سوچا پہلے شاور لے کر فریش ہوجاؤں پھر کچھ کھاؤں گا۔ کپڑے اُٹھا کر واش روم کی جانب چل دیا۔

ابھی واش روم میں داخل ہوکر میں نے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ اچانک برابر والے واش روم کا دروازہ بند ہونے کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی اور باقاعدہ کسی نے زور سے کنڈی لگائی اور شاور کھول کر نہانے کی آواز آئی۔

خوف کی سرد لہر میری رگوں میں دوڑ گئی کیونکہ اس وقت ہاسٹل میں میرے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ برابر واش روم سے مسلسل پانی بہنے کی آواز آرہی تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے واش روم کا دروازہ کھولا اور اس واش روم کو دیکھنے لگا جس میں اندر کوئی نہا رہا تھا۔

اچانک کسی نے اس دروازے کی کنڈی کھولی اور ایک گیلا کتا برآمد ہوا جسے دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔

میں پسینے میں شرابور اپنے کمرے کی طرف سرپٹ دوڑا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر پڑی جو بالکل میرے

URDU TUBE
A WORLD OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

Digitized by Google

بیڈ کے ساتھ ہی تھی۔

اس کھڑکی سے پارک نظر آتا تھا جو کافی برسوں سے بند پڑا تھا عجیب اجاڑ حالت تھی اس پارک کی کہ اس کو دیکھ کر وحشت کا احساس پورے وجود کو گھیر لیتا تھا۔

پارک میں لگے برگد کے درخت کے پاس سفید کپڑوں میں کھڑی کوئی عورت نظر آئی خوف سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے میں گھبرا کر جلدی سے بیڈ پر چادر اوڑھ کر لیٹ گیا اور اپنا منہ بھی اس چادر میں چھپا لیا کہ یکدم مجھے محسوس ہوا کہ کوئی وجود مجھ پر آ کر لیٹ گیا ہو اب تو خوف کے مارے میری وہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

مجھے شدت سے رونا آنے لگا میرا دل کر رہا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دوں پر مجھے بے ساختہ یاد آیا کہ اگر اس وقت کوئی میری مدد کر سکتا ہے تو وہ اللہ کا کلام ہے۔

اور میں آنکھیں بند کرکے کانپتے لبوں سے اللہ کو شدت سے یاد کرنے لگا کہ آہستہ آہستہ اس وجود کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔

فجر کی اذانیں ہونے لگی تھیں۔ میں نے اٹھ کر نماز ادا کی اور شکر ادا کیا اس رب کا جس نے میری جان کی حفاظت کی۔

آج بھی اس رات بیتے جانے والے واقعے کو یاد کرتا ہوں تو خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ وہ کتا کون تھا اس رات جو برابر واش روم میں آیا تھا اور وہ وجود جو میرے اوپر آیا تھا وہ مجھے ختم بھی کر سکتا تھا مگر میں نے دل سے اللہ کو پکارا تو اس نے میری مدد کی اب بھی سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

☆☆.....☆☆

غزل

میرے دل کی سرزمین کو سورج سے جدا کیجیے
گر یہی راحت ہے آپ کے لیے تو جایئے مزا کیجیے

خوفِ تنہائی تھا، ورنہ محبت تو کچھ بھی نہیں
جایئے میرے مہرباں اب حق جفا ادا کیجیے

لذتِ الفت کی چاہ کہاں ہم کو
فقط میرا جو خواب ہے اُسے تو میرا کیجیے

دل بنجر پر اک بوند گرا کر چل دیے
میرے بحر تھے جو وفاؤں کے وہ تو ادا کیجیے

سلسلے میں سبھی آرزو تک ہی ہیں موقف
آرزو کے آگے جستجو کے بعد منزل عطا کیجیے

حال روح اس قدر گھمبیر ہے نگین
کہے ہے مجھ خدارا اس جہاں سے قضا کیجیے

نگین افضل وڑائچ

Digitized by Google

ریز آف وال

سسپنس اور تجسس سے بھرپور تحریر.....

(پہلی قسط)

افتخار چوہدری

رات کے پچھلے پہر پورے دنوں کا خوبصورت چاند ہر طرف اپنی رومان پرور روشنی بکھیر رہا تھا، اس رومان پرور منظر کا سحر اس وقت کچھ لمحوں کے لیے ختم ہو جاتا جب کوئی آوارہ بادل کی ٹکڑی چاند کے سامنے سے گزرتی، تو واضح نظر آنے والا منظر کچھ دیر کے لیے دھندلا سا جاتا، پھر جیسے ہی بادل کی ٹکڑی چاند کے سامنے سے ہٹتی تو ایک بار پھر سے ہر چیز چاند کی دودھیا روشنی میں نہا جاتی۔

چاند کی یہ روشن چودویں رات کسی بھی طرح سے اجیت ورما کے کام کے لیے موزوں نہیں تھی، کیونکہ چاند کی روشنی میں اسے کسی بھی وقت دیکھ لیے جانے کا امکان تھا مگر اسے اپنے چیف کی طرف سے ایمرجنسی میں آڈر ملے تھے اس لیے اب حالات چاہے جتنے بھی ناسازگار کیوں نہ ہوتے اس نے ہر حال میں اس مشن کو مکمل کرنا تھا۔

وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے پاکستانی دارلحکومت کے مضافات میں موجود ایڈوانس میزائل ریسرچ سینٹر کی عمارت کے سامنے موجود سڑک کے دوسری جانب ایک خالی پلاٹ میں موجود تھا اس نے خود کو پلاٹ میں اُگے ہوئے خودرو آک کے پودوں میں کیموج کیا ہوا تھا۔

اس کے جسم پر سیاہ چست لباس تھا بغلوں میں لٹکتے ہوئے ہولسٹروں میں کسے ہوئے مشین پسٹل اور کمر پر موجود بیگ کا ابھار بتا رہا تھا کہ وہ مکمل تیاری کے ساتھ آیا ہے، وہ جس وقت سے یہاں پہنچا تھا تب سے مسلسل نائٹ ٹیلی سکوپ آنکھوں سے لگائے ریسرچ سینٹر کی عمارت اور اطراف کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

اس وسیع و عریض عمارت کی چاردیواری کسی بھی طرح بارہ فٹ سے کم نہیں تھی اور دیوار پر لگی ہوئی خاردار تاروں کی اُنچائی بھی چھ فٹ سے زائد تھی، خاردار تاروں کے ساتھ منسلک کی گئی بجلی کی تاریں بھی نظر آ رہی تھی اس کے علاوہ اب تک

Digitized by Google

Digitized by Google

وہ آہنی گیٹ کے پیچھے بھونکتے ہوئے کتوں اور عمارت کی چھت پر ٹہلتے ہوئے کئی فوجیوں کو بھی مارک کر چکا تھا۔

.....ہونہہ.... سیکورٹی کا اچھا انتظام کیا ہوا ہے اس نے ہنکارہ بھر کر بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کی۔

وہ کافی دیر سے یہی جائزہ لے رہا تھا کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر اندر کیسے داخل ہو۔ مگر یہاں کے انتظامات دیکھ کر لگ رہا تھا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اسی لیے وہ اب ڈائریکٹ ایکشن کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس نے ایک بار پھر ٹیلی سکوپ آنکھوں سے لگائی اور عمارت کے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک اس نے ٹیلی سکوپ ایک جگہ پر روک لی اور پھر اس جگہ کا ویو ٹیلی سکوپ پر موجود ناب گھما کر زوم کرنے لگا۔ یہ ویسٹرک پر موجود گٹر کے ڈھکن کا تھا، تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد اجیت ورما نے ڈائریکٹ ایکٹ کرنے سے پہلے اس گٹر کو چیک کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس نے نظر اٹھا کر چاند کی طرف دیکھا تو بادل کا ایک ٹکڑا چاند کے سامنے سے گذرنے ہی والا تھا پھر چند لمحوں بعد جیسے ہی بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے آیا تو واضح نظر آنے والی ہر چیز دھندلا کر رہ گئی، اجیت ورما نے چاند سے نظریں ہٹا کر ریسرچ سینٹر کی چھت کی طرف دیکھا تو وہاں پر موجود مسلح فوجی اپنا راؤنڈ مکمل کر کے پیچھے کی جانب مڑ رہا تھا اب دوسرے فوجی کے وہاں آنے تک چند لمحوں کا وقفہ تھا۔

اس نے ان چند لمحوں سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا اور آک کے پودوں میں سے باہر نکل آیا اور تیزی سے دوڑتا ہوا سڑک پر موجود گٹر کے پاس پہنچ گیا اور پھر بغیر کوئی وقت ضائع کیے گٹر پر موجود ڈھکن کو اٹھا کر سائیڈ پر رکھ دیا، ڈھکن کے اٹھتے ہی اندر سے بدبو کا بھبکا نکلا مگر اس نے بدبو کی پرواہ کیے بغیر اپنی ٹانگیں گٹر میں لٹکا دیں گٹر کی دیوار پر آہنی ہک لگے ہوئے تھے جن پر پیر جماتے ہوئے وہ نیچے اترنے لگا جب وہ گردن تک گٹر میں اتر چکا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈھکن کو کھینچتے ہوئے واپس اس کی جگہ پر فٹ کر دیا۔

اسی لمحے بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے سے گزر گیا اور دوسرا فوجی راؤنڈ لگاتا ہوا عمارت کے سامنے کی طرف آ گیا۔ جہاں سے سڑک اور اس پر موجود گٹر صاف نظر آ رہے تھے

گویا تینوں کام بیک وقت ہوئے تھے اگر اجیت ورما کو ایک لمحہ مزید تاخیر ہو جاتی تو فوجی کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی۔ گٹر کے اندر گہرا اندھیرا تھا اس نے کمر پر موجود بیگ میں سے پہلے ایک ٹارچ نکال کر روشن کی اور پھر ایک ماسک نکال کر پہن لیا۔

نیچے اترنے پر اس کے پاؤں پنڈلیوں تک گندے پانی میں ڈوب گئے اس نے ٹارچ گھما کر گٹر کا جائزہ لیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ عمارت کی طرف سے ایک پائپ اسی گٹر میں آ رہا تھا اور اس پائپ کا ڈایا بہر حال اتنا تھا کہ اس میں رینگ کر آگے بڑھا جا سکے وہ آسانی سے اس پائپ میں داخل ہو گیا اور پھر کرالنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا ماسک پہننے کے باوجود بدبو اس کے دماغ میں گھسی چلی جا رہی تھی جبکہ آکسیجن کی کمی سے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی چند میٹر آگے بڑھنے کے بعد وہ رک گیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ٹارچ کی روشنی کسی چیز سے ٹکرا کر منعکس ہوئی ہو اس نے

Digitized by Google

ٹارچ کی روشنی کو مختلف زاویوں سے گھما کر دیکھا تو اس کا وہم یقین میں بدل گیا ٹارچ کی روشنی واقعی کسی چیز سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی تھی مگر سامنے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی جو روشنی کا رخ بدل سکتی۔

اجیت ورما نے اپنی کمر سے بیگ اتار کر اس میں سے ایک میٹر نما آلہ نکال لیا اور اس کے سائیڈ میں موجود سوئچ کو آن کیا تو اس کے اوپر والے حصے میں سے لیزر نما سرخ روشنی نکلنے لگی، اجیت ورما نے ٹارچ کو بند کر دیا اور میٹر میں سے نکلنے والی سرخ روشنی کو سامنے کی طرف کیا تو چند فٹ کی دوری پر پائپ کے پورے قطر میں مختلف رنگوں کی روشنیوں کا ایک جال سا تنا ہوا نظر آنے لگا۔

جیسے ہی میٹر میں سے نکلنے والی سرخ لیزر لائٹ اس روشنیوں کے جال سے ٹکرائی تو میٹر کے عین وسط میں موجود اسکرین روشن ہو گئی اور اس روشن اسکرین پر ہندسوں میں ریڈنگ نظر آنے لگی۔

اوہ میرے بھگوان، پسماندہ ملک ہونے کے باوجود ان کے پاس دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی موجود ہے میں بھی کہوں یہ لوگ اتنے بیوقوف تو نہیں ہو سکتے کہ اتنے اہم پوائنٹ کی سیکورٹی کو نظر انداز کر دیں، اس پاور کی ریز تو کسی جنگلی سانڈ کو بھی ایک جھٹکے میں ختم کر دینے کے لیے کافی ہے اس نے اسکرین پر موجود ریڈنگ کو دیکھتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا اور میٹر پر لگے ہوئے مختلف بٹنوں کو ایک خاص ترتیب سے دبانے لگا، آخری بٹن کے دباتے ہی میٹر میں سے نکلنے والی سرخ روشنی کا رنگ بدل کر نارنجی ہو گیا جیسے ہی نارنجی رنگ کی ریز پائپ میں پہلے سے موجود ریزوں کے جال سے ٹکرائی تو ہلکی سی آواز کے ساتھ ایک جھپاکا ہوا اور پائپ میں موجود ریزوں کا جال ختم ہو گیا تو اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے ٹارچ روشن کر لی اور میٹر کو آف کر کے واپس بیگ میں رکھ لیا۔

اب کی بار ٹارچ کی روشنی منعکس نہیں ہوئی تھی وہ ایک بار پھر کرالنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا کچھ دیر میں ہی وہ ایک اور گٹر میں پہنچ گیا، اس گٹر میں بھی لوہے کے ہک موجود تھے جن کے ذریعے وہ اوپر چڑھتے ہوئے ڈھکن کے قریب پہنچ گیا اس نے ڈھکن پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا تو وہ اوپر اٹھتا چلا گیا پھر اس نے سر باہر نکال کر دیکھا تو یہ کوئی نیم اندھیری جگہ تھی مگر تھوڑے فاصلے پر عمارت کا روشن کوریڈور نظر آ رہا تھا۔

جس میں دو مسلح فوجی ٹہلتے ہوئے پہرا دے رہے تھے جیسے ہی دونوں فوجی ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہوئے مخالف سمتوں میں بڑھے تو اجیت ورما ڈھکن کو ایک طرف کھسکاتے ہوئے باہر نکلا اور قریب ہی موجود جنریٹر کی باڑ کے پیچھے رینگ گیا یہ جگہ عمارت کی سائیڈ میں بنے ہوئے باغیچے میں تھی۔

وہ کچھ دیر تک باڑ کے پیچھے بیٹھا فوجیوں کو ٹہلتے ہوئے دیکھتا رہا وقفے وقفے سے عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اس نے ہولسٹر میں سے سائیلنسر لگا ہوا مشین پسٹل نکال کر لوڈ کر لیا اور پھر پہرہ دیتے ہوئے فوجیوں کی طرف کر کے شِشت باندھ کر بیٹھ گیا، جیسے ہی دونوں فوجی مخالف سمتوں سے چلتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے گذرنے لگے تو اجیت ورما نے یکے بعد دیگرے دو مرتبہ ٹریگر دبا دیا۔

Digitized by Google

سائیلنسر کی وجہ سے ٹھس،،، ٹھس.... کی ہلکی سی آوازیں ہی برآمد ہوئیں۔

فوجیوں کو آخری لمحے تک احساس نہیں ہوا کہ ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے گولیاں ٹھیک ان کے سروں میں لگیں اور وہ خالی بوریوں کی طرح ڈھیر ہوگئے۔

تو وہ باڑ کے پیچھے سے نکل کر دبے قدموں دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا مرے ہوئے فوجیوں کے اردگرد کافی خون پھیل چکا تھا اس نے لاشوں کو بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے باغیچے میں لاکر ایک باڑ کے پیچھے چھپا دیا لاشوں کو چھپانے کے بعد وہ ایک بار پھر کوریڈور میں آگیا اس بار اس کا رخ کوریڈور میں موجود ایک دروازے کی طرف تھا دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر کی ہول میں گھمائی اور پھر کی ہول کے ساتھ ہی منسلک ڈیجیٹل کی پیڈ پر سے چند نمبر پریس کر دیئے اس نے نمبر اتنے اعتماد سے پریس کیے جیسے اسے دروازہ کھولنے کا کوڈ پہلے سے ہی معلوم ہو۔

اور ہوا بھی ایسے ہی اس کے کوڈ ملاتے ہی دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا، اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازے کو پھر سے لاک کر دیا یہاں اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ حقیقت میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر بیگ میں سے ٹارچ نکال کر روشن کرلی اور اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا، وہ اس وقت ایک راہداری میں کھڑا تھا جس کے دونوں اطراف میں دفتروں کے دروازے تھے، راہداری کا اختتام ایک بہت بڑے ہال میں ہوا یہاں مختلف سمتوں میں چار راہداریاں بنی ہوئیں تھیں جبکہ ایک طرف مین انٹرس تھا جس کا جسامت سائز دروازہ اس وقت بند تھا۔

ہال میں بھی چاروں طرف دفتر موجود تھے اور تمام دفتروں کے دروازوں کے سائیڈ میں مختلف ناموں اور عہدوں کی تختیاں لگی ہوئیں تھیں۔

اجیت ورما ٹارچ کی روشنی میں تختیوں پر لکھے ہوئے نام پڑھتا ہوا آگے بڑھنے لگا پھر ایک نام پڑھتے ہی وہ چونک کر رک گیا۔ اس نے ایک بار پھر جیب سے چابی نکال کر دروازے کے کی ہول میں گھمائی اور پہلے کی طرح ہی اعتماد سے پیڈ پر مطلوبہ کوڈ کے نمبر پریس کر دیئے تو دروازہ کھل گیا، اندر داخل ہو کر اس نے ایک طرف دیوار پر موجود سوئچ بورڈ پر سے ایک سوئچ آن کیا تو کمرے میں لگی ہوئیں ٹیوب لائٹوں میں سے ایک روشن ہوگئی۔

ٹیوب لائٹ کے روشن ہوتے ہی اس نے واپس گھوم کر کمرے کا جائزہ لیا یہ دفتر شاندار انداز میں ڈیکوریٹ تھا۔ وہ آرام سے چلتا ہوا آگے بڑھا اور میز کے دوسری طرف موجود اونچی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے موجود میز پر ایک کمپیوٹر اور کچھ فائلیں ترتیب سے رکھی ہوئیں تھیں۔

وہ بہت مطمئن انداز میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ جیسے اس نے اب تک کی تمام بھاگ دوڑ اسی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کی ہو، وہ کرسی کے داہنے آرم سپورٹ پر اس طرح پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جیسے چیک کر رہا ہو کہ وہ کس میٹریل سے بنی ہوئی ہے۔

وہ ہاتھ پھیرتا ہوا اندر کی جانب لے گیا اور پھر اس کے حساس ذہن نے ایک ہلکی سی ابھری ہوئی سطح کو محسوس کرتے ہی اسے زور سے دبا دیا

Digitized by Google

چند لمحوں بعد ہی ہلکی سی گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی اور کرسی کے اردگرد سے فرش پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور وہ کرسی جس پر بیٹھا ہوا تھا، ایسے نیچے جانے لگی جیسے کوئی لفٹ نیچے جا رہی ہو، کرسی کے فرش میں سے نیچے اُترتے ہی اس نے سر اٹھا کر اوپر کی جانب دیکھا تو فرش واپس برابر ہو رہا تھا۔

کرسی کے نیچے کوئی ہیڈرالک جیک ٹائپ سسٹم لگا ہوا تھا جس کے اوپر کرسی کو فٹ کیا گیا تھا جیسے ہی کرسی نیچے تہہ خانے کے فرش پر جا کر رکی تو اجیت ورما کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس تہہ خانے میں پہلے سے ہی ٹیوب لائٹس روشن تھیں کمرے کی تین دیواروں کے ساتھ مختلف ڈیزائینوں کے آہنی سیف ترتیب سے کھڑے تھے جبکہ چوتھی دیوار میں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔

تمام آہنی سیفوں پر جلی حروف میں مختلف نمبر لکھے ہوئے تھے اجیت ورما دس نمبر والی سیف کے سامنے پہنچ کر رک گیا اور پھر اپنے پاس موجود بیگ میں سے ایک مستطیل بکس نما مشین نکال لی اور اس پر موجود کئی بٹنوں میں سے ایک سرخ رنگ کا بٹن پریس کرنے پر مشین میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تو اس نے مزید چند بٹن پریس کر دیے، آخری بٹن کے دباتے ہی مشین میں سے سیٹی کی آواز ابھرنے لگی،

آواز کے ابھرتے ہی اس نے مشین کو سیف کی طرف اچھال دیا مشین سیف سے ٹکرا کر نیچے گرنے کی بجائے اس کے ساتھ ایسے چمٹ گئی جیسے لوہے کے ساتھ مقناطیس چمٹ جاتا ہے چند لمحوں بعد مشین میں سے آواز نکلنا بند ہو گئی تو مشین سیف سے الگ ہو کر نیچے گر گئی۔

اجیت ورما نے آگے بڑھ کر مشین کو اٹھا کر واپس بیگ میں رکھ لیا، اور سیف کے ہینڈل کے قریب موجود ڈیجیٹل پینل پر سے چند نمبر پریس کر دیے۔ نمبروں کے پریس ہوتے ہی پینل کے اوپر ایک چھوٹا سا خانہ کھل گیا جس میں ایک روشن اسکرین نظر آ رہی تھی۔ اجیت نے پھرتی سے بیگ میں سے ایک ڈبیا نکال کر کھولی اس میں پیاز کے چھلکے کی طرح کا ایک باریک پلاسٹک کا سفید پیپر موجود تھا جس پر فنگر پرنٹ کے جیسی لکیریں نظر آ رہی تھیں اس نے پیپر کے دوسری طرف موجود کاغذ کو اتار کر پیپر کو اپنے دائیں انگوٹھے پر کسی سٹکر کی طرح چپکا لیا اور پھر آگے بڑھ کر سیف میں برآمد ہونے والی روشن اسکرین پر رکھ دیا۔

انگوٹھا اسکرین پر رکھتے ہی اسکرین پر سرخ رنگ کی لکیریں نیچے سے اوپر کی طرف حرکت کرنے لگیں چند سیکنڈ بعد اسکرین آف ہو گئی اور اسی لمحے سیف میں سے کڑک کی ایک ہلکی سی آواز برآمد ہوئی تو اجیت نے سیف کے ہینڈل کو پکڑ کر گھماتے ہوئے اپنی طرف کھینچا تو دروازہ آرام سے کھلتا چلا گیا۔

سیف کے اندر ایک عجیب سی ساخت کا مستطیل نما آلہ رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک فائل پڑی تھی جس پر ٹاپ سیکرٹ ریز آف وال کے الفاظ لکھے ہوئے تھے

کیا مطلب مجھے ریز وال مشین کا جو سائز بتایا گیا تھا یہ تو اس سے کافی بڑی ہے اجیت ورما نے خود کلامی کے انداز میں کہا تو اس کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔ اس کی فراخ پیشانی پر لکیروں کا جال سا تن گیا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو۔

Digitized by Google

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی جدید ڈیزائین کی گھڑی پر نظر آنے والے ٹائم کو سائیڈ پر موجود بٹنوں کی مدد سے ختم کر دیا اور پھر ایک نمبر لکھنے کے بعد اوکے کا بٹن پریس کر دیا کچھ دیر بعد گھڑی میں سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی ٹرانسسٹر ریڈیو کو ٹیون کر رہا ہو پھر ٹیونگ کا شور کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا اور گھڑی میں سے ایک نسوانی آواز برآمد ہوئی،

یس ہیڈ کوارٹر اٹنڈنگ یو کوڈ پلیز، اوور،،

بلیک ترشول نمبر فور دِس اینڈ، اوور، اجیت ورما نے اسی مخصوص کوڈ میں جواب دیا جس کوڈ میں دوسری طرف سے بات کی گئی تھی، اوہ نمبر فور تم، اوور، نسوانی آواز نے حیرت سے اس کا نمبر دہرایا،

ہاں میں ہوں ایک ایمرجنسی ہے فوراً چیف سے بات کرواؤ، اوور، اجیت نے مسکراتے ہوئے کہا،

اوکے میں بات کرواتی ہوں، اس بار کال رسیو کرنے والی لڑکی کی آواز میں ٹھہراؤ تھا،

چند سیکنڈ بعد ہی گھڑی میں سے،، یس اوور،، کی سپاٹ آواز ابھری

، سر ایک مسئلہ سامنے آیا ہے، اوور، اجیت ورما نے مودبانہ لہجے میں کہا،

کیا مطلب کیسا مسئلہ سامنے آیا ہے جو تمہیں اتنی حساس جگہ سے کال کرنے کا رسک لینا پڑا، اوور، چیف نے چونکتے ہوئے پوچھا،

سر مجھے ریز آف وال مشین کا جو حجم بتایا گیا تھا یہاں پر موجود مشین کا حجم اس سے کافی مختلف ہے ۔لیکن اس کے ساتھ جو فائل موجود ہے اس پر نام تو یہی لکھا ہوا ہے، اوور، اجیت ورما نے بدستور مودبانہ لہجے میں تفصیل سے بات کرتے ہوئے کہا،

تمہیں ریز وال مشین کا جو حجم بتایا گیا تھا وہ محض ہمارے سائنسدانوں کا اس کے بارے میں اندازہ تھا اور ان کے لگائے گئے اندازے کے مطابق ہی تمہیں بریف کیا گیا تھا۔ اب ظاہر ہے اندازے میں کچھ کمی بیشی تو ہو ہی سکتی ہے ، بہرحال ہم نے اس مشین کو ڈھونڈنے کے لیے جتنا کام کیا ہے اس کے مطابق یہ

وہی مشین ہے ، تم اسے لیکر فوراً وہاں سے نکلو، اوور، چیف نے اسے بتائے گئے حجم کی وضاحت کرتے ہوئے آخر میں اسے وہاں سے فوراً نکلنے کے لیے کہا،

تو جواب میں اجیت ورما نے صرف یس سر ،، اوور،، کہا تو چیف نے اوور اینڈ آل کہتے ہوئے کال منقطع کر دی،

کال ختم ہوتے ہی اجیت ورما نے اپنے پاس موجود بیگ کے نیچے والے حصے میں لگی ہوئی زپ کھولی تو بیگ کا سائز دوگنا ہو گیا تو اس نے تیزی سے سیف میں سے ریز وال مشین اور فائل اٹھا کر بیگ میں رکھ لی اور واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھر جیسے ہی اس نے خفیہ ابھری ہوئی جگہ پر دباؤ ڈالا تو کرسی کسی لفٹ کی طرح اوپر اٹھنے لگی۔

کرسی ابھی چھت سے کچھ فاصلے پر ہی تھی جب چھت سابقہ جگہ سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ، اور اتنا خلا بن گیا کہ کرسی آسانی سے اس خلا میں سے گزرتی ہوئی واپس کمرے میں اپنی جگہ پر پہنچ گئی اسی اثنا میں فرش بھی واپس ہموار ہو گیا۔

فرش کے ہموار ہوتے ہی اجیت ورما ایک جھٹکے سے اٹھا اور دوڑتا ہوا آفس میں سے باہر نکل آیا اور رُکے بنا اسی راہداری میں آ گیا جہاں سے

Digitized by Google

داخل ہوکر وہ حال کی طرف گیا تھا۔

راہداری کے آخر میں دروازے کے قریب پہنچتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ کیونکہ اسی وقت پوری عمارت سائرن بجنے سے گونج اٹھی تھی، اس نے آگے بڑھ کر دروازے سے کان لگایا تو دوسری طرف فوجیوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

پوری عمارت کو گھیرے میں لے لو وہ جو کوئی بھی ہے ابھی عمارت کے اندر ہے اس کے گیلے قدموں کے نشان اس دروازے تک آئے ہیں،

کسی افسر نے اپنے ماتحتوں کو آڈر دیتے ہوئے کہا۔

ابھی افسر نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کے کسی کے دوڑ کر آنے کی آواز سنائی دی، اور بدحواس سی آواز سنائی دی

سر،... سر وہ ادھر باڑ کے پیچھے سے لاشیں مل گئی ہیں، اور باغیچے میں گٹر کا ڈھکن بھی کھلا ہوا ہے،

گٹر میں سے تو کسی کا گزر کر آنا ناممکن ہے۔ کیونکہ گٹر کے اندر تو سائنسی انداز میں ہائی وولٹیج کرنٹ کا ٹریپ لگایا گیا ہے اور اسے کنٹرول بھی اپریشن روم سے کیا جاتا ہے، افسر کے لہجے میں بے یقینی نمایاں تھی۔

حوالدار تم دو سپاہیوں کو ساتھ لو اور سٹور سے بے ہوش کرنے والی گیس کے سلنڈر لا کر گٹر اور عمارت میں گیس چھوڑ دو اور یہ کام زیادہ سے زیادہ چند منٹ میں مکمل ہو جانا چاہیے۔

افسر نے کسی حوالدار سے مخاطب ہو کر کہا تو جواب میں یس سر کہنے کی آواز سنائی دی، اجیت ورما کی فراخ پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو چکی تھیں صورتِ حال نے گھمبیر رخ اختیار کر لیا تھا، بری طرح سے پھنسنے کی وجہ سے اس کا دماغ تیزی سے موجودہ حالات سے نپٹنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

اتفاقاً اس کے علم میں یہ بات آگئی تھی کہ اسے بے ہوش کرنے کے لیے گیس فائر کی جانے والی ہے ابھی وہ کسی لائن آف ایکشن کو فائنل نہیں کر پایا تھا کہ دروازے کے نیچے سے بے ہوش کر دینے والی دودھیا رنگ کی گیس اندر اسپرے کی جانے لگی تو اجیت ورما نے سانس روک لی اور پچھلے پیروں دوڑتا ہوا واپس حال میں آگیا اور پھر وہاں سے مین انٹرس کی طرف جانے والی راہداری میں مڑنے ہی والا تھا کہ اس کی نظریں ہال کے ایک طرف بنی ہوئی سیڑھیوں پر پڑی جن کی بناوٹ ایسی تھی کہ وہ گولائی میں گھوم کر اوپر کی طرف جا رہیں تھیں، اس نے اپنا ارادہ مین انٹرس کی طرف جانے کی بجائے چھت پر جانے سے بدل لیا، اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا سیڑھیوں کا اختتام ایک چھوڑے سے کمرے میں ہوا۔

اس نے کمرے میں موجود اکلوتے دروازے پر موجود ہینڈل کو گھماتے ہوئے دباؤ ڈالا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ دروازہ لاک ہے اس نے پینٹ کی پاکٹ میں سے ایک مڑی ہوئی تار نکالی اور کی ہول میں ڈال کر مخصوص انداز میں گھمانے لگا چند لمحوں بعد ہی لاک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا، اس نے تار واپس جیب میں رکھ لی اور بیگ کی ایک زپ کھول کر اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس میں ایک دستی بم دبا ہوا تھا۔

دوسری طرف چھت پر یقیناً کئی مسلح فوجی موجود تھے جن سے ٹکراؤ یقینی تھا، اس نے دروازے کے سامنے سے سائیڈ میں ہٹتے ہوئے

Digitized by Google

دروازے کو آہستگی سے کھول دیا۔

دوسری طرف چھت پر موجود فوجی شاید اسی کا انتظار کر رہے تھے، دروازے کے کھلتے ہی فوجیوں نے بنا یہ کنفرم کیے کہ دوسری طرف کون ہے انہوں نے اپنی گنوں کے دہانے دروازے پر کھول دیئے اور اس وقت تک گولیاں برساتے ہے جب تک دروازے کے پرخچے نہیں اڑ گئے۔

اجیت ورما کی بروقت احتیاط کام آگئی جو اس نے دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑے ہوتے وقت کی تھی ورنہ ابتک اس کا جسم لاتعداد گولیوں سے مکھیوں کا چھتہ بن چکا ہوتا۔

جیسے ہی برسٹ ختم ہوا اس نے ہینڈ گرنیڈ کی پن نکالتے ہوئے باہر چھت کی طرف اچھال دیا اس کے ساتھ ہی ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا جس میں انسانی چیخوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

دھماکے کی بازگشت ختم ہوتے ہی اجیت ورما نے اپنی بغل میں لٹکتے ہوئے ہولسٹر سے مشین پسٹل نکال لیا اور اسے فائرنگ پوزیشن میں لیے ہوئے چوکنے انداز میں باہر کھلی چھت پر آ گیا یہاں ہر طرف انسانی اعضاء بکھرے ہوئے تھے۔ ادھر اُدھر کئی کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں۔

کچھ فاصلے پر ایک فوجی جان کنی کے عالم میں پڑا سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا موت کی زردی اس کے چہرے پر تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی اس کے نرخرے میں دستی بم کا ٹکڑا پیوست ہونے کی وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی ایڑیاں رگڑتے ہوئے اس کے حلق سے محض غرغراہٹ سے مشابہ آوازیں نکل رہی تھیں۔

اسے دیکھ کر اجیت ورما کے چہرے پر سفاکی کے آثار گہرے ہوئے اور پھر اس نے پسٹل فوجی کی طرف سیدھا کر کے ٹریگر دبا دیا۔

دل میں لگنے والی ایک گولی سے ہی ایڑیاں رگڑتے ہوئے فوجی کے ہاتھ پیر سیدھے ہو گئے۔

اس نے تھوڑی سی دیر میں ہی وسیع و عریض چھت کو چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھ لیا عمارت کے سامنے اور دونوں سائیڈوں والی اطراف میں باونڈری وال اصل عمارت سے کافی فاصلے پر تھی، اور تینوں اطراف میں باغیچے بنائے گئے تھے جو اس وقت درجنوں فوجیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

وہ شاید عمارت کے اندر داخل ہونے کا رسک اس لیے نہیں لے رہے تھے کہ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بے ہوش کرنے والی گیس اندر پمپ کی تھی لامحالہ اس گیس کا اثر کچھ دیر تک تو باقی رہنا تھا۔

البتہ عمارت کی پچھلی دیوار عمارت کا ہی حصہ تھی چھت کا آخری سرا اسی دیوار پر تھا اجیت ورما نے دیوار پر سے جھانک کر دوسری طرف دیکھا تو اسے دور تک خودرو جھاڑیاں ہیولوں کی مانند نظر آئیں اب اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسی طرف سے نیچے اترنے کی کوشش کرتا۔

اس نے پیچھے مڑ کر ایک نظر کچھ فاصلے پر موجود اس دروازے کی طرف دیکھا جو گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا ابھی تک وہاں سے کوئی محافظ نمودار نہیں ہوا تھا۔ مگر مزید دیر کرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

وہ چھت پر موجود چند فٹ کی دیوار پر چڑھ کر

Digitized by

دوسری طرف لٹک گیا اب وہ زمین سے تیس فٹ کے لگ بھگ اونچائی پر فضا میں جھول رہا تھا چند سیکنڈ اسی طرح فضا میں جھولنے کے بعد اس نے منڈیر چھوڑ دی چند لمحوں بعد جیسے ہی اس کے پاؤں زمین سے لگے تو اس نے جسم کو جھٹکا دے کر الٹی قلابازی لگائی اور پھر کسی ماہر جمناسٹر کی طرح بیک فلپس (الٹی قلابازیاں) لگاتا ہوا دور تک چلا گیا۔

دوسری منزل سے چھلانگ لگانے کے باوجود اس کے جسم پر خراش تک نہیں آئی اور وہ بالکل صحیح سلامت نیچے اترنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس نے تکبر بھرے انداز میں مڑ کر ایک نظر ریسرچ سینٹر کی طرف دیکھا اور پھر قد آدم جھاڑیوں کی اوٹ میں چوکڑیاں بھرتا ہوا اپنی کار کی طرف روانہ ہو گیا جو وہاں سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں موجود تھی چند منٹ میں ہی وہ کار تک پہنچ گیا اور پھر وہاں سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جبکہ اس کے عقب میں ناقابل تسخیر سمجھی جانے والی ایڈوانس ریسرچ سینٹر کی وسیع و عریض عمارت میں سائرن اس طرح چیخ رہے تھے جیسے کوئی دوشیزہ بھری جوانی میں بیوہ ہونے پر بین کر رہی ہو۔

☆.....☆.....☆

تا حد نگاہ پھیلے ہوئے ریگستانی ٹیلوں کے درمیان کالی ناگن جیسی سیاہ بل کھاتی ہوئی سنسان سڑک پر فور بائے فور جیپ تیز رفتاری کے نئے ریکارڈ قائم کرتی ہوئی بھاگی چلی جا رہی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر ایک انتہائی وجیہہ نوجوان بیٹھا ہوا تھا اس کے چہرے پر کھلنڈرانہ پن ہونے کے باوجود اس کی شخصیت مرعوب کن تھی کھلتے ہوئے رنگ پر ستواں ناک گہری براؤن آنکھیں اور ان میں موجود ذہانت کی مخصوص چمک اس کی پرسنیلٹی کو چار چاند لگا رہی تھی۔

وہ ڈرائیونگ کرنے کے ساتھ آڈیو پلیئر پر چلنے والے ویسٹرن گیت کو ساتھ ساتھ گنگنا رہا تھا کہ اچانک ہی اس نے ایکسیلیٹر پر سے پیر اٹھا کر بریک پیڈل کو پوری قوت سے دبا دیا اس طرح یکدم بریک لگنے سے جیپ ایک جھٹکے سے رکتے ہوئے گھوم گئی۔

جیپ کے ٹائر جام ہونے کے باوجود چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دور تک گھسٹتے چلے گئے جس کی وجہ سے ٹائر جلنے کی ناگوار بدبو فضا میں پھیل گئی جبکہ چرچراہٹ کی آواز ویرانے میں دور تک گونج گئی۔

نوجوان بدبو سے بے پرواہ ایک ٹک ونڈ سکرین کو دیکھے جا رہا تھا جس پر آڑے ترچھے انداز میں کچھ ہندسے ظاہر ہو رہے تھے۔

یہ ہیڈ کوارٹر سے اس کے ساتھ رابطے کا کاشن تھا پھر جیسے ہی ہندسے واضح ہوئے تو نوجوان کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے وہ چند لمحوں تک بے یقینی کے عالم میں ان ہندسوں کو گھورتا رہا۔

ایسا کیا مسئلہ بن گیا کہ مجھ سے اس طرح رابطہ کیا گیا ہے۔

اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھرتی سے اپنا والٹ نکال لیا، اس میں مختلف قسم کے کارڈز موجود تھے۔ اس نے ایک سرخ رنگ کے کارڈ کو نکال کر ہاتھ پر رکھ لیا کارڈ کے درمیان میں سفید رنگ سے ٹرپل فائیو کے ہندسے لکھے ہوئے تھے اس نے کارڈ کے ایک کونے کو پکڑ کر فولڈ کر دیا ہارڈ پلاسٹک کے کارڈ کا کونہ ایسے فولڈ ہو گیا

Digitized by Google

جیسے وہ موم کا بنا ہوا ہو جیسے ہی کارڈ کا کونہ فولڈ ہوا۔ کارڈ میں وائبریشن پیدا ہوگئی، وائبریشن کے پیدا ہوتے ہی جیپ کی ونڈ سکرین پر نظر آنے والے ہنڈ سے غائب ہوگئے اور کارڈ میں سے ایک مشینی آواز برآمد ہوئی۔

ہیلو ٹرپل فائیو چیف تم سے بات کرنا چاہتے ہیں...؟

مشینی آواز نے اسے کوڈ نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مشینی آواز نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد ،،اوور، یا راجر۔نہیں کہا تھا کیونکہ یہ دنیا کا جدید ترین ٹرانسمیٹر سسٹم تھا جس میں فریقین کو اپنی بات کے اختتام پر، اوور، یا، راجر جیسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

او کے کرواؤ بات۔

نوجوان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کارڈ میں سے چیف کی بھاری اور جاندار آواز برآمد ہوئی ہیلو کیپٹن تنویر تم اس وقت کہاں ہو۔

سر،، میں ایک کیس کے سلسلے میں چولستان میں موجود ہوں۔

کیپٹن تنویر نے مودبانہ لہجے میں جواب دیا،

تم ایسے کرو کے نزدیکی چھاؤنی پہنچو وہاں سے ہیلی کاپٹر لو اور فوراً ہیڈ کوارٹر پہنچو میں چھاؤنی کے کمانڈنگ آفیسر کو تمہارے بارے میں کہہ دیتا ہوں،

چیف نے بدستور سپاٹ لہجے میں آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

او کے، سر، میں پہنچ جاتا ہوں۔

ویسے، سر، خیریت تو ہے نا.....؟

کیپٹن تنویر نے حیرت سے پوچھا۔کیونکہ چیف کے لہجے میں پریشانی آخری درجے کو چھو رہی تھی۔

خیریت نہیں ہے، تنویر، بس یوں سمجھ لو کہ ہمارا ملک اپنی تاریخ کے سب سے مشکل دور سے گزر رہا ہے تم فوراً، پہنچو باقی باتیں یہیں ہوں گی، گڈ بائے چیف نے بائے کہتے ہی رابطہ منقطع کر دیا۔،

کال ختم ہوتے ہی کارڈ کا کونا خود بخود سیدھا ہو گیا تو کیپٹن تنویر نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کارڈ کو واپس والٹ میں رکھ لیا۔اور ایک بار پھر جیپ کو گیئر میں ڈال دیا۔خطرناک حد تک تیز ڈرائیو کرنے کے باوجود اسے چھاؤنی پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگ ہی گیا اور پھر وہاں سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے مسلسل تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد بالآخر وہ ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔

سپر سپیشل سروس کا یہ ہیڈ کوارٹر دارلحکومت کی مصروف ترین شاہراہ کے قریب ایک پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ہیڈ کوارٹر کی قلعہ نما عمارت بہت پرشکوہ اور جدید دور کے آرکیٹیکچر کا شاندار نمونہ تھی اس کو پہاڑی پر اس انداز سے ڈیزائن کیا گیا تھا کہ اس میں کھڑے ہو کر پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا، جبکہ عمارت کی سکیورٹی مسلح محافظوں کی بجائے سائنسی آلات کے خودکار نظام کے ذریعے کی گئی تھی۔

جس کی وجہ سے کسی شخص کا عمارت میں زبردستی گھسنا ناممکنات میں سے تھا۔

اس عمارت کے خلاف زمینی یا فضائی کسی بھی کاروائی کی صورت میں اس میں قائم کیا گیا خود کار سائنسی نظام مکمل دفاعی صلاحیت رکھتا تھا حقیقت میں کوئی چڑیا بھی اس عمارت کو پر نہیں مار سکتی تھی۔،سروس کے چیدہ چیدہ افراد کو ہی معلوم تھا کہ یہ عمارت سپیشل سروس گروپ کا ہیڈ کوارٹر ہے

Digitized by Google

ورنہ عمومی طور پر تمام ایجنٹوں کو ایک سب ہیڈ کوارٹر سے منسلک کیا گیا تھا۔

کیپٹن تنویر نے ہیلی کاپٹر کو ہیڈ کوارٹر کے وسیع صحن میں بنے ہوئے ہیلی پیڈ پر ہی لینڈ کیا تھا۔ البتہ اس نے لینڈنگ سے پہلے چیف کو انعام کر دیا تھا تاکہ حفاظتی حصار کچھ دیر کے لیے آف کروا سکے اب وہ چیف کے دفتر میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا چیف کے چہرے پر تشویش کے بہتے ہوئے آبشار کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

،، سر،، آپ کافی پریشان لگ رہے ہیں کیا کوئی خاص کیس سامنے آیا ہے کیپٹن تنویر نے کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

چیف جواب دینے کی بجائے چند ثانیے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر گویا ہوا، ہاں...، کیپٹن مسئلہ بہت پیچیدہ ہے تمہیں فوراً حرکت میں آنا ہوگا' انڈین سیکرٹ سروس کے ایک ایجنٹ نے ہمارے ایڈوانس میزائل ریسرچ سینٹر سے ایک اہم مشین اور اس کا فارمولا چرا لیا ہے۔

ان دونوں چیزوں کو ہر حال میں واپس لانا ہے، چاہے اس کے لیے جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے چیف نے ایک فائل کیپٹن تنویر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا،

سر،، ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی ،آئے روز اس طرح کی کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی ہے کبھی ہمارے ایجنٹ ان کے ملک سے اہم خفیہ دستاویزات یا سائنسی ایجادات چرا لاتے ہیں اور کبھی وہ اپنے داؤ میں کامیاب ہو جاتے ہیں اس سے کسی خاص حد تک تو نقصان ہوتا ہے لیکن بحیثیت ملک اتنا نقصان بحر حال نہیں ہوتا کہ یہ سمجھا جائے کے یہ ناقابل تلافی نقصان ہے آپ نے ٹرانسمیٹر کال کے دوران ذکر کیا تھا کہ ہمارا ملک اپنی تاریخ کے مشکل ترین دور سے گزر رہا ہے کیا صرف ایک مشین کے چوری ہونے پر یہ بات حتمی طور کہی جا سکتی ہے کہ ہمارا وطن اپنی تاریخ کہ مشکل ترین دور سے گزر رہا ہے اور مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ آپ ایک مشین کے لیے اتنا پریشان ہو رہے ہیں جبکہ میں نے دیکھا ہے کہ مشکل سے مشکل ترین حالات میں بھی کبھی آپ کے چہرے پر شکن تک نہیں آتی،،

کیپٹن تنویر نے موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے اشکال کو لفظوں کی صورت میں چیف کے سامنے دہرا دیا،

کیپٹن تنویر تم بات کو جتنا آسان سمجھ رہے ہو یہ اتنی آسان نہیں ہے میں تمہیں تھوڑا پس منظر سمجھا دیتا ہوں باقی تفصیل تم فائل میں پڑھ لینا۔

تم پروفیسر صدیقی صاحب کو تو اچھی طرح جانتے ہو گے جو ہمارے ملک کے نامور سائنس دان ہیں وہ دنیا میں ایڈوانس میزائل ٹیکنالوجی میں اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں انہوں نے کئی سالوں کی محنت کے بعد ایک میزائل سسٹم بنایا ہے جس کا کوڈ نام ریز آف وال رکھا گیا ہے تمہیں حیرت ہو گی کہ پروفیسر صاحب تو جدید میزائل بنانے کے ماہر ہیں جبکہ اس مشین کے نام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ تو اینٹی میزائل ٹائپ مشین ہے اور حقیقت میں ہے بھی ایسا ہی کیونکہ پروفیسر صاحب نے جس بات کو مدنظر رکھ کر یہ مشین بنائی ہے وہ یہ ہے ہم نے اور ہمارے دشمن ملک نے درجنوں قسم کے تباہ کن میزائل تیار کر لیے ہیں اور یہ خدشہ بہر حال موجود ہے کہ وقت آنے پر دشمن اپنے تباہ کن میزائل ہم پر فائر کرنے میں بخل سے

Digitized by Google

کام نہیں لے گا اسی سوچ کے تحت پروفیسر صاحب نے یہ پروجیکٹ مکمل کیا ہے اور اس کے نتیجے میں بننے والی مشین میں یہ خاصیت ہے کہ جب اسے ایکٹو کیا جاتا ہے تو اس میں سے ایک خاص قسم کی ریز نکل کر آسمان تک پھیل جاتی ہے اور اپنے مرکز سے دائیں بائیں بھی کئی سو کلو میٹر کا احاطہ کر لیتی ہیں ان ریزوں کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ دشمن کی طرف سے فائر کیے جانے والا میزائل چاہے وہ جتنی بھی طاقت کا حامل ہو ان ریزوں سے ٹکرا کر وہیں بلاسٹ ہو جائے گا اس کے برعکس ہماری طرف سے فائر کیے جانے والی گولی سے لے کر میزائل تک ان ریزوں کو با آسانی کراس کر کے ٹارگٹ کو ہٹ کر سکتے ہیں اس طرح کی چند مشینوں سے ہم پورے ملک کی سرحد کو محفوظ بلکہ ناقابل تسخیر بنا سکتے ہیں،،

نیوکلیئر پاور بننے کے بعد ہمارے سائنس دانوں کی یہ دوسری اہم ترین پیش رفت سمجھی جا رہی ہے جس پر عالمی طاقتیں انگشت بدنداں ہو گئی ہیں۔

اب ذرا دوسرے زاویے سے سوچو یہ ٹیکنالوجی ہمارے دشمن کے ہاتھ لگ گئی ہے تو وہ ہمارا کیا حشر کریں گے۔ جبکہ یہ اتنی ایڈوانس تھیوری ہے کہ ہم تو کیا کسی سپر پاور کے پاس بھی اس کا کوئی توڑ موجود نہیں ہے جبکہ تم کہہ رہے ہو کہ ایک مشین کے چوری ہونے سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ چیف نے ریز آف وال سسٹم کی تفصیل بتائی تو کیپٹن تنویر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

آئی، ایم سوری سر، یہ تو واقعی میری سوچ سے بھی زیادہ ایڈوانس ٹیکنالوجی ہے کیپٹن تنویر نے حیرانگی بھرے لہجے میں ریز آف وال کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

بہرحال، اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی میں نے تمام انٹرنیشنل پروازوں کی روانگی تاحکم ثانی روک دی ہیں۔ اس کے علاوہ ٹرین اور بسوں کے جو روٹ دوسرے ممالک کو جاتے ہیں انہیں بھی وقتی طور پر بند کر دیا گیا ہے اسوقت ہماری سروس کے تقریباً تمام ممبر اسی کیس پر کام کر رہے ہیں اب ہماری سب سے پہلی کوشش یہی ہے کہ کسی بھی طرح اس سسٹم کو ملک سے باہر جانے سے روکا جا سکے تمہیں اسپیشل کال کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ قدرت نے تمہیں ایسے معاملوں سے نمٹنے کے لیے خاص حس سے نوازا ہے تمہارا تجربہ بھی اس قسم کے کیسوں میں کافی وسیع ہے مجھے امید ہے کہ تم اس معاملے کو کسی نہ کسی انداز میں ہینڈل کر لو گے اب تک ہم جتنا کام کر چکے ہیں اور جو شواہد ملے ہیں ان کے مطابق تو ریسرچ سینٹر کا کوئی آدمی دشمن سے ملا ہوا ہے کیونکہ دروازوں کو زبردستی کھولنے کی بجائے باقاعدہ چابیاں اور کوڈز استعمال کیے گئے ہیں البتہ لاکر پر کوئی سائنسی حربہ آزمایا گیا ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے سخت سیکورٹی کے باوجود اتنی آسانی سے مشین چرا لی۔

چیف نے اب تک کیے جانے والے اقدامات اور حاصل ہونے والی رپوٹ تنویر کو بتاتے ہوئے کہا۔

شاید صورت حال گمبھیر ہونے کی وجہ سے چیف تفصیل سے بات کر رہا تھا۔

سر... میں سب سے پہلے ایڈوانس میزائل ریسرچ سینٹر کے تمام سٹاف سے ملنا چاہتا ہوں اگر سب سے ایک جگہ اکھٹے ملاقات ہو جائے تو زیادہ بہتر رہے گا اس طرح وقت بچ جائے گا، کیپٹن تنویر نے ٹیبل پر سے فائل اٹھاتے ہوئے

Digitized by Google

کہا۔

میں نے ریسرچ سینٹر کے عملے میں موجود کالی بھیڑ کو ڈھونڈنے کے لیے میجر وقاص کی سربراہی میں ایک ٹیم وہاں بھیجی تھی مگر کامیابی نہیں مل سکی،،

بہرحال ایک بار پھر کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے میں آڈر دے دیتا ہوں کے تمھارے پہنچنے تک وہاں کے تمام سٹاف کو ایک جگہ جمع کرلیا جائے۔

چیف نے اپنے سامنے ٹیبل پر موجود مختلف رنگوں کے ٹیلی فون سیٹوں میں سے کالے رنگ کے ٹیلیفون کا رسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا تو کیپٹن تنویر نے سر ہلاتے ہوئے فائل کھول لی۔

فائل میں چند صفحات تھے اور ان میں کم وبیش وہی معلومات تھیں جو وہ چیف سے سن چکا تھا۔ فائل میں موجود صفحات کسی خاص میٹریل سے بنے ہوئے تھے کیپٹن تنویر جوں جوں تحریر پڑھتا جا رہا تھا اس کے پڑھے ہوئے لفظوں کا وجود خود بخود صفحہ قرطاس سے مٹتا جا رہا تھا۔

جیسے ہی اس نے آخری سطر پڑھی فائل میں موجود صفحات بالکل کورے ہو گئے جیسے ان پر کبھی کچھ لکھا ہی نہیں گیا تھا۔

میں نے ریسرچ سینٹر کے سکیورٹی انچارج سے کہہ دیا ہے وہ تمھارے وہاں پہنچنے تک تمام عملے سے تمھاری ملاقات کا بندوبست کر لے گا۔ چیف نے اس مخاطب ہوتے ہوئے کہا،

ٹھیک ہے سر میں پہلے وہاں سے چکر لگا آوں پھر ہی کوئی لائن آف ایکشن ترتیب دوں گا کیپٹن تنویر نے جواب دیتے ہوئے کہا اور پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

(جاری ہے)

غزل

کبھی جو وقت پر جائے
تمہیں مجھ سے بچھڑنا ہو، تمہیں وعدے سے پھرنا ہو

تو بے شک دیر مت کرنا مجھے ناراض کر دینا
تم اپنا رخ بدل لینا، تم اپنی سمت چل دینا

مگر جب لوٹ کے آنا تمہیں مٹی کے ٹیلے پر
میں شاید نہ دکھائی دوں مگر حیران مت ہونا

وہیں دو چار قدموں پر مزارِ بیکراں ہوگا
وہیں ایک پھول رکھ دینا اور ایک شمع جلا دینا

اور اپنا رخ بدل لینا.....
یہی تو ہے دنیا کی ریت
..........*

ماں

میرے نورِ نظر
ہو سکے تو بس اتنا کرنا
خزاں تلے برگ کے نیچے آ کے
میری شکستہ قبر پہ آ کے کسی سے مل سکے تو
یقین کا پودا لے کر اعتبار کا پانی دینا
اور
اپنی ماں سے مل لینا

پسند: نفیسہ فضل محمود

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com
Digitized by Google

تعارف

میری تحسین، میرا شوق، میرا ذوق، میرا جنون

ادارہ

میری تحسین، میرا شوق، میرا ذوق، میرا جنون کتاب میرے سامنے پڑی ہے اور میری آنکھوں میں وہ مناظر گردش کر رہے ہیں جب میں بچی کہانیاں میں لکھتا تھا اور میری تحریر کے ساتھ دوسری تحریر جو ہوتی تھی وہ ''گڈی آپا'' کی ہوتی تھی۔ میں بڑے ذوق و شوق سے گڈی آپا کی کہانیاں پڑھتا تھا۔ اُن کی تحریروں میں سادہ بیانیہ اور کمال کا اسلوب تھا۔ پہلے جملے سے لے کر آخر تک بندہ سانس لینا بھی بھول جاتا تھا۔ ایک تجسس سا ہوتا کہ اس کے آگے کیا ہوگا۔ گڈی آپا کے قلم میں جادو تھا اور یہ جادو ہر کسی کے سر پہ چڑھ کر بولتا تھا۔

شاعر کبھی بھی دوسرے شاعر کو داد نہیں دیتا اور اِسی طرح کا حال افسانہ نگار کا بھی ہے لیکن میں بطور افسانہ نگار، نقاد، قاری، گڈی آپا کے فن کا گرویدہ ہوں۔۔ گڈی آپا کے نام میں ایک تجسس تھا۔ میں اُن کا اصل نام جاننا چاہتا تھا۔ ملاقات کی جستجو تھی۔ سوچ تھی کہ کسی تقریب میں ملاقات ہو جائے گی لیکن صد افسوس۔۔۔ وقت نے وہ لمحے میسر ہی نہ کیے۔

میں اپنی من پسند لکھاری کو مل تو نہ سکا، دیکھ نہ سکا لیکن اُن کی تحریروں کی چاشنی میں ڈوب کر گڈی آپا سے ہزاروں باتیں کر لیتا تھا۔ غالباً اگست، ستمبر 2015 کی بات ہے۔ بچی کہانیاں کا رسالہ خوشیوں کی بجائے غمناک، درد ناک خبر لے کر آیا۔۔۔ آہ۔۔۔ وہ رسالہ مجھے نہ ملتا۔۔۔ وہ خبر میری نظروں سے نہ گزرتی۔۔۔۔ وہ ایک رولا دینے والا سیاہ دن تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ گڈی آپا ''تحسین اختر'' کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُس رسالے میں اُن کے شوہر ''عبدالقدوس'' کا خط شامل تھا۔ میرا دِل صدمہ میں ڈوب گیا۔۔۔ آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔

وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ بڑے بڑے صدمے، بڑے بڑے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ بھلا ہو علی عمران ممتاز کا جنہوں نے مجھے ''میری تحسین، میرا شوق، میرا ذوق، میرا جنون'' سے ملوایا۔ جی ہاں یہ انوکھی، نرالی، پیاری اور یادوں سے مزین

Digitized by

یاداشت ،سُنہرے لوگوں کی سُنہری باتیں لیے ایک بولتی، مسکراتی کتاب ہے۔

اس کتاب میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں ۔خامیاں ڈھونڈنے کے باوجود نہیں ملتیں ۔معاشرے کا جائزہ لیا جائے تو ہمیشہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ میاں بیوی کے رشتے میں، شوہر بیوی کے گلہ کرتے پائے جاتے ہیں اور بیوی شوہر کی بُرائیاں کرتی نظر آتی ہیں۔لیکن یہاں معاملہ اُلٹ ہے میجر عبدالقدوس وہ واحد شوہر ہیں جو اپنی شریک حیات کے قصیدے پڑھ رہے ہیں ۔اُن کے گن گا رہے ہیں ۔اُن کی حسین یادوں، باتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔اُن سے بچھڑنے کا غم اُن کو کیچوے کی طرح اندر ہی اندر کاٹ رہا ہے ۔وہ بھری دُنیا میں تنہا ہو گئے ہیں۔سب کچھ پا کر بھی اکیلے ہیں۔

بے شک شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے غمگسار ہوتے ہیں ۔اُن میں ایک بچھڑ جائے تو دوسرے کی زندگی اُداس، غم زدہ ہو جاتی ہے ۔میجر عبدالقدوس نے اپنی شریک حیات کی حسین یادوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں اور کتاب کی صورت زندہ رکھ کر خود اپنے ساتھ ساتھ اُن کے بے شمار قارئین کو بھی غم میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔

آپ حیران ہوں گے ،یہ کیسی بات کر دی ۔اُنہوں نے غم میں کیوں مبتلا کر دیا ۔میں بتاتا ہوں جی ہاں ''میری تحسین ،میرا شوق ،میرا ذوق ،میرا جنون'' میں نے جتنی بار بھی پڑھی ہے آنکھیں نم ،دل رنجیدہ ہوا، ایک درد میں تڑپا ہوں ،آنسوؤں میں نہایا ہوں ،بچھڑے والے کے غم میں رویا ہوں ۔میجر عبدالقدوس کا کیا جاتا اگر وہ یہ خبر عیاں ہی نہ کرتے یا کم از کم یہ کتاب سامنے نہ لاتے ۔لیکن وہ سچے ہیں جن کے ساتھ زندگی کے حسین لمحے ،دُکھ سکھ کے لمحے بسر کیے ہوں اُن کو بھلانا کیسے ممکن ہے ۔اور یوں میجر عبدالقدوس نے اپنے دُکھ شیئر کر کے دِل کا بوجھ ہلکا تو کیا۔

قاری اور لکھاری کا رشتہ بڑا انمول رشتہ ہوتا ہے۔ یہ وہی سمجھ سکتا ہے جو اِس منزل تک پہنچا ہوگا ۔''گڈی آپا'' آج بھی میری چشم کی اسکرین میں بیٹھی کاغذ قلم سنبھالے لکھ رہی ہیں ۔اُن کا نام سُنہری حروف میں چمک دمک رہا ہے۔۔۔

میری تحسین ،میرا شوق ،میرا ذوق ،میرا جنون ۔یاداشت پر مشتمل کتاب ہے ۔اس میں گڈی آپا کے مختلف رسائل میں شائع شدہ آٹھ منتخب افسانے شامل ہیں جن میں چند ایوارڈ یافتہ بھی ہیں ۔اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ۔باب اول کو داستان تحسین کا نام دیا گیا ہے جس میں تصویریں بولتی ہیں ۔مختلف جگہوں، مختلف مناظر پر جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ شامل ہیں ۔شادی کے حسین بندھن کی تصویر، سوکھے پھول کی تصویر ۔صفحہ نمبر 2 پر مرجھایا ہوا، سوکھا ہوا پھول کی تصویر دیکھ کر پتھر دِل انسان بھی رو دے گا ۔ہم تو پھر بھی حساس دل والے ہیں ۔ یہ پھول میجر عبدالقدوس نے 1961ء میں تحسین اختر المعروف گڈی آپا کو دیا تھا۔اس تصویر کے نیچے یہ شعر لکھا ہوا ہے۔:

جاتے ہوئے سونپ گئی مجھ ہی کو وہ یہ پھول
شاید اُس کے دل میں یہ خواہش رہی تھی مچل

جنت میں ملیں تو میں پھر کروں یہی حرکت

تصویروں کی دُنیا وقت کے ارتقاء کے ساتھ چلتی ،بڑھتی ہیں جوانی سے بوڑھاپے کی طرف خوبصورتی سے تصویروں کی صورت ایک زمانے کو کوزے میں بند کیا گیا ہے ۔اُن کے لکھے خطوط بھی دِکھائے گئے ہیں ۔یوں میجر عبدالقدوس نے ایک ایک لمحہ محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ اپنی

Digitized by Google

شریک حیات کے ساتھ گزرے پل ہمیشہ کے لیے زندہ اور محفوظ رہیں۔

صفحہ نمبر 9 پر تحسین اختر کے زیر استعمال اشیاء کا عکس دکھایا گیا ہے جن میں ہینڈ بیگ، قلم، پن، مارکر، جیولری، عینک، تسبیح، سرکاری کرسی نوٹ، کتب و رسائل، پاسپورٹ، آئی ڈی کارڈ، شامل ہیں۔

میں گڈی آپا کو بطور افسانہ نگار کے طور پر جانتا تھا لیکن میجر عبدالقدوس نے میری تحسین، میرا شوق، میرا ذوق، میرا جنون کی صورت گڈی آپا کے فن کو مختلف پہلوؤں سے پردہ عیاں کرتے ہوئے ہمیں آشکار کیا ہے۔ تحسین اختر افسانہ نگار، مصور اور شاعرہ بھی تھیں۔ اُن کے چند فن پارے بھی دکھائے گئے ہیں۔ اُن کی کامیابیوں کے اعتراف میں ملنے والی اسناد، ایوارڈز کے عکس بھی دکھائے گئے ہیں۔ صفحہ نمبر 28 سے گڈی آپا کے فن کا اسلوب بطور افسانہ نگار کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ پہلا افسانہ ''لوگ مر جاتے ہیں'' افسانہ کا نام پڑھتے ہی آہیں بھرنے لگتا ہوں۔ دل میں درد کی ٹھیس اُٹھتی ہیں۔ جانے کتنے اپنوں کو اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی تلے چھوڑ آئے ہیں۔

ہاف سیٹ، بادوں کے چراغ، کون دلاں دیاں جانے، زندگی کی کہانی، یہ سب کہانیاں ایوارڈ یافتہ ہیں۔ زندگی کی کہانی میں، کے ساتھ گڈی آپا کا مختصر تعارف بھی شامل ہے جس میں سترہ جون بروز جمعہ المبارک پیدائش کا دن بتایا گیا ہے۔ عجیب عورت، رہے ہم اکیلے، سلام عرض میں چھپی کہانیاں ہیں۔ ان تحریروں کو پڑھ کر گڈی آپا کا فن اسلوب واضح ہو جاتا ہے۔ آپ کے کردار معاشرے کے عام لوگ تھے۔ عام گھروں کے مسائل اور ان کے کرداروں کی کشمکش، ڈائیلاگ کی صورت اِن مسائل کے حل بیان کرتی ہیں۔ کمال فن کے ساتھ سادہ بیانیہ اور عام فہم میں چھوٹی سی بات کو بھی لفظوں کا روپ دے کر بیان کرتے ہوئے واضح کر دیتی ہیں۔۔

تحسین کا غم، آہ گڈی آپا کے عنوان سے وہ خط ہے جو میجر عبدالقدوس نے سچی کہانی کے ایڈیٹر کو گڈی آپا کی وفات کی اطلاع کے لیے ای میل کیا تھا۔ تحسین کو خراج تحسین، میجر عبدالقدوس کی روداد ہے جو اُنہوں نے گڈی آپا کے حوالے سے بیان کی ہے۔ صفحہ نمبر 114 سے لے کر 265 تک شاعری سے مزین ہیں، جس میں نظمیں اور اشعار شامل ہیں۔ حیران کن بات یہ بھی ہے کہ ہر نظم کے نیچے دن اور سال لکھا گیا ہے جب یہ لکھی گئی۔ یہ انوکھا اور تاریخی کام ہے۔

میری تحسین، میرا ذوق، میرا شوق، میرا جنون کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ انمول چیز ہے۔ یہ کتاب ہر باذوق قاری کو بطور ارسال کی جائے گی بشرط یہ کہ حسب استطاعت وہ اپنے قرب میں رہنے والے حاجت مندوں کی حاجت روائی بصورت صدقہ جاریہ یا خیرات فی سبیل اللہ کرے۔ اس کتاب میں خوبصورت، پیارا اور اعلیٰ کاغذ لگایا گیا ہے۔ جو بہت کم کتب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ تحسین اختر المعروف گڈی آپا کو کروٹ کروٹ سکون و راحت نصیب فرمائے اور اُن کے درجات بلند کرتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام نصیب فرمائے آمین۔ میجر عبدالقدوس کی زندگی میں سکون اور خوشیاں قائم رکھے اور اجر و ثواب سے نوازتا رہے۔ دُنیا اور آخرت کی ہر منزل میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے آمین ثم آمین!۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

آپ کی ڈائری

یہ ہے آپ کی پسند' آپ کا انتخاب

قارئین

اوروں پر ہم الزام تراشا نہیں کرتے
مطلب پرستی کے جو عادی نہیں ہوتے
وہ ہاتھ ملا کر کبھی چھوڑا نہیں کرتے
کچھ اس طرح کے لوگ بھی مل جاتے ہیں اکثر
جو پیار تو کرتے ہیں نبھایا نہیں کرتے

خضر حیات۔ روڈہ تھل

انمول موتی

انسان کی پہچان اچھے لباس سے نہیں بلکہ اچھے اخلاق اس کے ایمان سے ہے۔

دعا میں خلوص ہو تو اور آنکھیں پُرنم ہوں تو یہی آنسو دعا کی منظوری کی دلیل ہے۔

دعا میں بڑی قوت ہے جب تک سینے میں ایمان ہے دعا پر یقین رہتا ہے جس کو دعا پر یقین نہیں اس کے دل میں ایمان نہیں۔

ادب کا دروازہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اس میں سے گزرنے کے لیے سر کو جھکانا پڑتا ہے۔

رشتے احساس سے بنتے ہیں رنگ' نسل' چال دیکھ کر تو جانور خریدے جاتے ہیں۔

ہر معذرت کرنے والا نہ تو خطا کار ہوتا ہے نہ کمزور' یہ صفت وفادار لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

.....

غزل

ہم ٹوٹ بھی جاتے ہیں تو چرچا نہیں کرتے
کچھ درد بھی سہتے ہیں تماشا نہیں کرتے
ہم اپنے مفادات کی تکمیل کی خاطر
ہر شخص کے جذبات سے کھیلا نہیں کرتے
ہم کو کوئی گلا ہے تو خود اپنے دل سے ہے

محبتیں

نہ جانے جب محبتیں فنا ہو جاتی ہیں' بچھڑ جاتی ہیں' تو اپنے پیچھے خوش فہمیاں کیوں چھوڑ جاتی ہیں۔ دل ہر وقت ایک ہی آس میں لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ مل جائے گا۔ دکھائی دے گا' پھر سے ہم مل کر خوش اور مطمئن ہو کر ساری غلط فہمیاں دور کر دیں گے اور سب پہلے جیسا ہو جائے گا۔ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیں گے۔ ہم دور تک ساتھ چلیں گے۔ اس بار جب وہ ملے گا تو ہم کبھی بھی نہیں بچھڑیں گے۔ مگر ان ساری خوش فہمیوں کے علاوہ سچ تو یہی ہوتا ہے کہ جو محبتیں فنا ہو جاتی ہیں وہ کبھی بھی دوبارہ نہیں ملتیں' جدائی کے راستے تو بہت طویل ہوتے ہیں جانے والے کبھی بھی لوٹ کر نہیں آتے اگر وہ ہماری قسمت میں ہوتے تو بچھڑتے ہی کیوں؟

..........*

Digitized by Google

ایک شعر

کاغذ کی کشتی تھی پانی کا کنارہ تھا
ہمیں پار جانا تھا کاغذ کا شکارہ تھا
پانی میں قدم رکھا تو ساحل نے ڈرایا تھا
ہم ڈوب نہ جاتے یوں اگر تیرا سہارا تھا

عثمان غنی۔ پشاور

محبت

ہر انسان اپنی زندگی میں ایک بار محبت ضرور کرتا ہے محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ یہ قدرتی جذبہ ہے یہ الگ بات ہے کہ کسی کو محبت مل جاتی ہے اور کوئی ساری زندگی محبت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا ہے اور اُسے محبت ملتی ہی نہیں۔ وہ وفا کی تلاش میں نکلتا ہے تو اُسے وفا نہیں ملتی' مجبور و بے کس محبت کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ دل ٹوٹ جائے تو اس کو سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نازک دل والے حساس طبع اور انسانیت سے پیار کرنے والے لوگ ہوتے ہیں جبکہ سنگ دل لوگ احساس سے عاری ہوتے ہیں ان کے قدموں میں ہزاروں خواب ڈھیروں ارمان تڑپتے سسکتے رہتے ہیں۔ مگر وہ بے حس لوگ بے نیاز ہوتے ہیں خواب ٹوٹیں' دامن چھوٹیں' ساجن روٹھیں وہ ہر حال میں پُرسکون اور دوسرے ماحول سے الگ نظر آتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ محبت تو حساس دل والوں کا ورثہ ہے۔ نفرت اور کدھ کو دل پر سہنا پڑتا ہے۔ شاید حساس دل دونوں محبت کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں کیونکہ اگر جہنم نہ ہو تو جنت کا تصور ہی محال ہے۔ سوچتا ہوں کہ کس طرح یہ لوگ زندگی گزارتے ہیں۔ اشک بھری آنکھوں کے سامنے جب اپنے خواب کی تعبیر نظر آ بھی جاتی ہے تو وہ بڑی بھیانک اور کرب ناک ہوتی ہے اس کی سوچوں سے بالاتر اور پھر اپنی تڑپتی سسکتی اس تعبیر کا ان میں دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتے ہیں۔ دل خون کے آنسو روتا ہے مگر وہ خاموش ہوتے ہیں بظاہر پُرسکون' ہاں یہی محبت ہے محبت کے پاکیزہ رشتے کو امر کرنے کے لیے پاکیزگی ضروری ہے۔

خالی دل فقیر کے کشکول کی طرح
اس شہر بے وفا سے وفا کون لے گیا

خواہشیں

یہ دنیا خواہشات کا قبرستان ہے ہزاروں ارمان پورے ہوتے ہیں تو لاکھوں خواہشیں تشنہ تکمیل رہتی ہیں۔ انسان اپنی ہر خواہش کو آخری سمجھ کر جستجو کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر یہ پوری ہو گئی تو زندگی میں سکون آ جائے گا۔ مگر اسی خواہش کی تکمیل کے ساتھ کئی خواہشات اور سر اٹھائے میدان میں آ جاتی ہیں۔ اور اسی طرح خواہشات کے پیچھے بھاگے عمر تمام ہو جاتی ہے اور جس وقت انسان اپنے انجام کو پہنچتا ہے تو بقول شاعر.....

'ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے'

موجود ہوتی ہیں۔

سو طرح کا خوف ہے زمانے کو آج کل
اس دور میں کسی کو بھی خوف خدا نہیں
دنیا میں وہی لوگ باعث انتشار ہیں
تسبیح جن کے ہاتھ سے ہوتی جدا نہیں

دوسروں کے محل کو دیکھ کر اپنا جھونپڑا گرا دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ روندے ہوئے پھولوں کی کوئی حیثیت نہیں مسلے ہوئے پھولوں کا گلدستہ تو بن سکتا ہے گلے کا ہار نہیں کانٹوں کے بغیر پھول کا حسن نہیں نکھرتا دنیا میں امن اور سکون سے رہنا ہی انسانیت ہے۔ ذات پات کی تفریق اور انتشار ختم ہو سکتا ہے اگر خواہشات ختم کر دی جائیں۔ محبت اور خلوص کا پرچار کرو تو سکون اور راحت ہی ملے گی۔

ڈاکٹر عبدالوحید آصف۔ قلعہ پور

Digitized by Google

معصومیت

معصومیت حسن کا پہلا لبادہ ہے۔
معصومیت ایک خوبی ہے جو ہر ایک کو بھلی لگتی ہے۔
اگر روح بیدار اور فطرت معصوم ہو تو انسان بہت جلد اپنی غلطی سمجھ لیتا ہے۔
معصومیت میں منافقت نہیں ہوتی۔
معصومیت ایک ایسا ہتھیار ہے جو ہر جگہ کام کر سکتا ہے۔

سنہری باتیں

چلتے ہوئے دیکھ کر چلنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ پاؤں کی اڑتی ہوئی دھول میں کسی کی زندگی گم ہو جائے۔
کامیابی کا واحد ذریعہ اللہ پر پختہ یقین اور سخت محنت ہے۔
جب تک مردوں کی نظریں خوب سیرتی پر مرکوز رہیں تب تک عورتوں نے صرف اسی پر توجہ رکھی جب مرد خوبصورتی پر مرنے لگے تو عورتوں نے بھی اسی کی طرف توجہ کر لی۔
لوگ دکھ نہیں دیتے بلکہ ان سے وابستہ توقعات دکھ دیتی ہیں۔
جتنی محنت کر کے لوگ جہنم خریدتے ہیں اس سے آدھی محنت کر کے وہ باآسانی جنت حاصل کر سکتے ہیں۔
غفلت کا عادی شخص کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔
سہارے ڈھونڈنے والے ہمیشہ منزلوں سے دور رہتے ہیں۔

شعر

نجانے کن دردوں کی دوا ڈھونڈ رہا ہوں
آج بھی اس زمانے میں وفا ڈھونڈ رہا ہوں
یہاں تو انسانوں میں ہی انسان نہیں ملتے
پاگل ہوں پتھروں میں خدا ڈھونڈ رہا ہوں
ڈاکٹر عامر شہزاد۔ ننکانہ صاحب

شعر

سالوں بعد اِس نے خط لکھا ہے گاؤں آ جاؤ
اب تو گاؤں کی سڑکیں بھی پکی بن چکی ہیں ماہی

غزل

تمہاری یاد کا موسم
کبھی ہجرت نہیں کرتا
یہ دل کو نوچ لیتا ہے
مہینے ہوں یا سال
یہ دل میں بیٹھ جاتا ہے
پرانے دور کی صورت میں
کسی سرطان کی مانند
رگوں میں پھیل جاتا ہے
بچھڑ کر شاخ یادوں کی
محبت کے گلابوں کو
ثمر ہونے نہیں دیتا
ہمیں سونے نہیں دیتا
کبھی رونے نہیں دیتا
تمہاری یاد کا موسم
کبھی ہجرت نہیں کرتا
شاعرہ: پروین شاکر۔ پسند غلام مرتضیٰ علوی۔ گوجرہ

چڑھتے سورج کو سلام

مشہور فاتح جرنیل نپولین بوناپارٹ کو جب جنگ میں شکست دینے کے بعد انگریزوں نے ایک دور دراز جزیرے میں نظر بند کر دیا تو فرانس کے شاہ پرست اخباروں نے اُس کے خلاف زہر اگلا اور خوش ہوئے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد نپولین اِس جزیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تو انہوں نے اس واقعے پر یہ سرخی لگائی۔ ''وحشی درندہ اپنے قید خانے سے بھاگ نکلا۔'' نپولین نے فوج جمع

Digitized by Google

کرنے کے بعد فرانس کی طرف پیش قدمی کی تو اخباروں نے لکھا۔ ''قاتل فرانس کی طرف نکلا ہے۔'' اور جب نپولین فرانس میں داخل ہوگیا تو انہوں نے یہ سرخی جمائی۔ ''نپولین بونا پارٹ فرانس میں داخل ہوگیا۔'' اور جب وہ پیرس سے چند میل کے فاصلے پر رہ گیا تو اُن اخباروں نے جلی حروف میں اطلاع دی۔ ''عالی مرتبت' جہاں پناہ' شہنشاہِ فرانس کل پیرس میں جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔''

اشعر ظفر۔ کراچی

چھوٹا کام

رزق کا بندوبست کسی نہ کسی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے لیکن میری پسند کے رزق کا بندوبست نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری پسند کے رزق کا انتظام ہونا چاہیے۔ ہم اللہ کے لاڈلے تو ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنے ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے باباجی کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی آپ سے سردیوں میں رضائی مانگے تو اس کے لیے رضائی کا بندوبست ضرور کریں کیونکہ اسے ضرورت ہوگی لیکن اگر وہ یہ شرط عائد کرے کہ مجھے فلاں قسم کی رضائی دو تو پھر اس کو گھر سے باہر نکال دو کیونکہ اس طرح اس کی ضرورت مختلف طرح کی ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ جب ہم باباجی کے پاس ڈیرے پر گئے تو انہوں نے ہمیں مٹر چھیلنے پر لگا دیا۔

میں نے تھری پیس سوٹ پہن کر ٹائی لگا رکھی تھی لیکن مٹر چھیل رہا تھا حالانکہ میں نے ساری زندگی کبھی مٹر نہیں چھیلے تھے پھر انہوں نے لہسن چھیلنے پر لگا دیا اور میرے ہاتھوں سے بو آنا شروع ہوگئی پھر حکم ہوا کہ میتھی کے پتے اور ڈنٹھل الگ الگ کرو۔ اس مشقت سے تو اب خواتین بھی گھبراتی ہیں۔ ہماری ایک بیٹی ہے زونیرا' اس کو کوئی چھوٹا سا کام کہہ دیں کہ بھئی یہ خط پہنچا دینا تو کہتی ہے بابا! یہ معمولی سا کام ہے۔ مجھے کوئی بڑا سا کام دیں اتنا بڑا کہ میں آپ کو وہ کر کے دکھاؤں (کوئی مشن میں جانے جیسا کام شاید) میں نے کہا کہ یہ خط تو پہنچا دیتی' کہنے لگی یہ تو باباجی بس پڑا ہی رہ گیا میرے پاس۔ چھوٹے چھوٹے کاموں سے باپ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہماری زندگی میں ڈسپلن آئے۔

اشفاق احمد کی تصنیف ''زاویہ'' سے اقتباس

نورین جبران' کراچی۔

خیالِ جدائی

☆ شب بخیر' شب بخیر' جدا ہونا اتنا میٹھا غم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی' میں تمہیں شب بخیر کہتا رہوں گا۔ (ولیم شیکسپیئر)

☆ محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ڈرائی ڈن)

☆ موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے بیچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ (الیور گولڈ اسمتھ)

☆ جدائی دل کی پیاس بڑھا دیتی ہے۔ (بیلی)

☆ جدائی بعض اوقات دوستی میں رس گھول دیتی ہے اور اسے زیادہ میٹھا بنا دیتی ہے۔ (جے ہوویل)

☆ جانے والا اُن لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایڈورڈ ڈیولاک)

☆ ہر جدائی موت سے مشابہت ہے۔ (جارج ایلیٹ)

مرسلہ: صبا دانش' کراچی۔

نمائندگی

امریکا کی ایک سڑک پر ایک جنازہ جا رہا تھا۔ ایک ہندوستانی کو یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ تابوت کے ہمراہ گولف کھیلنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے جنازے میں شریک ایک شخص سے دریافت کیا۔ ''یہ شخص یقیناً زندگی میں گولف کا اچھا کھلاڑی رہا ہوگا؟''

''رہا ہوگا سے آپ کا کیا مطلب ہے؟'' اُس نے جواب دیا۔ ''وہ اچھا کھلاڑی ہے' تبھی آج کا فائنل کھیلنے کی وجہ سے وہ اپنی بیوی کے جنازے میں شریک نہیں ہوسکا اس لیے اس کے گولف کا سامان نمائندگی کی صورت ہمراہ ہے۔''

شائلہ نوید۔ کراچی۔

☆☆.....☆☆

Digitized by

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/500 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/500 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1).....مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2).....منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3).....اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

C II 88- خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

Digitized by Google

بلند فشار خون کے لیے دوا دستیاب ہے

دانتوں کے جملہ امراض کے لیے اکثیر دوا ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے' اپنا آرڈر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

□ M.A.B۔کراچی

○ محترم بابا جی السلام علیکم! میں خیریت سے رہ کر آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ میرا نام مرزا احمد بیگ اور والدہ کا نام جمیلہ بیگم ہے بابا جی میں آپ کے بتائے ہوئے وظائف پڑھتا رہا ہوں اور ان وظائف سے فائدہ اٹھاتا رہا ہوں میں گزشتہ 15 سال سے بیرون ملک مقیم ہوں۔ بابا جی مجھے آپ سے روزگار کے لیے وظیفہ درکار ہے میں گزشتہ کئی مہینوں سے فجر کے بعد سورۃ رحمٰن اور مغرب کے بعد سورۃ واقعہ کی تلاوت کرتا ہوں اور درود شریف بکثرت پڑھتا ہوں۔ بابا جی میں جب سے بیرون ملک کینیڈا آیا ہوں شروع ہی سے روزگار کے معاملات بہت خراب رہے ہیں نوکری کبھی ہوتی ہے اور کبھی بہت زیادہ کام کرنے کے باوجود بھی گزارا بہت مشکل سے ہوتا ہے حالانکہ یہاں آ کر میں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے کیا وجہ ہے کیا رکاوٹ ہے سمجھ نہیں آتی حالانکہ میں نے ہر طرح کے وظیفے جس جس نے پڑھنے کو کہا میں نے وہ پڑھا لیکن روزگار کے معاملات اُلجھتے ہی جا رہے ہیں بابا جی آپ سے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ کسی نے روزگار کی بندش تو نہیں کروائی ہے اور یہ کہ میں جس شہر میں رہ رہا ہوں وہ بہتر ہے یا میرے لیے ٹورنٹو بہتر رہے گا۔ آپ سے آسان اور زود اثر وظیفہ کی درخواست ہے۔ اگر آپ میرے مسئلہ کا حل شمارے میں دے دیں تو بہت عنایت ہوگی

☆ بیٹے! تمہارا ہاتھ تنگ ہونے کی سب سے بڑی وجہ اللہ کی راہ میں نہ دینا ہے۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ ان 15 سال میں تم نے مجھے کچھ بھجوایا ہو جس سے میں جائز ضرورت مندوں کی مدد کر سکوں۔ جب اللہ کی راہ میں نہیں دو گے تو وہ بھی ہاتھ تنگ کر دے گا اور یہی تمہارے ساتھ ہو رہا ہے کہتے ہیں نا کہ اللہ کے ساتھ تجارت کرنے والے کبھی ناکام ہیں ہوتے تو تم بھی اللہ کے ساتھ تجارت کرو اس کی راہ میں دو ٹورنٹو جانا بہتر رہے گا۔

□ مومنہ بتول۔کراچی

○ بہت محترم مکرم عزیزم بزرگوار السلام علیکم! اللہ رب العزت سے امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے حضور والا میں آپ کے ادارے کی ایک ادنیٰ

اطلاعِ عام

قارئین بھائی' بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ اس نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: II-C-88۔فرسٹ فلور۔خیابانِ جامی کمرشل۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7' کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔021-35893121-35893122

Digitized by Google

چہرے پر رونق نہیں ہے' کیل مہاسے' جھائیاں
ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے خالص
جڑی بوٹیوں سے تیار دوا بچی کھانیاں کے دفتر سے
حاصل کی جاسکتی ہے۔

لکھنے والی ہوں مسئلہ یہ ہے کہ میرے بیٹے عمریں بالترتیب 24 اور 22 سال اور بچی 25 سال کی میں ان کے بال ایک دم ختم سے ہورہے ہیں آگے بال بالکل ختم ہوکر گنج پن نمایاں ہورہا ہے بچی کے سر میں خشکی سکری بہت ہے بال کمزور رو کھے ہیں میں ان تینوں کے لیے آپ کا تیار کردہ تیل اور دوا منگوانا چاہتی ہوں بس آپ دعاؤں میں شامل کرلیں اس خط کا جواب ماہ دسمبر میں ضرور دیں میں منتظر رہوں گی بہت سلام کے ساتھ۔

☆ بیٹی مومنہ! بچوں کے بال کم ہونے کی وجہ موروثی بھی ہوسکتی ہے مگر تم اُن کی غذا پر توجہ دو میں تیل تیار کردوں گا' بچی کھانیاں کے آفس سے منگوالینا۔

□ شجاعت علی۔ ہزارہ۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا چھوٹا بچہ پیدائشی بیمار ہے۔ اب اس کی عمر چار برس ہے۔ ہم نے اس کا بہت علاج کرایا ہے۔ جب سے پیدا ہوا ہے کوئی نہ کوئی بیماری لگی رہتی ہے۔ مختلف قسم کے علاج کراتے کراتے وہ اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ چل پھر نہیں سکتا۔ اب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کو دماغ کی بیماری ہوگئی ہے۔ ہم نے اس کے دماغ کا C-T اسکین بھی نکلوایا ہے۔ پشاور والے ڈاکٹروں کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر اس کو دَم دُرود کرائیں تو یہ اور زیادہ خراب ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کون سی بیماری ہے۔ میں نے ایک مرتبہ عصر کی نماز کے بعد دَم کیا اور عشاء کی نماز کے بعد ابھی اس کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کو جھٹکے لگے۔ اس کی حالت بگڑ گئی۔ اس نے پوری رات جھٹکوں میں گزاری۔ اب اسے ایک بزرگ سے دَم کرا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں' اس پر کوئی سایہ ہے۔ بچہ جب ماں کے پیٹ میں تھا' تب اسے سایہ ہوا ہے۔ برائے کرم کوئی حل بتائیں۔

☆ بیٹے! اللہ تعالیٰ بچے کو مکمل شفا دے۔ بچے پر صرف سورۃ ناس 3-3 بار نماز عصر اور نماز مغرب کے بعد پڑھ کر دَم کردیا کرو۔ زیتون کے تیل کی مالش ترک کردو اور مجھ سے دم کیا ہوا تیل اور تعویذ منگوالو اللہ تعالیٰ ضرور کرم فرمائے گا۔

□ راشد سرور۔ اوکاڑہ

○ باباجی! میں نے سچی کہانیاں میں آپ کا اشتہار دیکھا دبلے پن کے علاج کا' میں بہت دبلا ہوں حالانکہ بہت کھاتا ہوں مگر جسم پر گوشت ہی نہیں ہے سب لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں گھر میں کوئی بھی دبلا نہیں ہے بلکہ میری بہنیں تو کافی صحت مند ہیں پتہ نہیں میں ایسا کیوں ہوں آپ مجھے ایسی دوا دیں کہ میں خوب موٹا ہوجاؤں۔

☆ بیٹے ارشد! تم پریشان مت ہو ہر چیز کا علاج ہوسکتا ہے بس انسان مثبت سوچ رکھے۔ مجھے اپنی عمر قد اور وزن ارسال کرو میں علاج تجویز کردوں گا۔ انشاء اللہ فرور فائدہ ہوگا۔

□ طاہرہ۔ گلگت

بے اولاد جوڑوں کے لیے شرطیہ علاج' بانجھ پن یا کسی اور وجہ سے اگر اولاد نہ ہوتی ہو تو فوری رابطہ کریں۔ اور چند ماہ کے علاج کے بعد اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں کھلائیں۔

Digitized by Google

بالوں کا گرنا' خشکی' بے جان بال ان سب کے لیے جڑی بوٹیوں سے تیار 150 سو سال پرانا نسخہ..... اب آپ بھی حاصل کرسکتے ہیں ۔رابطہ 35893121-35893122.....

o بابا جی ہمارا علاقہ بڑا دشوار گزار ہے بڑی مشکل سے سچی کہانیاں دستیاب ہوتا ہے میرا دیور کراچی آیا ہوا ہے وہ مارچ کے مہینے میں واپس آئے گا آپ سے درخواست ہے کہ مجھے زخموں والی دوا' دانتوں والی دوا اور تیل کی 4-4 بوتلیں بھجوا دیں بار بار منگوانا ممکن نہیں میں نے پہلے بھی یہ استعمال کی ہیں اور بہت فائدہ ہوا ہے۔اس کے علاوہ بابا جی میرا بہنوئی بہن کو بہت تنگ کرتا ہے اس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں یا تعویذ بہن کے بچے چھوٹے ہیں وظیفہ کرنا مشکل ہوگا۔

☆ بیٹی طاہرہ! اپنے دیور سے کہنا دفتر آنے سے دو دن قبل فون کر کے بتا دے اور رقم ایزی پیسہ کے ذریعے ارسال کر دے میں ادویات سچی کہانیاں کے دفتر بھجوا دوں گا بہن کے لیے تعویذ بھی تیار کر دوں گا مگر اس سے کہو نماز پابندی سے پڑھا کرے اور بدزبانی نہ کرے اللہ سب اچھا کرے گا۔

□ شہانہ۔کراچی

o محترم بابا جی! السلام علیکم! ''سچی کہانیاں'' میں لوگوں کے مسائل اور آپ کے بتائے ہوئے حل پڑھ کر میں نے سوچا کہ میں بھی اپنا مسئلہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ہم تین بہن بھائی ہیں۔ ہمارے ابو اور پھوپھی چاہتے ہیں کہ ہماری شادی پھوپھی کے گھر ہو جبکہ وہ لوگ بالکل جاہل اور اَن پڑھ ہیں۔ہم بھی اتنے زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں مگر اچھے برے کی تمیز کر سکتے ہیں۔ میری امی' خالہ اور ماموں چاہتے ہیں کہ ہماری شادی خالہ کے گھر ہو۔خالہ نے ہمارے رشتے کی بات کی بھی تھی مگر یہ بات طے نہ ہو سکی۔میرے ابو نے صاف انکار کر دیا۔ پلیز' آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کے پڑھنے سے ہمارے من کی مرادیں پوری ہو جائیں۔ میں اور میری بہن نماز کی پوری پابندی کرتے ہیں۔اگر ہمارا یہ مسئلہ حل ہو گیا تو میں تمام عمر آپ کو دعائیں دیتی رہوں گی۔

☆ بیٹی شہانہ! نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔نماز عشاء کے بعد سورۃ الکوثر آیت 24 ایک سو گیارہ' ایک سو گیارہ بار پڑھو اور دعا کرو۔مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ اُم ارباب۔جڑانوالہ۔

o السلام علیکم! بابا جی! میں نے اپنے شوہر کے روزگار کے لیے آپ سے جو وظیفہ منگوایا تھا' اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہ کامیاب ہوا ہے اور میرا شوہر جو دو سال سے بے روزگار تھا' اسے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں بابا جی! اب آپ کو ہمیشہ دعا دیتی رہوں گی۔

☆ بیٹی ارباب! اللہ تعالیٰ تمہیں شاد و آباد رکھے۔ بیٹی! بگڑے کام وہی غفور الرحیم بناتا ہے جو ہم سب کا مہربان آقا ہے اس لیے میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور نماز باقاعدگی سے پڑھتی رہنا۔

□ زینب بی بی۔ملتان۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! بہت سے بیمار

وہ بچے اور بچیاں جو دبلے پن سے پریشان ہیں اور لوگوں کے ہتک آمیز جملوں کا نشانہ بنتے ہیں فوری طور پر رابطہ کریں 2 مہینے کے علاج سے اس مسئلے سے جان چھوٹ جائے گی۔

Digitized by Google

اندرونی اور بیرونی زخموں' آپریشن کے بعد ٹانکوں کا کچارہ جانا یا کسی بھی قسم کی چوٹ کے لیے دوا دستیاب ہے۔ جن گھروں میں چھوٹے بچے ہیں وہاں اکثر کھیل کود کے دوران سر پر چوٹ لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوا سر میں خون جمنے نہیں دیتی' دوا حاصل کرنے کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کریں۔

آپ کی وجہ سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔ یہ نیکیاں جو آپ کما رہے ہیں' ان کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ میں بھی آپ کو بڑی امید کے ساتھ خط لکھ رہی ہوں۔ ایک مسئلہ میرا ہے اور دوسرا میری بہن کا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے شادی سے نفرت ہے میں شادی نہیں کرنا چاہتی شاید اس کی وجہ میرا بہنوئی ہے جو میری بہن کو بہت مارتا ہے اُسے ہم سے ملنے بھی نہیں دیتا آپ اللہ کے نیک بندے ہیں عورتوں سے نہیں ملتے اس لیے میرا آپ پر ایمان ہے ہماری مدد کریں۔

☆ بیٹی زینب! نفرت بہت سخت لفظ ہے تم دراصل ڈر گئی ہو۔ بہن سے کہو کہ نماز عشاء کے بعد سورۃ فتح آیات 7 تینتیس' تینتیس بار پڑھے اور دعا کرے۔ مدت 2 ماہ ہے۔ مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ کرم ہوگا۔

□ دردانہ۔ سرگودھا۔

○ محترم بزرگ باباجی! السلام علیکم! میں نے اس وقت آپ سے مدد کی درخواست کی تھی جب میرے سسرال والے میرے شوہر پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کرلیں کیونکہ شادی کے 11 سال بعد بھی میری گود ہری نہیں ہوئی تھی اور مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا دی جا رہی تھی۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ اولاد نہ ہونے کی سزا صرف عورت کو دی جاتی ہے۔ خیر' اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔ میں نے آپ سے رجوع کیا اور آپ نے مجھے جو تعویذ اور وظیفہ دیا' اسے خلوص دل سے مکمل کیا تو اللہ پاک نے میری دعائیں قبول فرمائیں۔ آپ کا بہت شکریہ باباجی! اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے تاکہ آپ اسی طرح ضرورت مندوں کے کام آتے رہیں۔

☆ بیٹی دردانہ! اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں اولاد نرینہ عطا فرمائے۔ بیٹی! میں تو اس رحیم وکریم کا عاجز اور عاصی بندہ ہوں۔ جو بھی کرتا ہے' وہی مہربان آقا ہی کرتا ہے اس لیے میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا نہ بھولنا اور نماز پابندی سے جاری رکھنا۔

□ شازیہ۔ سیالکوٹ۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ والد ریٹائرڈ ہیں۔ ہم سب تعلیم یافتہ ہیں۔ دو بھائی اور دو بہنیں بڑی ہیں لیکن ہم چاروں بے روزگار ہیں۔ بہت کوشش کے باوجود کہیں نوکری نہیں ملتی اس لیے گھریلو حالات خراب ہیں اور ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ کوئی ایسا آسان وظیفہ عنایت فرمائیں کہ ہمیں اچھی پوسٹ پر نوکری مل جائے اور گھریلو حالات درست ہو جائیں۔ میری بڑی بہن کی دو سال پہلے شادی ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے بھی لڑائی جھگڑے ہوتے رہے۔ اب بات بہت بڑھ گئی اور میری بہن کو ہمارے پاس

بچیاں جن کی شادی میں رکاوٹ ہے اپنی والدہ کے نام کے ساتھ لکھیں کلام الٰہی سے شرطیہ علاج انشاء اللہ چند دنوں میں رکاوٹ دور ہوں گی اور من پسند شخص ملے گا۔

Digitized by Google

چھوڑ کر خود کراچی چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس کی بیٹی ہو کر فوت ہوگئی۔ بہن کی طویل بیماری کے اخراجات بھی ہم نے خود برداشت کیے۔ اب ڈیڑھ سال سے نہ بہنوئی لینے آتا ہے نہ ہی کوئی خرچ دیتا ہے اور نہ رکھتا ہے۔ چونکہ میرے بہنوئی نے والدین کی مرضی کے بغیر شادی کی تھی اس لیے ان کے والدین کا رویہ حد سے زیادہ خراب ہے۔

☆ بیٹی شازیہ! حالات اچھے اور برے انسان کسی حد تک خود کرتا ہے۔ درست سمت میں کوشش کرو۔ ضروری نہیں ہے کہ نوکری ہی کرو۔ گھر بیٹھے بھی مثبت کام کرسکتی ہو۔ بچوں کو ٹیوشن دو پھر جب کوئی دوسری صورت نظر آئے تو وہاں بھی کوشش کرو۔ فیصلہ تمہاری بہن کو خود کرنا ہوگا۔ اگر وہ سمجھتی ہے کہ ساتھ رہنا ممکن نہیں تو علیحدگی اختیار کرلے۔ نماز عصر اور نماز عشا کے بعد سورۃ جن آیت 27' 99-99 بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ راحیلہ۔ کھاریاں۔

○ محترم بابا جان! السلام علیکم! میری شادی کو 22 سال ہوگئے ہیں۔ شروع کے چند دنوں میں جو خوشیاں دیکھیں' پھر نصیب نہ ہوئیں۔ بابا جان! ہر طرف سے مایوس ہو کر خدا اور خدا کے رسول کے بعد آپ سے مدد مانگتی ہوں۔ میرے چار بچے ہیں' 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی کی شادی کردی ہے۔ بڑے بیٹے نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ باقی دونوں بچے چھوٹے ہیں میں بیوہ عورت ہوں نہ سر چھپانے کا ٹھکانہ ہے اور نہ پیٹ بھرنے کا آسرا سردیوں میں تو وقت بہت اذیت سے گزرتا ہے۔ آپ میرے لیے دعا کریں کہ میری مشکلیں کم ہوجائیں اور مجھے سورۃ یٰسین پڑھنے کی اجازت بھی دے دیں۔

☆ بیٹی راحیلہ! سورۃ یٰسین پڑھنے کی اجازت ہے میں تمہارے لیے خصوصی دعا کا اہتمام کروا رہا ہوں اللہ بہتر اسباب پیدا کرنے والا ہے اسی سے مانگو وہ کرم کرنے والا ہے۔

□ ثنا مجید۔ لاڑکانہ۔

○ بابا جی یہ میری مجبوری ہے کہ میں فرضی نام لکھ رہی ہوں کچھ عرصہ قبل آپ کو خط لکھا تھا کہ میں ایک بھٹکی ہوئی عورت ہوں اور راہِ راست پر آنا چاہتی ہوں آپ سے پہلے جس سے بھی مدد مانگی اُس نے مزید غلاظت میں گرنے کا کہا آپ واقعی میں نیک بندے ہیں جو عورتوں کا پردہ رکھتے ہیں' ملنا بھی نہیں چاہتے' بابا جی میں نے ایک چھوٹی سی دکان کھول لی ہے اور کپڑوں کا کام کرتی ہوں شہر نیا ہے لوگ میرا ماضی نہیں جانتے اگر آپ کی مدد نہ ہوتی تو میں یہ حلال روزی نہ کماپاتی۔ کچھ رقم ہر ماہ آپ کو بھیجنا چاہتی ہوں تاکہ مجھ جیسی لٹی پٹی عورتوں کی مدد ہوسکے اور وہ گناہ کرنے سے بچی رہیں شاید اس عمل کے صدقے میری بھی بخشش ہوجائے۔

☆ بیٹی راحیلہ! اللہ تمہیں ہمیشہ سیدھے راستے پر چلائے بھول جاؤ اپنے ماضی کو بس نماز کی پابندی کرو اور خوب صدقہ خیرات کرو جو گناہ گار راست بازی کا راستہ چن لیتا ہے اللہ بھی جہنم کی آگ اس سے دور کردیتا ہے۔ ہاں تم مجھے رقم ارسال کرسکتی ہو۔

□ عمران بخش۔ ٹنڈو جام۔

○ بابا سائیں! مجھے آپ کو یہ خط لکھتے ہوئے بڑی شرم آرہی ہے پر کیا کروں آپ سے کہوں گا تو دل کا بوجھ کم ہوگا اور صحیح راستہ ملے گا کسی اور سے کہوں گا تو بڑی ذلت ہوگی۔ بابا سائیں میں نے دوسرے گاؤں کی لڑکی بھگا کر اس سے شادی کی اس کے رشتے دار اور میرے رشتے دار سب ہمارے دشمن ہوگئے۔ ہمارا جینا مشکل کردیا تو میں اس کو چھوڑ کر دبئی چلا آیا اور سارے رابطے ختم کرلیے۔ اپنے گھر والوں کو میں نے شہر بھجوا دیا کچھ عرصہ تو مجھے پتہ

Digitized by Google

چلتا رہا کہ میری بیوی کہاں ہے پر اب کوئی خبر نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں مجھے نہیں پتہ میں نے اپنی جان اور گھر والوں کی جان بچانے کے لیے اس کو چھوڑ دیا لیکن اب مجھے رات کو نیند نہیں آتی مجھے اُس کا چہرہ نظر آتا ہے خون میں لتھڑا ہوا مجھے بہت خوف آتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس عذاب سے نکال دیں میرا کھانا پینا سب ختم ہوگیا ہے۔ کام بھی نہیں ہوتا۔ مجھے تعویذ تجویز دیں تاکہ میں پھر سے نارمل زندگی گزار سکوں۔

☆ بیٹے عمران! گھر سے بھاگ کر شادی کرنا نہایت قبیح عمل ہے۔ ظاہر ہے اُس نے اپنے والدین کو دھوکا دیا تو بدلے میں اُس کو بھی دھوکہ ہی ملنا تھا میں بچوں کو سمجھاتا ہوں کہ کسی کو پسند کرنا غلط نہیں مگر غلط راستے پر چل کر کسی کو اپنانا زندگی کو اجیرن کر دیتا ہے اور یہ سب دین سے دوری کی وجہ سے ہے۔ اللہ سے مدد مانگنے کے بجائے بھاگ جانے والے ایسے ہی دربدر ہوتے ہیں میں اُس بچی کے لیے بھی دعا گو ہوں اللہ اس پر رحم کرے مگر تم اس کے شوہر ہو وہ تمہاری ذمہ داری ہے اس کی خبر گیری کرو اس کے والدین کو سمجھانے کی کوشش کرو اور مقصد کے لیے میں تمہیں تعویذ ضرور دوں گا۔ اللہ بہتری کرے گا۔

□ ممتاز۔ لاہور۔

○ السلام علیکم! محترم بابا جی! خدا کے واسطے اپنی بیٹی سمجھ کر میرے دونوں مسئلوں کا حل بتا دیں۔ ایک میرے بھائی کا ہے جو ہمارے ساتھ جانوروں کا سلوک کرتا ہے۔ دوسرا میرے خاوند کا ہے جو ہے ہی نشئی جو ہر قسم کا نشہ نہیں چھوڑتا۔ میرے دو بچے ہوگئے ہیں جن کا کوئی سہارا ہی نہیں۔ میرا بھائی جو باہر سے آ ہی نہیں رہا ہے آپ کے وظیفے سے ٹھیک ہوگیا تھا۔ نہ پاکستان آتا ہے اور نہ شادی کا نام لیتا ہے۔ دعا کریں کہ وہ ہم ماں، بہن کا اچھا بھائی اور اچھا بیٹا بن جائے اور اللہ کے واسطے شادی کرلے۔ میرے خاوند کا نشہ کر کر کے ذہن ہی خراب ہوگیا ہے۔ وہ کوئی کام بھی نہیں کرتا اور نہ میری اور بچوں کی ذمے داری اُسے قبول ہے۔ اللہ کے واسطے اس کے حبیبؐ کے واسطے میری مدد کریں۔

☆ بیٹی ممتاز! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح پڑھو۔ ''فاذکرونی اذکرکم'' پھر دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ صبوحی شاہ۔ مردان۔

○ بابا جی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو پیارے حبیبؐ کے صدقے میں اس خدمت کا اجر دے اور ہماری پریشانیاں اللہ تعالیٰ عزوجل اپنے حبیبؐ کے صدقے، آپ کی دُعاؤں سے دور فرمائے۔ میں بڑی امید سے خط لکھ رہی ہوں۔ میرا مسئلہ میرے اپنے گھر کا ہے۔ بظاہر میرا خاندان خوش حال ہے مگر کچھ پریشانیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ میری دو بیٹیاں دونوں بیٹیاں شادی کے قابل ہیں مگر دیر پر دیر ہو رہی ہے اور کاروبار بھی اتنا نہیں چلتا نہ برکت ہے کیونکہ ہر وقت گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ میری دیورانی چین نہیں لینے دیتی ہے۔ ہر وقت لڑائی کرنے پر تلی رہتی ہے۔ میرے شوہر کے ساتھ بھی کئی مرتبہ بدتمیزی سے پیش آ چکی ہے۔ اگر میں صبر کروں تو بچے کہتے ہیں کہ آپ ڈرتی ہیں۔ میں جتنی صلح کی کوشش کروں اس کے بچوں سے پیار کروں ان کو کپڑے یا پیسے دوں واپس کر دیتی ہے۔ ہماری کوئی خوشی ہو یا ہماری کوئی تعریف کرے تو شریک بھی نہیں ہوتی۔ ہم تو ذہنی طور پر بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ میرے خاوند کا ٹرانسفر بھی رکا ہوا ہے۔ میری چھوٹی بیٹی کے گردے میں پتھری ہے۔ برائے مہربانی میرے مسئلے حل کر کے شکریہ کا موقع دیں۔ میرا خط ضرور شامل کریں۔

Digitized by Google

☆ بیٹی صبوحی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اس معاملے کو جتنی اہمیت دوگی' اتنی تکلیف ہوگی۔ نظر انداز کرو اور اپنے گھر کے معاملات کو درست رکھو۔ کسی کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو تو وہ تمہاری کمزوری ہوگی۔ میل ملاپ کم رکھو اور نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 21-21 بار سورۃ الناس پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ فیضان بٹ۔ لاہور۔

o بابا جی! السلامُ علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہیں کہ آپ کی عمر دراز کریں اور آپ کو ہر تکالیف سے بچائے۔ (آمین!)

بابا جی! میں نے آپ کو 3 ماہ پہلے خط لکھا تھا جس میں آپ نے میرے لیے اور میری بہن کے لیے تعویذ بنانے کو کہا تھا اور آپ نے تفصیل مانگی تھی۔ اس سے پہلے میں نے آپ کو کئی خط لکھے اور تفصیل بھی۔ بابا جی! میری بہن کی شادی ہوئے 9 سال ہوگئے مگر ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی جس کی وجہ سے اسے اپنے سسرال میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ بابا جی! نہ میری ماں ہے نہ باپ۔ میری بہن کی شادی پھوپھی کے لڑکے سے ہوئی ہے۔ میرے بڑے بھائی نے انہیں سمجھایا بھی مگر وہ ان سے لڑائی کر بیٹھے جس کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ بابا جی! اس کا کئی جگہ علاج کروایا مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ مولوی' حکیموں اور ڈاکٹروں کو بھی دکھایا۔ مولوی یہ کہتے ہیں' اس پر اوپر کا سایہ ہے لیکن ڈاکٹروں نے اسے کوئی بیماری نہیں بتائی۔ بابا جی! آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس کے لیے اچھا سا تعویذ بنا دیں۔ بابا جی! میری بہن نہ کچھ کھاتی ہے۔ اکثر سوچتی رہتی ہے جس کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ اگر آپ اس کی یہ تکلیف دور کر دیں' آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ بابا جی! میرا مسئلہ بھی ہے کہ مجھے لاہور آئے ہوئے 7 سال ہوگئے ہیں مگر کچھ نہ بنا سکا۔ کوئی کام کرتا ہوں تو نقصان ہو جاتا ہے۔ بابا جی! آپ نے میرے لیے بھی تعویذ بنانے کو بھی کہا تھا۔ بابا جی! ایک سال پہلے میں بہت بیمار ہوگیا تھا۔ کبھی مجھے خوابوں میں عجیب و غریب چیزیں نظر آتی تھیں۔ میں نے آپ کو خط لکھا۔ میں نے اس میں تفصیل بھی لکھی تھی اور آپ نے وظیفہ دیا تھا۔

☆ بیٹے فیضان! اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ سب سے پہلے نماز کی پابندی کرو۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ جن ترجمے کے ساتھ پڑھو اور دُعا کرو۔ تم نے تعویذ ابھی تک نہیں منگوائے وہ فروری میں مزید دیر مت کرنا۔ بہن سے کہو' سورۃ النساء' آیت 89' نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 تسبیح پڑھے اور دُعا کرے۔ مدت 41 دن ہے۔

□ رمشا۔ اسلام آباد۔

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری منگنی میری پھوپی کے بیٹے سے ہوئی ہے اور بھائی کی ماموں کی بیٹی سے۔ ہم دونوں اس منگنی سے خوش نہیں ہیں کیوں کہ یہ منگنی میری چھوٹی پھوپی نے ضد میں آکر کروائی ہے۔ میں ایک دوسرے لڑکے کو پسند کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میری منگنی ٹوٹتے ہی میرا رشتہ ان لوگوں کے گھر سے آئے اور رشتہ میرے گھر والے قبول کرلیں۔ آپ وظیفہ کم مدت کا دیجیے گا۔

☆ بیٹی! رشتے صرف اس بنیاد پر نہیں توڑے جاتے کہ پسند نہیں ہیں۔ لڑکے کی بھی اتنی ہی عزت ہوتی ہے جتنی لڑکی کی۔ بلاوجہ کسی کو بے عزت کرنا مناسب نہیں۔ تم اپنے والدین سے بات کرو نماز کی پابندی رکھو انشاء اللہ بہتر فیصلہ ہوگا۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google

شعر و سخن

نظم

کتنے سادہ ہیں ہم کتنے ناداں بھی ہر سراب
ہر جھوٹ کو سچ سمجھتے ہیں ہر دھوکے میں آجاتے ہیں
جب آنکھ کھلی تو یہ راز بھی کھلا
یہاں محبت کھیل تماشا ہے
وفا کا کوئی مول نہیں
یہاں سب جذبے فقط وقتی ہیں
ہر ذات پہ ہے ایک خول چڑھا
تو پھر کیسا دل لگانا یہاں؟
کیوں ہر بات پر دل مرجھانا یہاں؟
گردب ہے ساتھ ہمارے
تو کس بات پہ ہے دل اُداس ہمارا؟
سچ فقط بس ایک رب کی ذات ہے
جو ہے اس سے جڑا وہی بس سچ ہے
باقی سب سب سراب ہے
یہ شکر کرو کہ راز کھلا
یہ حمد کرو کہ ساتھ ملا
عیاں اگر دنیا کا راز ہوا ہے یہ محبت کا حق ادا ہوا ہے
منکشف تجھ پہ رب کی ذات ہوئی ہے
جو رب سے تجھ کو ملا گئی ہے

شاعرہ: نابیہ رحمٰن۔ ڈیرہ غازی خان

غزل

میرے دل کی سرزمین کو سورج سے جدا کیجے
گر یہی راحت ہے آپ کے لیے تو جایئے مزا کیجے
خوفِ تنہائی تھا' ورنہ محبت تو کچھ بھی نہیں
جایئے میرے مہرباں اب حق جفا ادا کیجے
لذتِ الفت کی چاہ کہاں ہم کو
فقط میرا جو خواب ہے اُسے تو میرا کیجے
دل بنجر پر اک بوند گرا کر چل دیے
میرے بحر تھے جو وفاؤں کے وہ تو ادا کیجے
سلسلے میں سبھی آرزو تک ہی ہیں موقف
آرزو کے آگے جستجو کے بعد منزل عطا کیجے
حال روح اس قدر گھمبیر ہے نگین
کہے ہے مجھ خدارا اس جہاں سے قضا کیجے

شاعرہ: نگین افضل وڑائچ۔ شادیوال' گجرات

غزل

ہم سے تو کسی کو کبھی ستایا نہیں جاتا
اپنوں کو بلندی سے گرایا نہیں جاتا
چاہت کو کبھی اپنی رُلایا نہیں جاتا
الزام کبھی جھوٹا لگایا نہیں جاتا
ہم اپنی طبیعت سے ہیں مجبور یقیناً
چاہیں بھی تو احسان جتایا نہیں جاتا
اللہ کی مدد شاملِ احوال نہ ہو تو
بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا نہیں جاتا
یہ بات تو سچ تم نے کہی ہے مرے ہمدم
بس جائے جو دل میں وہ بھلایا نہیں جاتا
مشکل ہے بہت راہِ محبت بھی کٹھن ہے
اب مجھ سے ترا پیار نبھایا نہیں جاتا
چپ رہ کے شگفتہ نے اُسے ایسی سزا دی
ہر بار تو شور مچایا نہیں جاتا

شاعرہ: شگفتہ شفیق۔ کراچی

غزل

اس بے وفا سے کہنا ایک یار تھا تمہارا
تم زندگی تھی اس کی وہ پیار تھا تمہارا

Digitized by Google

تم خوابوں میں خیالوں میں رہتے تھے اس کے
تم جان تھے اس کی وہ دلدار تھا تمہارا
یاد کرو وہ پل وہ دن وہ راتیں
تم ابتدا تھے اس کی وہ آغاز تھا تمہارا
دو پل جدائی کے کٹتے نہ تھے جانتے تھے
تم سر تھے اس کی وہ ساز تھا تمہارا
دیکھ اے عادی اس کی محبت کا نگارہ
تم ہوگئے کسی او کے وہ آج بھی ہے تمہارا
شاعر: محمد نوید شہزاد۔ روڈہ کھل

غزل

ایک بار میری سمت محبت کی نظر کردے
پھر چاہے مجھے تو ملک بدر کردے
بن تیرے دکھائی نہ دے کچھ بھی مجھ کو
ایسا تو میری آنکھوں پہ گہرا اثر کردے
بہتر نہیں کوئی بھی عبادت اس سے
دل کی دنیا میں اک نئی سحر کردے
تجھے دیکھ کے میں چین سے سو نہ سکوں
کبھی ہاتھ رکھ کے رات میرے سینے پہ بسر کردے
آسیب کے سائے کا گمان ہے میرے گھر میں
شہر کے لوگوں کو میرے انتہائے عشق کی خبر کردے
شاعر: عثمان غنی۔ پشاور

غزل

لکھتا تھا کبھی وہ ہاتھ پہ مہندی سے میرا نام
حد تو یہ ہے کہ اب وہ نام بھی سننا گوارا نہیں کرتا
دیکھتی رہتی ہیں مجھے وہ پتھر آنکھیں
بھولے سے بھی کبھی اک اشارہ نہیں کرتا
مچل جاتا تھا کبھی وہ میری ایک آہ پر
وقتِ آخر ہے مگر وہ نظارہ نہیں کرتا
دل کے جلنے کی خوشبو تو ہر سو پھیل گئی
چہرہ ڈھانپ کے رکھتا ہے محمل اشارا نہیں کرتا
کہنے لگا وہ میری قبر پر ایک دن آ کے
جھوٹی محبت میں یوں کوئی ہارا نہیں کرتا
شاعر: ڈاکٹر حمد امین۔ قلعہ پور

غزل

نظر میں اس کی ہے ہر کوئی حقیر
دیکھ نہیں سکتا وہ اپنی آنکھ کا شہتیر
توڑ دیا اُس نے رشتہ وفا مجھ سے
سمجھتا ہے وہ نادان مجھ کو اک فقیر
اک سانس تھی لٹا دی وہ بھی چاہ میں
بدل پھر بھی نہ پائی ہماری تقدیر
خاموش بیٹھا ہوں غم دل چھپائے ہوئے
کہ ہو نہ جائے خواہ مخواہ ہماری تشہیر
کوئی بھی نہ رہا ہم سفر زندگی میں ولسن
اب خدایا تُو ہی بتا کوئی تدبیر
شاعر: راکی ولسن ساگر۔ سیالکوٹ

غزل

جب ہوگئی تم سے میری دنیا تہہ و بالا
اب ایک جہاں زیر و زبر ہو تو مجھے کیا
جب خاک بھی باقی نہ رہی میرے قلب و جگر کی
تم میرے لیے اب خاک بسر ہو تو مجھے کیا
میرا دل ہے ویراں کبھی اُجالا بھی نہ ہوگا
تم میرے لیے اب شمس و قمر ہو تو مجھے کیا
زندگی کی ہر رات ہے میری شب فرقت
اب اس شب کی سحر ہو تو مجھے کیا
دعا ہے کہ بن میرے گزر جائے کسی
آصف یوں بھی کسی کی نہ گزر ہو تو مجھے کیا
شاعر: ڈاکٹر عبدالوحید آصف۔ قلعہ پور

☆☆.....☆☆

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

Digitized by Google

پاکستانی شوبز

شوبز سے جڑی تہلکہ خیز خبریں.....

اور نئی ریلیز.....

ادارہ

اور اب پایئے جھریوں سے نجات

آپ لوگوں کو مارننگ شو ہوسٹ شائستہ واحدی یاد ہیں جنہوں نے ان مارننگ شوز میں شادیوں اور طلاقوں کو Introduce کروایا۔ آج کل وہ ٹی وی سے بہت دور ہیں اور اپنی ساری توجہ اپنی کلینک کو دے رہی ہیں پروفیشن کے لحاظ سے تو وہ ڈاکٹر ہیں۔ اور اب جھریوں کو چہروں سے دور کرنے کا کام بھی کر رہی ہیں۔ ٹی وی انڈسٹری سے وابستہ اکثر لوگ ان کے کلینک پر پائے جاتے ہیں جہاں رنگ گورا' ہونٹ موٹے اور ہر قسم کی جھریوں سے نجات دلا دی

Digitized by Google

جاتی ہے۔ ویسے شائستہ اب آپ صحیح طرف آئی ہیں اس کام میں پیسہ بھی بہت ہے اور عزت بھی.....

ایک اور Controversy

پاپ گائیکی کے دو بڑے نام علی عظمت اور Strings کے درمیان کچھ گڑبڑ ہے جس کا اندازہ ان کے فینز کو ہو رہا ہے۔ دونوں کا کانسرٹ 8 دسمبر کو

تھا ابھی یہ فیصلہ کرنا باقی ہے کہ یہ میدان کس نے مارا کیونکہ ٹکٹ تو دونوں کے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے تھے۔ میڈیا نے کچھ بہت اچھی کوریج نہیں دی جس سے فاتح کا اندازہ کرنا کچھ مشکل ہو رہا ہے۔ ویسے ہمیں تو یہ دونوں پاپ اسٹارز بہت عزیز ہیں' لڑائی پروفیشنلوم کا حصہ ہے تو ٹھیک ہے ذرا Controversy رہے تو شہرت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن اگر یہ لڑائی حقیقت پر مبنی ہے تو پھر دعا ہے کہ جلد سب ٹھیک ہو جائے۔

سب سے آسان جواب۔ سب سے مشکل سوال

آج کل ٹی وی پر چلنے والے ایک اشتہار نے سب کو جیسے مبہوت سا کر دیا ہے۔ پاکستانی پرفیوم کا یہ اشتہار جس میں ہم سب کی پسندیدہ اقرا عزیز ماڈل ہیں اور پرفیوم مشہور ڈیزائنر ماریہ B کا ہے۔ اس اشتہار میں سب کچھ اس قدر مکمل ہے کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔ بات اگر شاعری کی ہو تو لاجواب

اگر بات ماڈل کی ہو تو دل فریب اور اگر مناظر کی ہو تو حیرت انگیز' اقرا عزیز جہاں جاتی ہیں وہاں چھا جاتی ہیں۔

Shape Of You

اگر آپ Leo Twins کو نہیں جانتے تو پھر آپ کچھ نہیں جانتے..... Nescafe بیسمنٹ

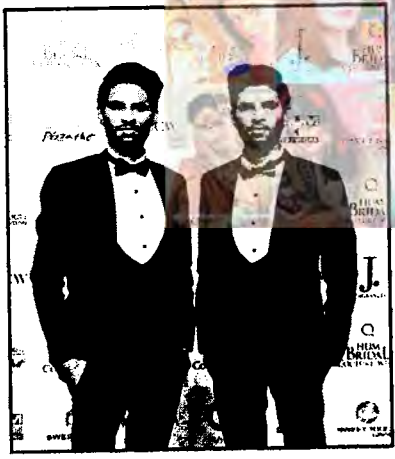

URDU TUBE
Digitized by Google

میں شرکت کرنے والے شارون اور ہارون کم عمر موسیقار ہیں۔ جنہوں نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے دونوں بھائی واکمن اور گٹار ایسا بجاتے ہیں کہ سننے والے سر دھنتے رہ جاتے ہیں۔ طبلے اور ہارمونیم پر مشہور انگریزی گانا Shape Of You بجا کر دنیا کو حیران کر دیا۔ اگر آپ نے نہیں سنا تو ضرور سنیں اور پھر اس کے بعد کوکو کورینا پر تو آپ خود ناچ اٹھیں گے۔ سچ ہے پاکستان میں بڑا ٹیلنٹ ہے بس پلیٹ فارم درکار ہونا چاہیے۔

نئی فلمیں

پاکستانی سینما کا Revivel اچھی خبر ہے 2018ء میں بھی بہت اچھی فلمیں دیکھنے کو ملیں اور

اب 2019ء میں بھی کئی فلمیں پائپ لائن میں ہیں۔ جس میں شمون عباسی کی Durj قابل ذکر ہے۔ اس میں سچے واقعات جو انسانی عقل سے ماورا ہیں انہیں شوٹ کیا جا رہا ہے۔ مین رول شمون عباسی اور شیری شاہ ادا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پراجیکٹ غازی بھی تیاری کے مراحل میں ہے نادر شاہ کی ڈائریکشن میں بننے والی فلم میں مرکزی کردار نبھا رہے ہیں ہمایوں سعید' شہریار منور اور سائرہ شہروز' پچھلے سال آنے والی یہ فلم اب 2019ء میں ریلیز کے لیے تیار ہے۔ نعمان خان پروڈیوسر کی فلم شیر دل بھی تکمیل کے مراحل میں ہے مرکزی کرداروں میں میکال ذوالفقار اور آرمینہ خان نظر آئیں گے۔ اس فلم کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں خاتون کا کردار بہت مضبوط دکھایا ہے' کراچی سے لاہور 3 بھی 2019ء میں ریلیز ہونے جا رہی ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ پہلے اور دوسرے پارٹ کو بے انتہا پسند کیا گیا تھا اس سیکوئل کا 3 پارٹ جلد سینما گھروں کی زینت بنے گا۔ اور آخر میں بات ہو جائے مولا جٹ 2 کی بلال لاشاری جیسے ذہین پروڈیوسر نے اس فلم پر بہت محنت کی ہے اور پوسٹر بھی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ فلم دیکھنے والوں کو ایک نئی دنیا کی سیر کرائے گی۔ کاسٹ میں شامل ہیں موسٹ فیورٹ فواد خان' ماہرہ خان' حمزہ علی عباسی اور حمیمہ ملک' مولا جٹ 2 عید پر ریلیز کے لیے تیاری کے آخری مراحل میں داخل ہو گئی ہے۔

☆☆.....☆☆

Digitized by Google